اُردو میں مستعمل کہاوتیں اور ضرب الامثال کا بے بہا خزانہ
اُردو کہاوتیں
دلچسپ حکایات اور کہانیوں
کے ذریعے بیان کیا گیا تاریخی پس منظر

اُردو میں مستعمل کہاوتیں اور ضرب الامثال کا بے بہا خزانہ

دلچسپ حکایات اور کہانیوں کے ذریعے بیان کیا گیا تاریخی پس منظر

ڈاکٹر شریف احمد قریشی

نظرِثانی

پروفیسر سیّد امیر کھوکھر

بُک کارنر

جہلم، پاکستان

Urdu Kahawatain
by Dr. Shareef Ahmad Qureshi
Jhelum: Book Corner. 2016
384p.
1. Urdu Linguistics - Proverbs
ISBN: 978-969-662-021-1

اشاعت : فروری 2016ء
نام کتاب : اُردو کہاوتیں
تالیف : ڈاکٹر شریف احمد قریشی
نظر ثانی : پروفیسر سیّد امیر کھوکھر
اہتمام : شاہد حمید، ولی اللہ
حروف خوانی : اعجاز روشن
سرورق : ابو اِمامہ
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

Publisher:
Gagan Shahid & Amar Shahid
Book Corner
Printers, Publishers & Booksellers
Jhelum. Pakistan.
Phone # 0544-614977 / 0544-621953
Cell # 0323-5777931 / 0321-5440882
Email: bookcornershowroom@gmail.com

ناشر:
گگن شاہد، امر شاہد
بک کارنر
پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز،
جہلم، پاکستان

www.bookcorner.com.pk

www.facebook.com/bookcornershowroom

فہرست

اُردو کہاوتیں

اُردو کہاوتیں - ایک جائزہ

محاورے اور کہاوتیں اُردو کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث ہیں!

کہاوتیں، ضرب الامثال، محاورات، تلمیحات اور روزمرہ کسی بھی زبان کے لیے قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دورانِ گفتگو ایسے بہت سارے مقامات آتے ہیں جہاں طویل گفتگو یا بحث کے بجائے صرف ایک کہاوت یا ایک محاورہ ہی مطالب و معانی کی توضیح و تشریح اور ابلاغ و افہام کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اُردو زبان اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ اس کا دامن بے شمار محاورات، کہاوتوں، ضرب الامثال اور تلمیحات سے مالا مال ہے اور دورانِ گفتگو یا اثنائے تحریر ان کا برموقع و برمحل استعمال اُردو دان طبقے میں عام ہے۔

اُردو زبان میں ضرب المثل، اکھان اور کہاوت ایک دوسرے کی ہم معنٰی اور مترادف اصطلاحات کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ کہاوت لفظوں کا وہ مجموعہ ہے جو اسلاف کے تجربات، ان کے فکری یا معنوی احساسات، ان کی زندگی میں گزرنے والے واقعات یا ان کی زندگی میں رونما ہونے والے سانحات کو مختصر الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ دو یا دو سے زائد الفاظ میں ان واقعات و مشاہدات اور سانحات کو یوں بیان کر دیا جاتا ہے کہ اس سے پورا واقعہ یا سانحہ یا قصّہ کے خلاصہ اور لُبِّ لباب کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کوئی بھی واقعہ، قصّہ یا سانحہ دن رات میں ضرب المثل یا کہاوت کی حیثیت اختیار نہیں کرتا بلکہ اس پر ایک مدت مدید گزرنے پر وہ واقعہ اور اس کے متعلق کچھ الفاظ عوامی مقبولیت کا اعزاز حاصل کرتے ہیں۔ عبداللہ جان عابد اسی معنویت کے پیش نظر لکھتے ہیں:

''ضرب الامثال (کہاوتیں) لفظوں کا وہ مجموعہ ہے جو اسلاف کی زندگی کے دانش

مندانہ تجربے، مشاہدے اور رویے سے مستفید ہوتا ہے اور اس میں زندگی کی حقیقی رعنائی کا ایک ایسا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے جو نفسیاتی، سماجی، فکری، تہذیبی تاریخی اور لسانی تجربات اور اس پر رونما ہونے والے مظاہر اور رویوں سے متشکل ہوتا ہے۔"

کہاتوں کو عوام و خواص دونوں حسب ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں کی گفتگو میں ان کا محلِ استعمال اور کہاوتوں کا انتخاب ایک جیسا نہیں ہوتا۔ تقریر و تحریر اور مجلسی گفتگو میں ان کا برمحل استعمال مطلب برآری میں آسانی پیدا کر کے سامعین کو خوش گوار طور پر متاثر کرتا ہے۔ شان الحق حقی رقم طراز ہیں:

"ضرب الامثال عوامی سطح پر پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں عوامی فطانت سمائی ہوتی ہے اور عوامی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ پھر خواص بھی ان ہی مثلوں اور کہاوتوں کو برتتے ہیں اور اپنا لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اکثر ان کے ماحول یا معاشرے سے تعلق نہیں رکھتیں۔ نہ صرف امثال بلکہ الفاظ، تلفظ، محاورے وغیرہ کے معاملے میں بھی عوام کے آگے خواص کی زیادہ نہیں چلنے پاتی۔"

(شان الحق حقی، دیباچہ جامع الامثال، مرتبہ: وارث، صفحہ: و)

کہاوتیں ہمیشہ عوامی قصوں، کہانیوں اور سماجی واقعات سے جنم لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہاوتوں اور لوک کہانیوں میں یک گونہ تعلق اور ربط پایا جاتا ہے۔ کوئی بھی واقعہ، قصہ یا کہانی جب بار بار دُہرایا یا سُنا اور سُنایا جاتا ہے تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر جب وہ اگلی نسلوں تک پہنچتا ہے تو اس کے چند جملے زبان زدِ عوام ہو جاتے ہیں۔ صدیوں کے بیتنے پر یہی چند جملے جو پورے قصے یا کہانی کا لب لباب اور خلاصہ بیان کرتے ہیں، یہی الفاظ کہاوتیں کہلاتے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کہاوتوں کی سماجی توجیہہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"کہاوتیں دراصل سماجی سچائیاں ہوتی ہیں۔ جن کی بنیاد اکثر و بیش تر کسی حادثے یا واقعے یا حوالے پر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایسی تلمیحیں ہیں جنہیں انسانی تجربے یا عقل کا نچوڑ بھی کہا جا سکتا ہے۔ پہلے یہ واقعاتی طور پر ہر ایک انسان کی زبان میں ظاہر

ہوئی ہوں گی پھر اس سے ملتا جلتا واقعہ کئی افراد کے سامنے آیا اور نتیجے کے طور پر کوئی مثل یا کہاوت بن سنور اور ترش تر شا کر زبان میں داخل ہو گئی۔ کہاوتوں کے پیچھے جو حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے کئی بار وہ کہانی کی شکل میں بھی مشہور ہو جاتا ہے، جس سے وہ کہاوت دُور دُور تک پہنچ جاتی ہے۔ کئی بار یوں بھی ہوتا ہے کہ اصل واقعہ تو لوگ بھول جاتے ہیں لیکن اس سے کوئی ملتا جلتا یا فرضی واقعہ گھڑ کر اس کہاوت سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔''

(گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو زبان اور لسانیات، ص: ۶۵)

کہاوت اور محاورے میں جو چیز قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کے پیچھے اسلاف کا کوئی دانش مندانہ رویہ، زندگی کا کوئی تجربہ، مشاہدہ اور تجرباتی پہلو کارفرما ہوتا ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے رہبری اور رہنمائی فراہم کرتا ہے، یوں سمجھنا چاہیے کہ کہاوت لفظوں کی ایسی ترکیب کا نام ہے۔ جس میں ایک پورا جملہ موجود ہوتا ہے جبکہ محاورہ پورا جملہ نہیں ہوتا بلکہ فقط چند الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جو عام طور پر علامتِ مصدر پر ختم ہوتا ہے اور اس مصدر کی پوری گردان ممکن ہوتی ہے۔ مثلاً غم کھانا............وہ کھاتا ہے، وہ کھائے گا، اس نے کھایا وغیرہ جب کہ ضرب المثل یا کہاوت کی گردان ممکن نہیں ہوتی۔ دوسرا واضح فرق یہ ہے کہ کہاوت اپنے اندر پوری معنویت رکھتی ہے، وہ مرکب تام، مرکب مفید یا ایک ایسا جملہ ہوتا ہے۔ جس میں اس کی تمام معنویت متشکل ہوتی ہے۔ جب کہ محاورہ جملہ نہیں ہوتا، یہ اپنی ذات میں اپنے معنٰی کی کشید میں تو مدد کرتا ہے لیکن کسی بھی رویّے اور حوالے سے پوری کیفیت کو سامنے نہیں لاتا۔

ڈاکٹر سیفی پریمی نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''اصل میں ضرب المثل ایک جملہ تامہ ہوتا ہے اور اپنا ذاتی مفہوم ادا کرنے کے لیے کسی دوسرے جملے یا عبارت کا محتاج نہیں ہوتا۔''

(سیفی پریمی، ڈاکٹر، ہمارے محاورے، ص: ۸)

کہاوت اور ضرب المثل کو ہر زمانے میں مترادف اور ہم معنی ہی کہا اور سمجھا جاتا رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے مصنف ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے ان دونوں میں ایک لطیف اور خفیف سا امتیاز روا رکھنے پر زور دیا ہے، اور اس فرق کو اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ

''ضرب المثل اور کہاوت میں عموم وخصوص کا تعلق ہے اور ان میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت پائی جاتی ہے یعنی ہر کہاوت ضرب المثل ہے لیکن ہر ضرب المثل کہاوت نہیں۔''

چوں کہ ڈاکٹر شریف احمد ہی اس فرق کو روا رکھنے کی سفارش کر رہے ہیں۔ اس لیے انہی کی بحث کا ماحصل سامنے رکھ کر اس کا تجزیہ زیادہ مناسب رہے گا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''عام طور پر کہاوت، لوکوکتی اور ضرب المثل یا مثل کو ایک دوسرے کا مترادف یا ہم معنٰی خیال کیا جاتا ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ لفظ ضرب المثل یا مثل اور لوکوکتی کا تعلق بالخصوص تعلیم یافتہ یا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے ہے۔ جب کہ لفظ کہاوت کا تعلق عوام یا پورے سماج سے ہے۔ کسی جاہل ان پڑھ، کم تعلیم یافتہ اور دیہاتی شخص کے منہ سے عام طور پر لفظ ضرب المثل یا لوکوکتی سننے کو نہیں ملے گا۔ بہت سے اَن پڑھ اور دیہاتی لفظ ضرب المثل یا لوکوکتی کو سمجھتے بھی نہیں ہاں کچھ لوگ لفظ مثل سے ضرور واقف ہیں۔ لیکن لفظ کہاوت کم تعلیم یافتہ، تعلیم یافتہ، اَن پڑھ، جاہل گنوار، شہری، دیہاتی وغیرہ ہر طبقہ کے لوگوں میں رائج ہے۔ تمام لوگ اس لفظ کو بولتے، سمجھتے اور استعمال کرتے ہیں۔ یہ فرق تو ان الفاظ کے استعمال اور تشکیل پر مبنی ہے۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی تقریر و تحریر یا کسی معلوم شخصیت کے منہ سے نکلے ہوئے اہم جملے، فقرے، اقوال و ملفوظات وغیرہ کثرتِ استعمال کے سبب عوام کی میراث بن جاتے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے استعمال کیے جانے لگتے ہیں تو ضرب المثل یا کہاوت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔''

''لیکن کہاوتوں کا تعلق عوام سے ہے۔''

''لہٰذا کہاوت ایسے اقوال اور جملوں کو کہنا چاہیے جن کا منبع یا سرچشمہ کوئی کتاب، صحیفہ، رسالہ یا معلوم شخصیت نہ ہو۔''

''لفظ کہاوت کا استعمال تمام لوکوکتیوں اور ضرب الامثال کے لیے نہ ہو کر صرف ان کے لیے ہونا چاہیے جس کے پس منظر میں کوئی کتھا، حکایت، قصہ، تلمیح یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔''

''جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ عام طور پر کہاوت، ضرب المثل اور لوکوکتی کو ایک دوسرے کا مترادف یا ہم معنی خیال کیا جانے لگا ہے۔ اس لیے آج ان کے استعمال میں فرق کرنا اور ان کی حدود مقرر کرنا درست نہیں۔''

''یہ بھی ممکن نہیں کہ آج کے دور میں ہم صرف اسی کو کہاوت کہیں جن کے قصوں یا حکایتوں کے خالق عوام یا نامعلوم اشخاص ہوں۔ ایسا کرنے سے بہت سی کہاوتوں کو کہاوتوں کے باب سے خارج کرنا پڑے گا جیسے..................

''ہنوز دِلّی دوراست'' یا ''ابھی دِلّی دُور ہے۔'' ......(حضرت نظام الدین اولیاؒ)

''آخ تھو کھٹے ہیں'' یا ''انگور کھٹے ہیں۔'' ......(حکایاتِ لقمانؒ)

''آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا'' ....(امیر خسروؒ)''

''پھر بھی ضرب المثل اور کہاوت کو بہ آسانی دو خانوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ کہاوت انہیں کہنا چاہیے۔ جن کا تعلق کسی کتھا، قصے، حکایت، واقعہ یا تلمیح سے ہو یعنی حکایتی ضرب المثل ہی کہاوت ہیں جب کہ لوکوکتی یا ضرب المثل کے دائرے میں تمام ضرب الامثال اور کہاوتوں کو رکھا جا سکتا ہے۔ خواہ ان کا تعلق کسی کتھا، قصّے، حکایت یا تلمیح وغیرہ سے ہو یا نہ ہو۔ بہ الفاظ دیگر تمام کہاوتیں ضرب المثل ہیں۔ لیکن تمام ضرب الامثال کہاوتیں نہیں ہو سکتیں۔''

''اس لیے پیش نظر کتاب کو کہاوت کی کتاب کہنا چاہیے نہ کہ کتابِ ضرب الامثال۔''

ان تمام اقتباسات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر شریف احمد کہاوتوں اور ضرب الامثال میں فرق روا رکھنا چاہتے ہیں اور اسی فرق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے زیرِ نظر کتاب کو کہاوتوں کی کتاب کہا گیا ہے۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ لفظی نزاع ہے، معنوی طور پر ضرب الامثال اور کہاوتوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر موصوف اس قدر وضاحت کرنے کے باوجود اس امر پر مجبور ہو گئے کہ جن کہاوتوں کو وہ اپنے تئیں ''ضرب الامثال'' قرار دیتے ہیں۔ جیسے ہنوز دلّی دوراست وغیرہ، انہیں بھی بالآخر اپنی کہاوتوں کی کتاب میں درج کرنا پڑا۔

ڈاکٹر موصوف کا یہ فلسفہ ناقابلِ فہم کہ

''پھر بھی ضرب المثل اور کہاوت کو بہ آسانی دو خانوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔''

جب انہوں نے خود ہی اپنی کتاب میں انہیں دو خانوں میں منقسم نہیں کیا تو اور کس سے توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس لسانیاتی اور اصطلاحی اختلاف سے صرفِ نظر کیا جائے اور کرنا بھی چاہیے تو کہاوتوں کے حکایتی، سماجی اور تلمیحاتی پس منظر کو جس خوبی سے اس کتاب میں بیان کیا گیا، وہ بلاشبہ بہت بڑا علمی، ادبی اور فنی کارنامہ ہے۔

کہاوتوں کی اہمیت و حیثیت کے پیشِ نظر ان کی تشریح و توضیح از حد ضروری تھی تاکہ اردو داں طبقہ ان کے معانی و مفہوم سے کماحقہٗ واقف ہو کر اپنی تحریر و تقریر اور عمومی بول چال میں بہ آسانی استعمال کر سکے۔

کتاب کی ترتیب میں اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ ہر موضوع پر چیدہ چیدہ کہاوتیں یکجا کر کے ان کا تلمیحاتی پس منظر بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ آنے والی سطور میں مختلف ماخذ رکھنے والی کہاوتوں کو مختلف اقسام کے تحت بیان کیا جارہا ہے۔ جنہیں اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

جب ہم کہاوتوں کو اس کے سماجی، تاریخی اور تلمیحاتی پس منظر کے ساتھ دیکھتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کہاوتیں مختلف ماخذ رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں مختلف اقسام کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔

(۱) حیوانی کہاوتیں

آٹا، دال اور اُلّو بھی ہے، آیا کتا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا، اندھوں نے ہاتھی چھوا سب نے الگ الگ کہا، اونٹ ستا ہے، پٹا مہنگا ہے، اونٹ کی گردن میں قلادہ، اونٹ کی گردن میں بلی، اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا، طویلے کی بلا بندر کے سر، بلی کو پہلے دن ہی مار دینا چاہیے، بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟، بندر بانٹ آپسی جھگڑے کا نتیجہ، بوڑھا کتا بانچے سون، لگی ہے تو مارے گا کون؟، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، جیسے کو تیسا ملے، سن تو راجا بھیل، لوہا چوہا کھا گیا، لڑکا لے گئی چیل، ساٹھ گاؤں بکری چر گئی، سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی، کتے خصّی میں کون پڑے، میرا بیل منطق نہیں

(۲) نباتاتی کہاوتیں

انگور کھٹے ہیں، پورا پیڑ ہلایا، سب نے چھک کر کھایا، پیاز بھی کھائی، کے بھی کھائے اور روپے بھی دینے پڑے، حضور کا غلام ہوں بینگن کا نہیں، دال چاول بھی ہے، الن بھی ہے، دال میں کچھ کالا ہے، سُوت کی انٹی اور یوسف کی خریداری، سوت نہ کپاس، جُلا ہے سے لٹھم لٹھا، نیبو نچوڑ، مفت خور۔

(۳) کھانے پینے کے متعلق کہاوتیں/خورد ونوش کی کہاوتیں

اسپغول ٹھنڈا بھی گرم بھی، انگور کھٹے ہیں، ایک آنے کا دودھ لیا، اس میں بھی مکھی بابا زرخودی خورم، بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، پکائی کھیر ہو گیا دلیا، تل گو تل گڑ تیس روپے، خان خاناں، کھانے میں بطانہ، دعوتِ شیراز اسی کا نام ہے، دودھ کا دودھ، پانی کا پانی، شور با حلال بوٹی حرام، یہ منہ اور مسور کی دال۔

(۴) موسمی کہاوتیں

گنجا دھوپ سے بچنے گیا، سر پر بیل گرا۔

(۵) عددی کہاوتیں

آدھے قاضی قدوہ، آدھے باوا آدم، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی، اڑھائی دن کی بادشاہت، ایک دن کا مہمان، دو دن کا مہمان، تیسرے دن بلائے جان، تل گڑ تل گڑ تیس روپے، تیس مار خان بنے پھرتے ہیں، تین میں نہ تیرہ میں، باون میں نہ بہتر میں، نہ سیر بھر سُتلی میں، نہ کروا بھر دائی میں، مردنگ بجائے ڈیرے میں، یک نہ شد دو شد، ننیانوے کے پھیر میں پڑ گئے، ننیانوے گھڑے دودھ میں ایک گھڑا پانی، نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی، نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی، ہزار بار جو یوسف بکے سو غلام نہیں۔

(٦) حرفت و پیشے کی کہاوتیں

بندر کا کام بڑھئی گیری نہیں، پلے پارس بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل، جلاہا جانے جو کاٹ،

چل مرے چرخے چرخ چوں، کہاں کی بڑھیا کہاں کاتوں، سُوت نہ کپاس، گوری گھر لٹھم لٹھا، کرگھا چھوڑ جلاہا جائے، ناحق چوٹ بچارہ کھائے، کار بوزینہ نیست نجاری، کہاں گنگوا تیلی، کہاں راجا بھوج۔

(۷) مذہبی پس منظر والی کہاوتیں

آگ پر مُوت یا مسلمان ہو، اپنی ڈاڑھی سب سے پہلے بجھاتے ہیں، اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد الگ بنائی، اسلام قلی، پانڈے، جدھر مولا، ادھر آصف الدولہ، جون پور کے قاضی ہیں، روزے چھڑانے گئے تھے، نماز گلے پڑی، لکھے موسا پڑھے خود آ، مرتے کو ماریں شاہ مدار، مُلّا کی دوڑ مسجد تک، مُلّا کی ڈاڑھی ثواب ہی ثواب، مولوی مدن کی سی بات کہاں، نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی، نمازی کا ٹکا آخر ڈھیر ہو گیا، ہر فرعونے را موسیٰ، ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں۔

اس تفصیل سے مقصود یہ باور کرانا ہے کہ متعدد ایسی کہاوتیں ہیں جن کو ہم عمومی طور پر مختلف مواقع پر استعمال کرتے ہیں اور سنتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم ایسی کہاوتیں جن کے حکایتی اور تلمیحاتی و واقعاتی پس منظر سے ہمیں واقفیت ہو، یہ کتاب اس خاص ضرورت کو پورے کرنے کے لیے ہی شائع کی جا رہی ہے۔ ادارہ بُک کارنر علم و ادب کے شائقین کو ایسے کئی تحفے پیش کر چکا ہے، جس سے دل کو آسودگی، فکر کو توانائی اور نظر کو تازگی ملتی ہے۔ قبل ازیں ادارہ جامع اُردو لغات، جامع فارسی لغات، فارسی محاورے، اُردو محاورے، اُردو املا اور قواعد اُردو جیسی بلند پایہ کتب سے صاحبانِ ذوق کی تواضع کر چکا ہے۔ اُمید ہے ادارے کی اس کاوش کو بھی تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر سیّد امیر کھوکھر
ایم اے، ایم او ایل، ایم فل۔ اترا شہر
(ضلع خوشاب)

حرف آغاز

محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ الفاظ کچھ ہوتے ہیں، ان کے لغوی معانی کچھ ہوتے ہیں لیکن محل استعمال سے ان کے مفاہیم یکسر بدل جاتے ہیں۔ مثلاً عربی کا لفظ ہے: لَن ترانی جس کے لغوی معنی ہیں: ''تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔'' اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر اللہ سے درخواست کی:

''رَبِّ اَرِنِی اَنْظُرْ اِلَیْکَ''

''اے رب مجھ کو اپنا دیدار کرا دیجئے کہ آپ کو ایک نظر دیکھ لوں۔''

جواب میں باری تعالیٰ نے فرمایا:

''لَن ترانی''

اردو میں یہ لفظ بالکل ہی مختلف معنی و مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے ہم شیخی، تعلّی اور خودستائی کے معنی میں بولتے ہیں۔ اسی سے ''لن ترانی کرنا'' یا ''دون کی لینا'' جس کے معنی ہوتے ہیں:

''شیخی بگھارنا، دون کی لینا۔''

اس کی جمع لن ترانیاں ہے۔ اس طرح بے شمار مرکب الفاظ، محاورے اور امثال ہیں جو اپنے اصل معنی سے ہٹ کر مختلف مفاہیم میں رائج ہو گئے ہیں۔ ان کا وجود ہر زبان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کرتے ہیں اور اس کی وسعت کا وسیلہ بنتے ہیں۔ اسی لیے ہر زمانے، ہر خطے اور ہر زبان میں ان کی اہمیت اور افادیت کو محسوس اور ان کی معنویت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ زبان کے حسن کو دوبالا کر کے اس کی ادبی اور لسانی شان کو نئی بلندیوں سے آشنا کرتے ہیں۔

اردو زبان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس کا خمیر فارسی سے تیار ہوا۔ اس لیے فارسی جیسی دولت مند زبان کی تمام تر لسانی وادبی خصوصیات اور ایران جیسے قدیم ملک کی تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور فکری روایات اپنی جملہ جلوہ سامانیوں کے ساتھ اردو زبان اور اردو ادب میں داخل ہو گئیں۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ اس کے علاوہ ایران ایک طویل عرصے تک عربوں کے سیاسی، ثقافتی اور لسانی اثر میں رہا۔ اس لیے ایرانی معاشرے، اس کے فکری عمل کے ساتھ اس کے ادبیات پر بھی عربی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ اثرات بھی فارسی کے وسیلہ سے اردو میں منتقل ہوئے۔ اس کے علاوہ خود عربوں سے ہندوستان کے براہ راست روابط قائم ہوئے جن سے دونوں ملکوں کو بے حد فائدہ پہنچا۔ ہندوستان میں عرب تمدن کے نقوش آج بھی واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اردو زبان وادب نے بھی بڑے دلکش انداز میں ان اثرات کو قبول کیا۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اردو زبان کی پیدائش اور نشوونما ہندوستان میں ہوئی۔ اس لیے یہاں کے مقامی اثرات کو قبول کرنا اور ادبی، لسانی وتہذیبی روایات سے اپنے دامن کو مالا مال کرنا اس کا فطری تقاضا تھا جو اس نے بڑی خوبصورتی سے پورا کیا۔ اس طرح اردو زبان مختلف پھولوں کا گلدستہ اور خوشبوؤں کا لخلخہ بن گئی۔

اردو میں جہاں مختلف زبانوں کے الفاظ دخیل ہوئے، وہیں کہاوتیں، محاورے اور تلمیحات بھی کثرت سے داخل ہوئیں۔ ان سے اردو زبان کا دامن تو ضرور وسیع ہوا لیکن عام قاری کے لیے کچھ دقتیں بھی پیش آئیں۔ جو حضرات اردو کے علاوہ دوسری زبانوں سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے، ان کے لیے ان محاوروں، کہاوتوں وغیرہ کو سمجھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ جب تک کہ ان کا پس منظر معلوم نہ ہو، اس وقت تک ان کا صحیح مفہوم سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے زیر نظر کتاب ترتیب دے کر بڑی علمی، ادبی اور لسانی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ان کی برسوں کی ژرف نگاہی اور محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ امید ہے عوام وخواص اس سے حسب استطاعت مستفیض ہوں گے اور ان کے اندر اُردو ادب کی بہتر تفہیم پیدا ہوگی۔

محمد ضیاء الدین انصاری

پیش گفتار

کہاوتوں اور ضرب الامثال کا بیش بہا خزانہ دنیا کی ہر زندہ زبان میں پایا جاتا ہے۔ کسی بھی زبان کے لسانی سرمایے میں کہاوتیں اور ضرب الامثال اپنا ایک اہم اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کی افادیت و اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اردو زبان کا لسانی دامن ہر قسم کی کہاوتوں اور ضرب الامثال سے مالا مال ہے مگر افسوس کہ اردو میں کہاوتوں اور ضرب الامثال پر اب تک خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ چند کتب ہیں جن کو انگلیوں پر ہی گنا جا سکتا ہے۔ البتہ اُردو لغات میں متعدد کہاوتیں اور ضرب الامثال ضرور مل جاتی ہیں۔ اُردو لغات کے علاوہ اب تک میری نظر سے ایسی کوئی مبسوط کتاب نہیں گزری جس میں کہاوتوں اور ضرب الامثال کو جمع کر کے ان کے معانی، مطالب اور مفاہیم کے ساتھ استعمال کرنے کے موقع ومحل کی نشان دہی کی گئی ہو۔ یہی سوچ کر کئی سال قبل ''فرہنگ اقوال وامثال'' کے نام سے ایک ایسی ہی فرہنگ کی ترتیب کا کام شروع کیا جس میں اقوال وامثال کے معانی، مطالب اور مفاہیم کے علاوہ ضروری ہوتو استعمال کرنے کے مواقع کی وضاحت بھی ہو۔

ترتیب کے دوران ایسی امثال بھی دیکھنے کو ملیں جن کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی قصہ، کہانی، کتھا، تلمیح یا حکایت تھی۔ ایک روز اچانک خیال آیا کہ اگر ایسی ہی سوڈیڑھ سو کہاوتیں ہاتھ آجائیں جن کے وجود میں آنے کا سبب کوئی قصہ، کہانی، کتھا، حکایت، تلمیح یا واقعہ ہوتو یکجا کر کے کتاب کی شکل میں محفوظ کرلیا جائے۔ لہٰذا ایسی کہاوتوں اور ان کے پس منظر کو جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اب تک تقریباً پانچ سو کہاوتیں جمع ہوگئی ہیں۔ کہاوتیں اور متعلقہ قصص وحکایات کو دریافت کرنے کے لیے مختلف لغات، فرہنگیں اور کتب ورسائل وغیرہ کو کھنگالنا پڑا۔ بعض کتب ولغت میں چند کہاوتیں ہی ملیں، بعض میں کچھ کہاوتیں اور ان کے معانی ومطالب ہی نظر آئے اور بعض کتابوں کے ذریعہ کہاوتوں کے حکایتی پس منظر بھی ہاتھ آئے۔ غرض کسی کتاب سے کہاوت کا استخراج کیا تو کسی سے اس کے معانی ومطالب اور کسی سے اس کے حکایتی پس منظر کا۔ بعض کہاوتوں کے حکایتی پس منظر کے لیے بزرگوں اور قصے کہانیوں کے شوقین حضرات سے بھی

رابطہ قائم کرنا پڑا۔ گویا کسی ایک کہاوت کے معانی، مفاہیم اور حکایتی پس منظر کے لیے معتدد کتب و اشخاص سے مدد لے کر تکمیل کا مرحلہ طے کیا ہے۔ جن کہاوتوں کے حکایتی پس منظر مختلف کتابوں سے معمولی یا واضح فرق کے ساتھ نظر آئے ہیں، ان کے تانے بانے کو ملا کر مربوط کہانی یا گٹھے ہوئے پس منظر کا رُوپ دے کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہاوتوں اور ان کے مآخذ کو نظر انداز کرنا پڑا۔ البتہ کچھ کہاوتیں ایسی بھی ہیں جن کے معانی و مفاہیم اور حکایتی پس منظر کسی ایک ہی کتاب میں مل گئے ہیں۔

قصوں اور کہانیوں کے کہنے اور سننے کا دور ختم سا ہو گیا ہے۔ اب نہ قصے کہنے والے ہیں اور نہ سننے والے۔ قصے کہانیوں کے بعض شوقین حضرات پرانے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں اب بھی ہیں مگر ان کی تعداد کتنی ہے؟ نئی نسل کو قصے، کہانیوں اور حکایتوں کا شوق کہاں؟ موجودہ دَور میں سکولوں اور کالجوں کے نصاب میں اخلاقی تعلیمات اور سبق آموز حکایات کے لیے جگہ نہیں، جن کے بطن سے بیشتر کہاوتوں نے جنم لیا ہے۔ بہت سی غیر فرہنگی کہاوتیں بزرگوں کے ذریعہ سینہ بہ سینہ ہم کو میسر ہوئی ہیں۔ جیسے جیسے ہمارے بزرگ اور زبان دان حضرات دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں کہاوتوں اور ضرب الامثال کا چلن بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے غیر فرہنگی کہاوتوں کو اس کتاب میں شامل کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں شامل ایسی متعدد غیر فرہنگی کہاوتیں ہیں جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں مثلاً برے وقت ہی دشمن سے دوستی، تو کونہ مو کو چولھے میں جھونکو، بڑھیا کے مرنے کا غم نہیں، موت نے گھر دیکھ لیا، ان کو بھی خوش رکھنا چاہیے، دیکھے بھالے کا سودا نہیں، پہلے رہتا یوں تو لوٹا جاتا کیوں، تیرے بڑوں کی ایسی تیسی، فارسی ہے تو واہ واہ، یہ منہ اور منصور کی دار، یہ منہ اور مسور کی دال، پلے پارس بیچیں تیل یہ دیکھو قدرت کے کھیل، آدھی بوڑھی آدھی جوان، رنڈوؤں کے کرم میں نہیں لگائی تو کیسے ہو شادی بھائی، اندھے نے راہ پوچھی کنویں میں جا گرا، مولوی صاحب چھیڑو گے وغیرہ۔

مجھے اعتراف و احساس ہے کہ اب بھی بہت سی کہاوتیں اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ کام جاری ہے۔ جس وقت بھی یہ خاصی تعداد میں جمع ہو جائیں گی، اس وقت کتاب کے دوسرے حصہ میں شامل کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال انہی حاصل شدہ کہاوتوں کو ترتیب دے کر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف!

شریف احمد قریشی

اندازِ ترتیب

☆ تمام کہاوتوں کو بہ اعتبار حروف تہجی تحریر کیا ہے۔

☆ ہر کہاوت کو لکھنے کے بعد اس کے معانی، مطالب یا مفاہیم کے ساتھ ضروری ہوا تو استعمال کرنے کے مواقع کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اس کے بعد متعلقہ قصے، کہانی، کتھا، تلمیح یا حکایت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

☆ اگر کسی کہاوت کی لفظیات میں فرق ہے تو ایسی ہر کہاوت کے اندراج کو ضروری سمجھا ہے۔ مثلاً

۱۔ (الف) جتنی چادر دیکھیے اُتنے پاؤں پساریئے
(ب) جتنی چادر دیکھیے، اتنی پاؤں پھیلایئے
(ج) جتنی سوڑھ دیکھیے، اُتنے پاؤں پھیلایئے

۲۔ (الف) ڈھاک تلے کی بے باکی، شہر میں لینا دینا
(ب) ڈھاک تلے کی چوکتی، لیکھا جوں کا توں

۳۔ (الف) کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، ناحق چوٹ جلاہا کھائے
(ب) کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، ناحق مار جلاہا کھائے
(ج) کرگھا چھوڑ جلاہا جائے، ناحق چوٹ بچارہ کھائے

۴۔ (الف) بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی بھلا
(ب) بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی جیے گا...... وغیرہ

بعض کہاوتوں کے پہلے ہی لفظ میں اختلاف ہے مثلاً

۱۔ (الف) روزے معاف کرنے گئے تھے، نماز گلے پڑی

(ب) گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی

(ج) نماز بخشوانے گئے تھے، روزے گلے پڑے

۲۔ (الف) آپ سے آئے تو آنے دو

(ب) جو آپ سے آئے آنے دو

۳۔ (الف) لینا ایک نہ دینا دو۔

(ب) نہ لینا ایک نہ دینا دو

۴۔ (الف) آخ تھو! کھٹے ہیں

(ب) انگور کھٹے ہیں

۵۔ (الف) اس برتے پر تا پانی

(ب) کس برتے پر تا پانی......وغیرہ

ایسی تمام کہاوتوں کو بھی حروف تہجی کے اعتبار سے درج کیا ہے۔ جن کے پہلے ہی لفظ میں اختلاف ہے۔

ایسی کہاوتوں کو کسی لغت یا کتاب لغت میں تلاش کرنا دشوار گزار کام ہے۔ اگر کسی کتاب میں "لینا ایک نہ دینا دو" کے بجائے "نہ لینا ایک نہ دینا دو" کا اندراج ہو، اور اسے "ل" کی تقطیع ہی میں تلاش کیا جائے اور وہ اس میں نہ ملے تو یہ خیال کیا جائے گا کہ یہ کہاوت اس لغت یا کتاب میں نہیں ہے۔ اسی طرح اگر "نہ لینا ایک نہ دینا دو" کے بجائے "لینا ایک نہ دینا دو" کا کسی کتاب میں "ل" کی تقطیع میں اندراج کیا گیا ہے اور اسے "ن" کی تقطیع میں تلاش کیا جا رہا ہے تو بھی یہ سمجھ لیا جائے گا کہ مطلوبہ کہاوت کا اس کتاب میں اندراج نہیں ہے۔ اسی لیے ایسی تمام کہاوتوں کو اس کتاب میں درج کرنا ضروری سمجھا جس کے پہلے لفظ میں اختلاف ہے۔

بعض کہاوتیں ایسی ہیں جن کے قصوں، کہانیوں یا حکایتوں کے ایک سے زائد مرکزی فقروں، کلیدی جملوں یا اہم ٹکڑوں نے کہاوتوں کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ ان کو بھی بہ اعتبار حروف تہجی تحریر کیا ہے مگر متعلقہ حکایت یا کہانی کو صرف ایک ہی جگہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مثلاً

۱۔ (الف) اکیلے دُکیلے کا اللہ بیلی

(ب) جماعت سے کرامت

(ج) سنگت کی پھوٹ کا اللہ بیلی

(د) جمعہ جماعت کی خیر

۲۔ (الف) تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو

(ب) دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

۳۔ (الف) تِل گُو تِل گُو تیں روپے

(ب) چٹوری زبان دولت کا زیان

۴۔ (الف) ایک دن کا مہمان، دو دن کا مہمان، تیسرے دن بلائے جان

(ب) دعوتِ شیراز اسی کا نام ہے...... وغیرہ

بعض کہاوتیں ایسی بھی ہیں جو ایک سے زائد زبانوں میں رائج ہیں یا جن کے مترادف یا تراجم کی وہی حیثیت ہے جو اصل کہاوت کی ہے۔ ایسی اصل کہاوتوں اور ان کے تراجم کو بھی حروف تہجی کے اعتبار سے الگ الگ درج کرنا ضروری سمجھا ہے۔ مثلاً

۱۔ (الف) بلائے طویلہ بر سرِ میموں

(ب) طویلے کی بلا بندر کے سر

۲۔ (الف) گُربہ کُشتن روزِ اوّل

(ب) بلی کو پہلے ہی دن مارنا چاہیے

۳۔ (الف) کارِ بوزینہ نیست نجاری

(ب) بندر کا کام بڑھئی گیری نہیں

۴۔ (الف) ہنوز دلی دور است

(ب) ابھی دلی دور ہے...... وغیرہ

بعض کہاوتیں ایسی بھی ہیں جو تک بندی، قافیہ آرائی یا دیگر وجوہات کے سبب دو مختلف المعنی ٹکڑوں کو ایک لڑی میں پروئے نظر آتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ وقت، حالات اور اندرونی خصوصیت کے سبب

دونوں میں سے کوئی ایک ٹکڑا زیادہ مقبول ہو جاتا ہے اور دوسرا ٹکڑا نظر توجہ کے لیے ترس جاتا ہے۔ کبھی ان میں سے ہر ایک ٹکڑا اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور قافیہ یا تک بندی کی چستی اور اپنی اندرونی خصوصیت کے تحت ہر ٹکڑا آزادانہ کہاوت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی تمام کہاوتوں اور ان کے ٹکڑوں کو بہ اعتبار حروف تہجی الگ الگ درج کرنا ضروری سمجھا ہے۔ جیسے:

۱۔ (الف) جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم

(ب) جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم، جس نے کی بے حیائی، اس نے کھائی دودھ ملائی

۲۔ (الف) کالی بھلی نہ سیت

(ب) کالی بھلی نہ سیت، دونوں مارو ایک ہی کھیت

۳۔ (الف) آب آب کر مر گئے، سرہانے دھرا رہا پانی

(ب) کابل گئے مغل بن آئے، بولنے لگی بانی
آب آب کر مر گئے، سرہانے دھرا رہا پانی

۴۔ (الف) پکائی کھیر ہو گیا دَلیا

(ب) واہ پیر علیا، پکائی کھیر ہو گیا دَلیا

(ج) واہ پیر اولیا، پکائی کھیر ہو گیا دَلیا

۵۔ (الف) ہَگا نہ گھر رکھا

(ب) ہَگا نہ گھر رکھا، نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے...... وغیرہ

اس کتاب میں کچھ ایسی تلمیحات بھی شامل ہیں جنھیں اکثر کہاوت کی طرح استعمال کیا جاتا ہے جیسے گواہی ایک خرگوش کی، گونوجھا کی بلی، رَوَن گورَئی کی کُتیا، حبشی کی ٹوپی، گونوجھا کا لڑکا وغیرہ۔

کہاوت اور ضرب المثل کی اہمیت

تجربات و مشاہدات کا بے کنار سمندر جب چند مخصوص الفاظ کے کوزہ میں سما جاتا ہے تو کہاوت یا ضرب المثل کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ مختلف قسم کے نسلی تجربات و مشاہدات قصص و حکایات، عقاید و نظریات، حقائق و توہمات، نفسیاتی رد عمل و فلسفیانہ خیالات، قوانین و ضوابط، پند و نصائح، اقوال و ملفوظات، تاریخی و نیم تاریخی واقعات و دیگر حادثات، لوک کہانیاں اور شعری ٹکڑوں وغیرہ کے ایسے قبول عام کلیدی جملوں، فقروں یا کلمات وغیرہ کو جن میں اختصار اور معنوی زور بھی ہو کہاوت یا ضرب المثل کہتے ہیں۔ کہاوتوں اور ضرب المثل کا استعمال نہ صرف موقع و محل کے لحاظ سے کسی بات کی تصدیق و حمایت، تردید و مخالفت، درس و نصیحت یا کسی نکتے کے اثبات و انکار کے لیے کیا جاتا ہے بلکہ ہر کہاوت کسی نہ کسی تہذیبی، سماجی، لسانی، تاریخی یا واقعاتی پس منظر کی حامل ہوتی ہے۔ عربی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے:

''المثلُ فی الکلام کالمِلح فی الطعام''

یعنی روزمرہ کی گفتگو میں کہاوت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو۔ اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو وہ بے لطف معلوم ہوگا۔ گویا لطف کلام کے لیے کہاوتوں کا استعمال ناگزیر ہے۔ تحریر و تقریر اور زبان و ادب میں کہاوتیں اور ضرب المثل و موقع و محل کے لحاظ سے نمکینی اور شیرینی دونوں کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

زبان و ادب میں کہاوتوں اور ضرب الامثال کی اہمیت مسلم ہے۔ ان میں بذلہ سنجی کے جواہر، دانش مندی کے خزانے اور انسانی تجربات کے بیش بہا گوہر پنہاں ہیں۔ کہاوتیں اور ضرب الامثال کسی کارخانے میں نہیں ڈھلتیں، کوئی فردِ واحد یا ادارہ انہیں وضع نہیں کر سکتا۔ یہ سینہ بہ سینہ اور پھر کتابوں کے

ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچتی رہتی ہیں۔ یہ دراصل وہ سدابہار درخت ہیں جو نہ صرف بنجر دھرتی کی تہوں کو توڑ کر اُگنے کی قوت رکھتے ہیں بلکہ سنگلاخ زمینوں اور پہاڑوں کے سینے چیر کر باہر نکل آتے ہیں۔ یہ ایسے تراشیدہ موتی ہیں جو صدیوں تک تراش وخراش کے عمل سے گزر کر رواج اور چلن کے ذریعہ تراشیدہ ہیروں کی طرح چمکنے اور دمکنے لگتے ہیں۔ دنیا کی ہر زندہ زبان میں کہاوتوں اور ضرب الامثال کا نہ ختم ہونے والا خزینہ ہوتا ہے جو اس کے بولنے والوں کے لیے آڑے وقت میں ساتھ دیتا ہے، پریشانیوں سے بچاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ ہم کس طرح کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہوں، کب کیا کریں اور کیا نہ کریں، کب کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔

کہاوتوں اور ضرب الامثال کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح صنائع لفظی ومعنوی کلام کو ایجاز واختصار عطا کر کے اس کے حسن اور لطف کو دوبالا کرتے ہیں اسی طرح کہاوتیں اور ضرب الامثال بھی زبان وادب اور تقریر وتحریر کو ایجاز واختصار عطا کر کے دریا کو کوزے میں بھرنے کے مترادف ہیں۔ یہ ادب کو بے جا اور لمبی چوڑی تشریحات سے بچا کر کفایت وقت، ایجاز وتاثیر کا فیض پہنچاتی ہیں۔ ان کے ذریعہ کلام میں وزن اور زور پیدا ہوتا ہے۔ ان کا نمایاں وصف صاف گوئی ہے۔ یہ خوبیوں اور خامیوں کو خلوص، انصاف اور دیانت داری کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور تمام انسانوں کی نادانی اور دانشوری کو سچائی کے ساتھ قاری تک پہنچاتی ہیں۔ ان میں شخصیت پرستی نہیں ہوتی بلکہ ان کی نگاہ میں تمام انسانی طبقات برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔

کہاوتیں اور ضرب الامثال ہماری بہی خواہ بھی ہیں اور دوست بھی، استاد بھی ہیں اور طبیب بھی، رہنما بھی ہیں اور قائد بھی۔ جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے کوئی نہ کوئی کہاوت یا ضرب المثل اس کے حل کے لیے تیار ملتی ہے۔ شرط یہی ہے کہ موقع اور محل کے لحاظ سے ہمیں کہاوتیں اور ضرب الامثال یاد ہونی چاہئیں۔ کبھی کبھی ان کا بے جا اور بے محل استعمال مضحکہ خیز اور باعث رسوائی بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً نومبر ۱۹۹۹ء کا واقعہ ہے۔ گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج، رامپور کے این ایس ایس کے طلبا کا سالانہ دس روزہ کیمپ گاؤں آغاپور میں لگایا گیا تھا۔ طلبا جوش وخروش کے ساتھ قومی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ایک روز طلباء نے عہد کیا کہ اگر کسی بیمار یا زخمی شخص کو خون کی ضرورت پیش آئی تو وہ خوشی خوشی اپنے خون کا عطیہ دیں گے۔ اتفاق سے اسی روز ایک شخص کو خون کی ضرورت پیش آئی۔ ایک طالب علم نے بہ خوشی اپنا خون دیا۔ اس کے بعد جب ایک طالب علم نے اس خبر کو اخبار میں شائع کرانے کے لیے تحریر کیا تو عنوان

کے لیے اس مشہور ضرب المثل کا انتخاب کیا۔ ''سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔'' اگرچہ طالب علم کا مقصد اپنے عہد کو پورا کرنے کے ساتھ خوشی اور مسرت کا اظہار کرنا تھا مگر ضرب المثل کے بے جا انتخاب و استعمال نے نہ صرف معنی و مفہوم ہی کو کچھ سے کچھ کر دیا بلکہ مضحکہ خیز بھی بنا دیا۔ اس مثل کے معنی ہیں۔ ''کام شروع کرتے ہی نقصان ہوا'' یا ''ابتدا ہی سے کام میں خرابی پیدا ہوگئی۔''

اسی طرح کسی صاحب نے اپنے استاد کی خدمت میں اپنی ایک کتاب پیش کی۔ جس پر انہوں نے جلی حروف میں لکھا ''عطائے تو بہ لقائے تو۔'' ان صاحب کا مقصد تھا کہ آپ ہی کا تحفہ آپ کی نذر ہے۔ جب کہ اس مثل کا مفہوم ہے۔ ''تیری دی ہوئی چیز تیرے منہ پر۔'' اس کے لیے اُردو میں ایک مثل ہے۔ ''میاں کی جوتی میاں کا سر۔'' اس لیے کس کہاوت یا ضرب المثل کو کس موقع و محل پر استعمال کرنا چاہیے، سے واقفیت لازمی ہے۔

کہاوت اور ضرب المثل میں فرق

عام طور پر کہاوت، لوکوکتی اور ضرب المثل یا مثل کو ایک دوسرے کا مترادف یا ہم معنی خیال کیا جاتا ہے، جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ لفظ ضرب المثل یا مثل اور لوکوکتی کا تعلق بالخصوص تعلیم یافتہ یا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے ہے۔ جب کہ لفظ کہاوت کا تعلق عوام یا پورے سماج سے ہے۔ کسی جاہل، اَن پڑھ، کم تعلیم یافتہ اور دیہاتی شخص کے منہ سے عام طور پر لفظ ضرب المثل یا لوکوکتی سننے کو نہیں ملے گا۔ بہت سے اَن پڑھ اور دیہاتی لفظ ضرب المثل یا لوکوکتی کو سمجھتے بھی نہیں ہیں۔ ہاں کچھ لوگ لفظ مثل سے ضرور واقف ہیں لیکن لفظ کہاوت کم تعلیم یافتہ، تعلیم یافتہ، اَن پڑھ، جاہل، گنوار اور شہری، دیہاتی وغیرہ ہر طبقہ کے لوگوں میں رائج ہے۔ تمام لوگ اس لفظ کو بولتے، سمجھتے اور استعمال کرتے ہیں۔ یہ فرق تو ان الفاظ کے استعمال اور تشکیل پر مبنی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی تقریر و تحریر یا کسی معلوم شخصیت کے منہ سے نکلے ہوئے اہم جملے، فقرے، اقوال و ملفوظات وغیرہ کثرتِ استعمال کے سبب عوام کی میراث بن جاتے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے استعمال کیے جانے لگتے ہیں تو ضرب المثل یا کہاوت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں لیکن کہاوتوں کا تعلق عوام سے ہے۔ ان کی نشو و نما یا تخلیق و تشکیل عوام یا نامعلوم اشخاص کے ذریعہ ہوتی ہے۔ انہیں یہی لوگ رائج کرتے ہیں اور مقبول عام بھی بناتے ہیں۔ لہٰذا کہاوت ایسے اقوال اور جملوں کو کہنا چاہیے جن کا منبع یا سرچشمہ کوئی کتاب، صحیفہ، رسالہ یا معلوم شخصیت نہ ہو۔ کہاوت ہندی الاصل لفظ ہے۔ اس کے

اشتقاق کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ کہاوت کا تعلق سنسکرت الفاظ کتھاوت، کتھاورت، کتھاوستو، کتھاپنت، کتھاپتیہ اور کتھاوارتا سے ہونا چاہیے۔ ان میں سے سب سے قرین قیاس کتھاوت ہے۔ جس سے لفظ کہاوت کی تشکیل و تکمیل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہاوت کتھا، کتھاوارتا، کتھاورت یا کتھاوستو نہ ہو کر کتھاوت ہی ہوتی ہے۔ اگر ہم لفظ کہاوت کی تخلیق و تشکیل ''کتھاوت'' سے تسلیم کرلیں تو یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ لفظ کہاوت کا استعمال تمام لوکوکتیوں اور ضرب الامثال کے لیے نہ ہو بلکہ صرف ان کے لیے ہونا چاہیے جن کے پس منظر میں کوئی کتھا، حکایت، قصہ، تلمیح یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ عام طور پر کہاوت، ضرب المثل اور لوکوکتی کو ایک دوسرے کا مترادف یا ہم معنی خیال کیا جانے لگا ہے۔ اس لیے آج ان کے استعمال میں فرق کرنا اور ان کی حدود مقرر کرنا درست نہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ آج کے دور میں ہم صرف اسی کو کہاوت کہیں جن کے قصوں یا حکایتوں کے خالق عوام یا نامعلوم اشخاص ہوں۔ ایسا کرنے سے بہت سی کہاوتوں کو کہاوتوں کے باب سے خارج کرنا پڑے گا۔ جیسے ''ہنوز دلی دو راست'' یا ''ابھی دلی دور ہے۔'' (حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ)، ''آخ تھو کھٹے ہیں'' یا ''انگور کھٹے ہیں'' (حکایات لقمان)، ''آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا'' (امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ)، ''قلاوہ در گردن شتر'' یا ''اونٹ کے گلے میں بلی'' (ملا جامی رحمۃ اللہ علیہ)، ''کار بوزینہ نیست نجاری'' یا ''بندر کا کام بڑھئی گیری نہیں'' (انوارِ سہیلی) وغیرہ۔ پھر بھی ضرب المثل اور کہاوت کو بہ آسانی دو خانوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ کہاوت انھیں کہنا چاہیے جن کا تعلق کسی نہ کسی کتھا، قصے، حکایت، واقعہ یا تلمیح سے ہو یعنی حکایتی ضرب الامثال ہی کہاوت ہیں۔ جب کہ لوکوکتی یا ضرب المثل کے دائرے میں تمام ضرب الامثال اور کہاوتوں کو رکھا جاسکتا ہے خواہ ان کا تعلق کسی کتھا، قصے، حکایت یا تلمیح وغیرہ سے ہو یا نہ ہو۔ بہ الفاظ دیگر تمام کہاوتیں ضرب الامثال ہیں لیکن تمام ضرب الامثال کہاوتیں نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے پیش نظر کتاب ''کہاوتیں اور ان کے حکایتی و تلمیحی پس منظر'' کو کہاوت کی کتاب کہنا چاہیے نہ کہ کتاب ضرب الامثال۔

کہاوت اور لوک کہانیاں

کہاوتوں کے بننے اور سنورنے اور اس کے آغاز وارتقا میں بزرگوں کے اقوال وملفوظات، اہم شخصیات کے منہ سے نکلے ہوئے بعض ناقابل فراموش فقروں اور جملوں، دوہوں اور اشعار کے ٹکڑوں کے علاوہ قصص و حکایات، واقعات و تلمیحات اور لوک کہانیوں کا اہم رول رہا ہے۔ بعض کہاوتوں کا تعلق قدیم

قصے کہانیوں سے ہے تو بعض کا تاریخی یا نیم تاریخی واقعات سے ہے۔ کچھ کہاوتوں کے پس منظر میں من گھڑت اور خیالی کتھائیں ہیں تو کچھ کا تعلق سچے واقعات سے ہے اور بعض کہاوتوں کے وجود میں آنے کا سبب سبق آموز حکایتیں ہیں۔ مثلاً:

* گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے
* کھائیں بھیم ہگیں شگنی
* راجا نل پر بپتا پڑی
* بھونی مچھلی جل میں پڑی
* یہ منہ اور منصور کی دار (یہ منہ اور مسور کی دال)
* ناؤ خواجہ خضر نے ڈبوئی
* گنگا کا آنا تھا بھاگیرتھ کے سر جس ہوا

جن کا تعلق قدیم قصے کہانیوں سے ہے۔

* ہنوز دلی دور است (ابھی دلی دور ہے)
* کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی
* اڑھائی دن کی بادشاہت یا اڑھائی دن کی سقہ نے بھی بادشاہت کی ہے
* جسے نہ دے مولا اسے آصف الدولہ
* خان خاناں جن کے کھانے میں بطانہ

جن کے پس منظر میں تاریخی یا نیم تاریخی واقعات ہیں:

* تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو
* دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے
* آٹا دال اور اُلو بھی ہے
* اُدھار کھائے بیٹھے ہیں
* مونڈ مُنڈا یو سارا گاؤں کس کس کا لیجے ناؤں
* بِنیا نوے گھڑے دودھ میں ایک گھڑا پانی
* لینا ایک نہ دینا دو

* مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے
* اندھیر نگری چوپٹ راجا ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا

جیسی کہاوتوں کے وجود میں آنے کا سبب من گھڑت یا خیالی قصے کہانیاں ہیں:

* گُربہ کشتن روزِ اوّل یا بلی کو پہلے دن ہی مارنا چاہیے
* کارِ بوزینہ نیست نجاری یا بندر کا کام بڑھئی گیری نہیں
* اونٹ سستا ہے پٹا مہنگا
* قلاوہ در گردن شتر
* اونٹ کے گلے میں بلی
* آپ کا نوکر ہوں کچھ بینگنوں کا نوکر نہیں
* آخ تھو کھٹے ہیں یا انگور کھٹے ہیں
* اپنی ڈاڑھی سب پہلے بجھاتے ہیں
* وہ پانی بہہ ملتان گیا

ان کا تعلق سبق آموز حکایات یا سچے واقعات سے ہے۔

کہاوتوں کے حکایتی و تلمیحی پس منظر کا مطالعہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ متعدد حکایتوں کا تعلق دنیا کے عوامی ادب سے ہے۔ حکایات لقمان، الف لیلیٰ، انوارِ سہیلی وغیرہ کی کہانیاں عالمی ادب کا حصہ ہیں۔ اسی طرح پنچ تنتر، جاتک کتھا، ہتوپدیش، کتھاسرت ساگر وغیرہ کا شمار بھی عالمی ادب میں کرنا چاہیے کیونکہ ان کی کتھاؤں اور کہانیوں کی جڑیں ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔

صرف اردو یا ہندی ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی کہاوتیں، لوک کہانیوں اور عوامی قصوں کے بطن سے پیدا ہوئی ہیں۔ کہاوتوں اور لوک کہانیوں میں ایک گہرا، مضبوط اور اٹوٹ رشتہ ہے۔ تمام کہاوتوں کے وجود میں آنے کا سبب کوئی نہ کوئی قصہ، واقعہ، تلمیح، لوک کہانی یا حکایت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تجربات کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی حادثہ یا واقعہ ضرور ہوتا ہے جس کو کہانی یا قصے کے روپ میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ انہی قصوں، کہانیوں اور حکایتوں کو سماج کا ایک بڑا طبقہ وقت گزاری کے لیے یا اپنی بات کو پراثر بنانے کے لیے یا پھر لطف اندوز ہونے کے لیے دہراتا رہتا ہے۔ نتیجتاً اس کہانی، قصے یا حکایت کا کوئی کلیدی جملہ، بنیادی لفظ یا مرکزی خیال زبان زدِ عام ہو کر کہاوت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ فقرے

اور جملے جنہیں ہم کہاوت کہتے ہیں اپنے اندر ایک قسم کا اثر، زور اور دل کو چھو لینے کے ساتھ ساتھ دماغ کو جھنجوڑنے کی قوت رکھتے ہیں۔ ان میں تیزی بھی ہوتی ہے اور تندی بھی، نمکینی بھی ہوتی ہے اور شیرینی بھی، چٹپٹا پن بھی ہوتا ہے اور تلخی بھی۔

شروع میں تمام کہاوتیں عوامی نوعیت کی نہیں ہوتیں بلکہ دھیرے دھیرے اور کثرتِ استعمال کے سبب نہ صرف انہیں عوامی مقبولیت حاصل ہوتی ہے بلکہ بعض کہاوتوں کے ذریعہ حکایتیں اور کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کہاوتوں کے پس منظر میں کئی کئی حکایتیں یا کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے اپنے علاقے اور حالات کے تحت کہاوتوں کے جملوں یا فقروں کو مرکزی خیال تصور کر کے حکایتیں گھڑلی ہوں گی۔ اس کے برعکس بیشتر مقبول عام حکایتوں اور قصوں کے کلیدی جملوں یا مرکزی ٹکڑوں نے رفتہ رفتہ کہاوتوں کا روپ اختیار کرلیا ہوگا۔ گردشِ زمانہ کے سبب لوگ ان قصوں کہانیوں کے مصنفین اور اور ان کے مآخذ کو بھول گئے۔ انہی قصوں، کہانیوں اور حکایتوں کو ہم لوک کہانیوں کا نام دیتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر کہاوت اور حکایت کے وجود کے سلسلے میں دونوں باتیں ہوسکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ بعض کہاوتوں کے بطن سے حکایتوں اور قصے کہانیوں نے جنم لیا ہوگا اور بیشتر کہاوتیں حکایتوں اور قصے کہانیوں کے بطن سے پیدا ہوئی ہوں گی۔

بار بار کسی قصے، کہانی، واقعے، حادثے اور حکایت کو دہراتے رہنا تضیعِ اوقات اور اکتاہٹ کا باعث ہوسکتا ہے لیکن اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے، اپنی دلیل میں زور پیدا کرنے کے لیے اور دوسرے کو مرعوب کرنے کے لیے گزرے ہوئے واقعات و حادثات یا حکایات و قصص کا حوالہ دینا بھی بعض اوقات ضروری ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر پورے قصے یا حکایت اور واقعہ یا حادثہ کو بیان کیا جائے تو دلچسپی برقرار نہ رہے گی۔ اس لیے ان حکایات و واقعات کے اہم کلیدی جملوں، فقروں یا مرکزی خیال کو اختصار کے ساتھ بطور تلمیح یا کہاوت کے روپ میں پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ سننے والا ان کلیدی جملوں، فقروں یا مرکزی خیال کے ذریعہ پوری حکایت یا پورے واقعہ کو سمجھ لیتا ہے اور کہنے والا بھی اپنی بات میں زور اور تاثیر پیدا کر کے اختصار کے ساتھ کہہ دیتا ہے۔ جب ہم مندرجہ ذیل کہاوتوں کو سنتے ہیں تو وہ حکایتیں اور کہانیاں تصویر کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ جن کے یہ مرکزی خیالات و کلیدی جملے ہیں:

* انگور کھٹے ہیں
* ابھی دلی دور ہے

* چور کی ڈاڑھی میں تنکا
* جس کی لاٹھی اس کی بھینس
* روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے
* لیکھا جوکھا جیوں کا تیوں سارا کنبہ ڈوبا کیوں
* اندھیر نگری چوپٹ راجا ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا
* چھوڑو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا
* بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے
* گربہ کشتن روزِ اوّل
* بلی کو پہلے دن ہی مارنا چاہیے
* گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں
* آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا
* خدا جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے

اگر ہم کہاوتوں کے حکایتی و تلمیحی پس منظر سے واقف ہوں گے تو یقینی طور پر نہ صرف ان کو موقع ومحل کے لحاظ سے استعمال کرنے کی صلاحیت وقدرت ہی رکھیں گے بلکہ معنویت میں بھی اضافہ کرنے کے ساتھ لطف اندوز بھی ہوں گے۔

*

آب آب کرمر گئے سرہانے دھرارہا پانی

غیر ملکی زبان بولنے والوں پر طنز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے سامنے غیر ملکی یا وہ زبان بولنا جسے وہ سمجھتے نہ ہوں، نادانی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک چھوٹی سی کہانی ہے:

کہانی: ایک مرتبہ کوئی شخص تعلیم حاصل کرنے کے لیے کابل گیا۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے ملک میں آکر بیمار ہو گیا۔ جب اسے بیماری کی حالت میں پیاس محسوس ہوئی تو وہ ''آب، آب'' کر کے پانی مانگنے لگا۔ گھر کا کوئی بھی شخص یہ نہ سمجھ سکا کہ اسے پانی چاہیے۔ آخرکار پیاس کی شدت کی تاب نہ لاکر اس نے دم توڑ دیا۔ پوری کہاوت اس طرح ہے:

''کابل گئے مغل ہو آئے بولے اُٹ پَٹ بانی، آب آب کر مر گئے سرہانے دھرا رہا پانی۔''

اس کہاوت کو اس طرح بھی کہا جاتا ہے:

''کابل گئے مغل بن آئے، بولنے لگے بانی، آب آب کر مر گئے، سرہانے دھرا رہا پانی۔''

آپ سے آتی ہے تو آنے دو

ناجائز چیز کو زبردستی جائز قرار دینا۔ اپنے لیے حرام چیز کو حلال کر لینا۔ ایسا راستہ یا جواز تلاش کرنا جس سے ممنوعہ چیز بھی حاصل ہو جائے اور بدنامی سے بھی بچا جا سکے۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر کہی جاتی ہے

جب کوئی شخص کسی ایسی چیز کو حاصل کرنا چاہے جس کے لیے وہ دوسروں کو منع کرتا ہو مگر اس چیز کو حاصل کرنے کا جواز بھی تلاش کر لے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کسی شہر میں ایک مولوی رہتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک پڑوسی کی مرغی گھس آئی۔ مولوی کی بیوی نے کہا:

''ایک عرصہ سے مرغی کا گوشت نصیب نہیں ہوا۔ اگر اس کو ذبح کر کے پکایا جائے تو بڑا لطف آئے۔''

مولوی نے کہا:

''دوسرے کی مرغی کا گوشت کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟''

مگر بیوی کے بار بار اصرار کرنے پر مولوی صاحب نے کہا:

''ٹھیک ہے۔ تم اس کو ذبح کر کے پکا لو مگر میں اس کا گوشت کھانے والا نہیں، کیونکہ میں مولوی ہوں اور ناجائز چیز کو استعمال کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اگر ایسا کروں گا تو لوگ مجھے عزت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔''

بیوی نے مرغی کو ذبح کیا گوشت پکا کر تیار کیا۔ مولوی صاحب کے لیے دال بنائی گئی۔ دستر خوان پر کھانا چنا گیا۔ مولوی اور ان کی بیوی کھانے کے لیے بیٹھے۔ مولوی نے دال اور ان کی بیوی نے گوشت کے ساتھ روٹی کھانا شروع کی۔ اس درمیان میں مولوی صاحب للچائی نظروں سے مرغی کے سالن کو دیکھتے جا رہے تھے۔ بیوی نے بھانپ کر مولوی صاحب سے کہا:

''مرغی کی بوٹیاں آپ کے لیے ناجائز ہیں مگر شوربا لینے میں کوئی حرج نہیں۔''

مولوی راضی ہو گئے۔ بیوی نے ہانڈی میں سے، مولوی صاحب کے لیے شوربا نکالنا شروع کیا۔ وہ بڑی احتیاط سے شوربا نکال رہی تھی کہ ایک بوٹی بھی پیالے میں کسی طرح آ گئی۔ بیوی نے چاہا کہ پیالے سے بوٹی نکال کر ہانڈی میں ڈال دے مگر مولوی صاحب فوراً بول اٹھے:

''آپ سے آتی ہے تو آنے دو۔''

اس پر بیوی نے کہا:

''مرغی بھی تو آپ سے آئی تھی۔''

اس کے بعد دونوں نے چھک مرغی کا گوشت اڑایا۔'' (مزید دیکھیے: آپ سے آئے تو آنے دو۔)

آپ سے آئے تو آنے دو

اگر کوئی شخص کسی لالچ میں پڑ کر کسی بہانے کوئی کام کرے یا اس کام کو بہانا بنا کر کرے جسے وہ برا سمجھتا ہو تو اس کہاوت کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

اس کہاوت سے متعلق دو چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں:

کہانی: ایک مریض گوشت نہیں کھاتا تھا۔ ایک روز اپنی بیوی کے اصرار پر اس نے تھوڑا سا گوشت کا شوربا چکھ لیا۔ شوربا مزے دار لگا۔

طبیعت للچائی تو اس نے بیوی سے کہا:

''تھوڑا سا شوربا اور دے دو۔''

بیوی جب شوربا نکال کر دینے لگی تو اتفاق سے اس میں ایک بوٹی بھی آ گئی۔ بیوی نے جیسے ہی چاہا کہ بوٹی کو اس کے برتن سے نکال لے تو شوہر بولا:

''جو آپ سے آئے تو آنے دو۔''

لہٰذا بیوی نے ایسا ہی کیا اور کئی بوٹیاں اس کے برتن میں نکال کر پیش کر دیں جنہیں اس شخص نے خوب مزے لے لے کر کھایا۔

دوسری کہانی ایک پنڈت جی سے متعلق ہے جو سب کو اُپدیش دیا کرتے تھے کہ ہندوؤں کے لیے بینگن کھانا ناجائز اور خلاف مذہب ہے۔ ایک روز کسی نے بینگن سے بھری ہوئی ایک ٹوکری ان کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ پنڈت جی کی بیوی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں لالچ پیدا ہوا۔

اس نے پنڈت جی سے کہا:

''آپ سے آئے تو آنے دو۔''

بینگنوں سے بھری ٹوکری دیکھ کر پنڈت جی کے دل میں لالچ پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ راضی ہو گئے اور بینگنوں سے بھری ہوئی ٹوکری قبول کر لی۔

(دیکھیے: آپ سے آتی ہے تو آنے دو)

آپ کا نوکر ہوں کچھ بینگنوں کا نوکر نہیں

آپ کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔آپ جو کچھ کہتے ہیں اس کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے جھوٹ سچ سے کوئی مطلب نہیں۔اپنے مالک یا حاکم کی جی حضوری کرنے والے کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔اس کہاوت سے متعلق اکبر بادشاہ اور بیر بل کے مابین گفتگو مشہور ہے:(دوسری حکایت کے لیے دیکھیے:حضور کا غلام ہوں بینگن کا نہیں)۔

کہاوت:

ایک روز اکبر بادشاہ اپنے دربار میں بینگن کی برائی بیان فرما رہے تھے جو کچھ اس قسم کی تھی کہ بینگن بھی کوئی ترکاری ہے؟ مضر صحت، سیاہ، کالا کلوٹا، بے ڈول وغیرہ وغیرہ۔ بیر بل ہاں میں ہاں ملاتے جاتے تھے اور برابر کہے جارہے تھے کہ:''حضور آپ صحیح فرمارہے ہیں۔''

دوسرے روز جب اکبر بادشاہ اپنے دربار میں تشریف لائے اور درباریوں کے سامنے بینگن کی تعریف کے پل باندھنے لگے تو ہاں میں ہاں ملانے اور جی حضور، جی حضور کہنے والوں میں بیر بل سب سے آگے تھے۔

اکبر بادشاہ متعجب ہو کر سوچنے لگے کہ جب میں کل بینگن کی برائی کر رہا تھا تو بیر بل ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور آج جب بینگن کی تعریفیں کر رہا ہوں تو بھی جی حضور، جی حضور کر رہے ہیں۔انہوں نے بیر بل سے اس کا سبب جاننا چاہا تو بیر بل نے بڑے ادب واحترام سے کہا:

''حضور! آپ کا نوکر ہوں، کچھ بینگنوں کا نوکر نہیں۔''

آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے

آپ ہی کی بدولت ہے۔آپ ہی کے کرم سے ہے یعنی آپ ہی کا اپنا مال ہے۔میرا کچھ نہیں ہے۔میں تو محض ایک وسیلہ ہوں۔کسی بڑے یا بزرگ شخص کے سامنے اس کی بڑائی اور اپنی کم مائیگی کا اظہار کرنے کے لیے اس کہاوت کو کہتے ہیں۔اس کہاوت کا تعلق ایک دلچسپ کہانی سے ہے، جو اس طرح ہے:

کہانی: ایک مسخرے نے کسی تقریب کے موقع پر اپنے عزیز واقارب کو مدعو کیا جب وہ لوگ

کھانے میں مصروف ہو گئے تو اس شخص نے اپنے نوکر کو حکم دیا کہ نظریں بچا کر ان سب کے جوتے اٹھا لے اور بازار میں جا کر فروخت کر آئے۔ نوکر نے ایسا ہی کیا۔ لوگوں نے کھاتے وقت اس کی بہت تعریفیں کیں اور کہا آپ نے ہم لوگوں کی خاطر بہت زحمت کی اور نہایت عمدہ عمدہ کھانے پیش کیے۔ اس شخص نے ہاتھ جوڑ کر نہایت عاجزی اور انکساری سے کہا:

''میں کہاں اس لائق ہوں کہ آپ لوگوں کی خاطر و مدارات کر سکتا۔ آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔''

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب ان لوگوں کو پتا چلا ہے کہ ہم لوگوں کی جوتیوں کو بیچ کر کھانے کی رقم ادا کی گئی ہے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کہاوت کو یوں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سب آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

آ پھنسے بھائی آ پھنسے

مجبوراً اور دل پر جبر کر کے کسی کو خوش کرنے کیلئے اس کی تعریف کرنے کے موقع پر کہتے ہیں۔ اس مثل سے متعلق ایک کہانی ہے:

کہانی:

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو ایک مسلمان دوست سے ملنے گیا، محرم کا مہینہ تھا۔ دوست کے یہاں ماتم کی مجلس ہو رہی تھی۔ ناچار اس کو بھی اس مجلس میں شامل ہونا پڑا۔ مسلمان سینہ کوبی کر رہے تھے یعنی اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ مار مار کر ''ہائے حسین، ہائے حسین'' کہتے جاتے تھے۔ ہندو دوست ''ہائے حسین، ہائے حسین'' کہنے کے بجائے ''آ پھنسے بھائی آ پھنسے'' کہہ کر ان کی آواز میں آواز ملا رہا تھا۔ اس پر مسلمان بہت خوش ہوئے کہ وہ ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ اگر چہ وہ ایسا قطعی نہیں کر رہا تھا۔''

آٹا، دال اور اُلّو بھی ہے

جب کوئی شخص اپنی بے وقوفی کے سبب کسی کے فریب میں آ جائے اور پھر نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے تو اس موقع پر یہ کہاوت کہتے ہیں۔

اس کہاوت سے متعلق ایک دلچسپ کہانی ہے:

کہانی:

ایک فریبی شکاری کے ہاتھ الو لگ گیا۔ اس نے اس کو فروخت کرنے کی یہ تدبیر کی کہ ایک بنیے کی دوکان کے سامنے جا کر آواز لگائی:

''الو لے لو، الو لے لو۔ آج کل الو کا کال ہے اور مانگ زیادہ ہے۔''

بنیے نے شکاری کو پاس بلا کر پوچھا:

''الو کس کام آتا ہے اور اس کی مانگ اس وقت کیوں زیادہ ہے؟''

شکاری نے جواب دیا:

''سیٹھ جی! آج کل شادی بیاہ کا زمانہ ہے۔ بیاہ کی ایک خاص رسم کے لیے الو کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی لیے الو عنقا ہو گیا ہے۔ ڈھونڈے سے بھی نہیں مل رہا ہے۔ بڑی مشکل سے یہ ایک الو ہاتھ لگا ہے۔ اگر آپ اسے لینا چاہیں تو ایک ہزار روپے میں آپ کو دوں گا۔ شادی بیاہ والے تو اسے دو ڈھائی ہزار روپے میں خوشی خوشی خرید لیں گے۔''

بنیے نے اسے خرید لیا۔ شکاری روپے لے کر چلتا بنا۔ اس کے بعد الو کو فروخت کرنے کی غرض سے بنیا ہر سودا خریدنے والے سے بار بار کہتا تھا کہ:

''صاحب ہماری دکان میں آٹا، دال اور الو بھی ہے۔''

آج نہیں کل

ٹال مٹول کرنے والے کے لیے کہتے ہیں یا پھر ٹال مٹول کرنے والا کہتا ہے۔

آخ تھو کھٹّے ہیں

دیکھیے: انگور کھٹّے ہیں۔

آخر چنگی دینا ہی پڑی

جب کوئی شخص نہایت چالاکی کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام ہو تو کہتے ہیں۔اس کہاوت سے متعلق ایک کہانی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: ایک شخص اپنا مال لے کر کسی شہر کے لیے روانہ ہوا مگر وہ اپنے مال کی چنگی دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے رات کے شروع ہوتے ہی کسی دوسرے راستے سے اپنا سفر شروع کیا مگر راستہ بھول جانے کے سبب صبح ہوتے ہوتے اسی مقام پر جا پہنچا جہاں چنگی افسر کا دفتر تھا۔اسے آخر کار چنگی دینا ہی پڑی۔

آدھی بوڑھی، آدھی جوان

جب کوئی شخص ڈھلمل یقین ہو یا دوطرفہ بات کرے تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے پس منظر میں ایک دلچسپ کہانی ہے:

کہانی: ایک برہمن غریبی سے پریشان ہو کر اپنی گائے کو فروخت کرنے کے لیے بازار لے گیا مگر جب کئی روز تک لگاتار بازار لے جانے کے باوجود بھی اس کی گائے فروخت نہ ہو سکی تو اس کے ایک دوست نے پوچھا کہ: ''آپ روزانہ گائے کو لے کر کہاں جاتے ہیں؟''

پنڈت جی نے سارا قصہ کہہ سنایا۔اس شخص کے مزید پوچھنے پر پنڈت جی نے بتایا کہ وہ اس گائے کی عمر اس کی حقیقی عمر سے زیادہ بتاتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ جس طرح آدمی کی عمر زیادہ ہونے سے وہ زیادہ عقل مند، دانا اور تجربہ کار ہو جاتا ہے اسی طرح گائے کی عمر زیادہ بتانے سے اس کی قیمت زیادہ ملنا چاہیے۔پنڈت جی کے دوست نے تمام باتیں سن کر پنڈت جی سے کہا کہ:

''جانور کی عمر بڑھنے سے اس کی قیمت کم ہوتی جاتی ہے اس لیے تم اس گائے کی عمر کم بتا کر فروخت کرآؤ۔''

پنڈت جی اس گائے کو لے کر پھر بازار گئے اور راستہ بھر سوچتے رہے کہ میں کئی بار اس گائے کی عمر کو زیادہ بتا چکا ہوں۔اب اگر اس کی عمر کم بتاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ تمام غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اب تو میں اس کی عمر نہ ہی زیادہ بتاؤں گا اور نہ ہی کم۔اگر خریدار اس کی عمر پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ آدھی بوڑھی ہے آدھی جوان۔

آدھے قاضی قدوہ، آدھے باوا آدم

اس کہاوت کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جو کثیر الاولاد ہو۔ بہت سے بیٹوں پوتوں والا شخص۔ کسی بات کے ناقص رہنے پر بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے:

کہاوت: اس کہاوت کے حکایتی پس منظر سے متعلق مشہور ہے کہ قاضی قدوہ کی بیوی ایک دفعہ میں ستر ستر (۷۰-۷۰) بیٹوں کو جنم دیتی تھی۔ اس سبب سے لوگوں کا گمان ہے کہ دنیا کی آدھی آبادی کو بڑھانے میں قاضی قدوہ بھی نصف کے شریک ہیں۔ کسی کا مصرع ہے:

قُدوہ نمودِ خلق میں آدم سے کم نہیں

اگرچہ کثیر الاولاد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے مگر بعض حضرات کسی بات یا چیز کے ناقص رہنے پر بھی بولتے ہیں جیسے ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' والی کہاوت۔

آگ پر موتو یا مسلمان ہو

کسی ایسے کام یا کسی ایسی بات کے لیے مجبور کرنا جس میں ہر طرح نقصان یا خرابی ہو۔ دو مضر یا خلاف مذہب باتوں میں سے جبراً کسی ایک بات پر راضی کرنا۔ کئی صورتوں میں سے ایک ہی نتیجہ پیدا کرنا۔ جب کوئی شخص کسی کام کے کرانے میں جلدی کرتا ہے تو اس کے جواب میں بالفعل یہ مثل کہی جاتی ہے:

مثل: غیر مستند روایت ہے کہ جب اوّل اوّل اسلام کی حکومت ہوئی یا مغل سلطنت قائم ہوئی تو اس کے استحکام کے لیے اکثر ہندوؤں کو اس بات کیلئے مجبور کیا گیا کہ اگر تم کو مسلمان ہونا گوارا نہیں ہے تو آگ میں موتو یعنی آگ میں پیشاب کرو۔ (ہندوؤں کے لیے آگ مقدس اور قابل پرستش ہے۔ وہ آگ کو دیوتا تسلیم کرتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں)۔ چوں کہ دونوں صورتوں میں ہندوؤں کو اپنے مذہب سے علیحدہ ہونا پڑتا تھا اس لحاظ سے وہ لوگ ناچار جلدی سے مسلمان ہونے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس زیادتی کا یہاں تک اثر ہوا کہ یہ مثل بن گئی اور اس نے ایسا رواج پایا کہ طنزاً ہر ایک جلد کام لینے والے اور ہر طرح مجبور کرنے والے کے حق میں بولنے لگے مگر یہ کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بداندیشوں کی گھڑی ہوئی روایت ہے۔

آگ پر موت یا مسلمان ہو

دیکھیے: آگ پر موتو یا مسلمان ہو۔

آلا دے نِوالہ

اے طاق تو مجھے روٹی کا ٹکرا دے۔ یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی کسی کی پرانی یا پیدائشی عادتیں نہ چھوٹیں۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ کہانی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: ایک عاشق مزاج بادشاہ ایک خوبصورت بِھکارن کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گیا اور اس سے شادی کر لی۔ بادشاہ اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کے لیے عیش و عشرت کا تمام سامان فراہم تھا اور ہر روز انواع و اقسام کے کھانے تیار کرائے جاتے تھے مگر اس کو کھانوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ بیمار سی لگنے لگی تھی۔ تندرستی خراب ہو رہی تھی۔ جب کوئی علاج کارگر نہ ہوا تو ایک تجربہ کار حکیم کو بلایا گیا۔ حکیم نے اس کی سابقہ زندگی سے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد بادشاہ سے کہا کہ:

"حضور محل کے ہر طاق میں تھوڑا تھوڑا کھانا رکھ دیا جائے اور رانی صاحبہ کو تنہائی میسر کرادی جائے۔"

بادشاہ نے حکیم کے مشورے کے مطابق ایسا ہی کیا۔ اب رانی صاحب اٹھیں اور ہر طاق کے سامنے جا جا کر طاق سے کہنے لگیں: "آلا دے نِوالہ"، "آلہ دے نِوالہ"

ہر طاق سے نوالہ اٹھا کر کھا لیتی۔ اس طرح وہ دھیرے دھیرے شکم سیر ہو جاتی۔ چند روز کے بعد رانی صحت مند ہو گئی، بیماری جاتی رہی اور وہ محل میں خوش و خرم رہنے لگی۔ حکیم نے بادشاہ کو بتایا کہ یہ پیدائشی بِھکارن ہے۔ اسے ایک ساتھ انواع و اقسام کے کھانے راس نہیں آئیں گے۔ جب اس کو کئی طاقوں سے ایک ایک لقمہ یا تھوڑا تھوڑا کھانا ملنے لگا تو اس کی پیدائشی عادت کی تکمیل ہو گئی۔

آنکھ کے آگے ناک، سوجھے کیا خاک

آنکھ پر تو پردہ پڑا ہے، دکھائی کیا دے گا؟ جو لوگ اپنی کمی یا عیب کو ختم نہیں کر سکتے اور بے عیب یا

بے قصور اشخاص پر الزام لگاتے ہیں وہ انہیں بھی اپنے جیسا بنانے کے لیے فریب اور چھل سے کام لیتے ہیں۔اس کہاوت کے ساتھ ایک کہانی جڑی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: کسی زمانے میں ایک نکٹے نے اپنے جیسے لوگوں کی تعداد بڑھانے کے لیے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوتا ہے۔اس کے اس دعوے پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ ہم لوگ بھی تو آنکھ والے ہیں تو پھر ہم کو اللہ تعالیٰ کا دیدار کیوں نہیں ہوتا؟اس کے جواب میں نکٹے نے کہا:

''آنکھ کے آگے ناک، سوجھے کیا خاک''

یعنی تم لوگوں کی آنکھوں کے آگے ناک ہے جس کی اوٹ کے سبب خدا کا دیدار نہیں ہوسکتا۔اگر آپ لوگ بھی اپنی ناک کٹوا دیں تو آپ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکیں گے۔اس کی اس بات سے متاثر ہوکر لوگوں نے اپنی ناک کٹوانا شروع کر دی مگر کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوا۔آخر کار اپنی اپنی بیوقوفی اور نادانی پر نادم ہوکر ان نکٹوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ ناک ہونے کے سبب انہیں خدا کا دیدار نہیں ہوتا تھا۔اس طرح نکٹوں کی تعداد بڑھنے لگی۔

آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں

دیکھیے: آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی تھیں۔

آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی تھیں

معمولی کام کے رہ جانے پر کچھ سے کچھ ہوگیا۔ذرا سی غفلت میں کام بگڑ گیا۔بہت سا کام ہو چکا تھوڑا سا باقی ہے۔اگر کوئی شخص کسی مشکل کام کو نہایت لگن اور جاں فشانی سے بڑی حد تک پورا کر لے اور اس کام کا باقی معمولی حصہ کوئی دوسرا شخص کر کے بھرپور فائدہ حاصل کر لے تو اس موقع پر اس کہاوت کو کہتے ہیں:

کہاوت: اس کہاوت سے متعلق تین حکایات مشہور ہیں:

پہلی حکایت یہ ہے کہ ایک شہزادی کی شادی جنگل میں ایک ایسے مردہ شہزادے کے ہمراہ ہوئی جس کے تمام جسم میں سوئیاں چُبھی ہوئی تھیں۔انہیں سوئیوں کے سبب اس شہزادے کا جسم بے روح ہوگیا تھا۔شہزادی ان سوئیوں کو اس مردہ شخص کے جسم سے نکالا کرتی تھی۔شہزادی کی ایک لونڈی بھی اس کے

ساتھ تھی جو یہ سب کچھ بغور دیکھا کرتی تھی۔ایک روز شہزادی کسی کام سے باہر گئی۔لونڈی نے دیکھا کہ مردہ شہزادے کے جسم کی تمام سوئیاں نکالی جاچکی ہیں صرف آنکھوں کی باقی ہیں۔اس نے تھوڑی ہی دیر میں آنکھوں کی سوئیاں نکال ڈالیں۔آخری سوئی کے نکلتے ہی مردہ شہزادہ زندہ ہوگیا۔اس لونڈی نے اپنے آپ کواس کی بیوی بتایا۔جب وہ شہزادی واپس آئی تو اسے اپنی لونڈی کہا۔اس طرح لونڈی رانی بن کر اور شہزادی لونڈی بن کر رہنے لگی۔جب ایک مدت کے بعد کسی طرح راز فاش ہوا تو شہزادی کے دن پھرے اور لونڈی کو سزا بھگتنی پڑی۔

دوسری حکایت ہے کہ کسی بادشاہ کی ایک بیٹی تھی۔وہ اکثر مردانہ لباس پہن کر بادشاہ کے ساتھ شکار کھیلنے جایا کرتی تھی۔ایک روز انہیں جنگل میں ایک خوبصورت ہرن نظر آیا مگر وہ ہرن گھوڑوں کی ٹاپ کی آوازوں سے چونک کر چوکڑی بھرنے لگا۔شہزادی نے اس کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ہرن چوکڑی بھرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔شہزادی کا گھوڑا بھی لگاتار اس کا پیچھا کرتا رہا۔اسی دوران بہت زور کی آندھی آئی۔بارش ہونے لگی۔آندھی اور بارش سے بچنے کے لیے ہرن ایک عالی شان عمارت کے سامنے رک گیا۔شہزادی بھی پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ گئی۔ہرن نے اس کو دیکھا تو فوراً عمارت کے اندر چلا گیا۔شہزادی نے بھی آناً فاناً گھوڑے کی باگ کھینچی اور اندر داخل ہوگئی۔اسی اثنا میں بادشاہ بھی وہیں آن پہنچا۔اس کے پہنچتے ہی زور کی گڑگڑاہٹ شروع ہوئی اور عمارت کا دروازہ بند ہوگیا۔تمام کوشش کے باوجود بھی بادشاہ اندر داخل نہ ہوسکا۔اب بادشاہ بہت پریشان ہوا۔بیٹی نے باپ کو اندر سے سمجھایا کہ آپ کے غائب ہونے سے دربار اور ملک میں کہرام مچ جائے گا،رعایا پریشان ہوگی۔آپ واپس راجدھانی جایئے اور میری رہائی کی کوئی تدبیر کیجئے۔میں بھی یہاں ہمت سے کام لوں گی۔ناچار بادشاہ کو واپس ہونا پڑا۔بادشاہ نے اپنے دربار کے وزراء اور امراء سے طلسمی محل کا کُل حال بیان کیا۔شہزادی کی گمشدگی کی خبر سے راجدھانی میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔بادشاہ سیاہ پوش ہوگیا۔ادھر شہزادی نے اس طلسمی محل میں گھومنا اور جائزہ لینا شروع کیا۔وہ سنگِ مرمر کی ایک بارہ دری میں پہنچی۔وہاں سے ایک شیش محل میں داخل ہوئی جہاں ایک خوب رو شہزادے کے تمام جسم میں طلسمی سوئیاں چُبھی ہوئی تھیں۔یہ منظر دیکھ کر شہزادی کا دل لرز گیا۔اس نے شہزادے سے کئی سوالات کیے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔بس ایک مردہ کی طرح خاموش پڑا رہا۔اس کی حالت پر شہزادی کو ترس آیا اور اس نے جسم سے سوئیاں نکالنی شروع کردیں۔شہزادی روزانہ اس کے بدن سے سوئیاں نکالتی رہی۔اس نے تمام جسم کی سوئیاں نکال ڈالیں۔اب صرف آنکھوں کی سوئیاں باقی

رہ گئی تھیں۔ ایک دن شہزادی کو اچانک محل کے باہر سے کسی انسان کی آواز سنائی دی۔ وہ خوش ہو کر باہر کی طرف دوڑی کہ شاید بادشاہ نے کوئی کارگر تدبیر نکالی ہے۔ شہزادی نے عمارت کی چھت پر چڑھ کر دیکھا تو ایک عورت نظر آئی جو ہار بیچ رہی تھی۔ شہزادی نے اس کو آواز دی اور کمند ڈال کر اس کو اوپر کھینچ لیا۔ شہزادی نے دیکھا کہ وہ عورت نہایت خوبصورت اور سلیقہ مند ہے۔ اس سے کئی سوال کیے مگر راجدھانی سے اس کا کوئی تعلق نہ نکلا۔ پھر بھی شہزادی کو ڈھارس بندھی کہ ایک ساتھی کی موجودگی سے اس کا دل بہلے گا اور مل بیٹھ کر کوئی تدبیر بھی سوچیں گی۔

تھوڑی دیر کے بعد شہزادی غسل کے لیے چلی گئی اور اس ہار والی عورت کو شہزادے کی دیکھ بھال کے لیے وہیں بٹھا دیا۔ عورت نہایت چالاک تھی۔ اس نے شہزادے کی آنکھوں سے جلدی جلدی سوئیاں نکالنی شروع کر دیں۔ آخری سوئی نکلتے ہی شہزادہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے خوبصورت عورت کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ عورت نے شہزادے سے کہا:

"میری لونڈی نہانے گئی ہے۔ وہ آجائے تو آپ اسے محل کی چھت پر پہرا دینے کا حکم دے دیجیے تاکہ ہم لوگ عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔"

لہٰذا شہزادے نے شہزادی کو چھت پر پہرا دینے کے لیے تعینات کر دیا۔ شہزادی حکم بجا لائی۔ ایک مدت کے بعد شہزادے نے یکسانیت کی زندگی سے تنگ آ کر سیاحت کا فیصلہ کیا۔ اس عورت اور شہزادی سے سوغات لانے کے لیے پوچھا۔ عورت نے اپنی پسندیدہ بیش بہا اشیاء کی فرمائش کی اور شہزادی نے کہا:

"اگر سوہن گڑیوں کا صندوقچہ دستیاب ہو جائے تو لیتے آئیے گا۔"

شہزادے نے سیاحت کے دوران میں اس کی تلاش کی مگر صندوقچہ کہیں ہاتھ نہیں لگا۔ آخر کار جہاز پر واپس آیا اور جہاز کا لنگر چھوڑ دیا مگر جہاز نہ چلا۔ آپس میں مشورے ہونے لگے۔ ایک تجربہ کار بزرگ نے کہا کہ کسی شخص کی فرمائش پوری نہیں ہوئی ہے۔ اب جہاز کا چلنا محال ہے۔ شہزادی کی فرمائش رہ گئی تھی۔ شہزادے نے جہاز سے اتر کر "سوہن گڑیوں کے صندوقچہ" کی تلاش کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل میں کئی سردار مختلف شہروں کو روانہ ہو گئے۔ ایک سردار شہزادی کے باپ کی راجدھانی میں پہنچا۔ بادشاہ شہزادی کے غم میں اندھا ہو چکا تھا۔ اس کے وزیروں نے سفیر کی اطلاع دی اور صندوقچہ طلب کیے جانے کی بات کہی۔ بادشاہ نے وہ طلسمی صندوقچہ اس سردار کے حوالے کر دیا۔ صندوقچہ لے کر وہ جہاز پر پہنچا تو سب خوش ہو گئے اور لنگر ڈالتے ہی جہاز چلنے لگا۔

شہزادہ اپنے طلسمی محل میں داخل ہوا اور دونوں کو ان کی سوغاتیں پیش کر دیں۔ اب شہزادی کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ رات کو جنگل میں نکل جاتی۔ وہاں صندوقچے کو کھولتی۔ صندوقچہ کھلتے ہی محفل آراستہ ہو جاتی۔ شہزادی نہا دھو کر ساری رات گڑیوں سے کھیلتی رہتی۔ صبح کو رخصت کے وقت تمام گڑیاں بار بار کہتیں:

''ساری سوئیاں نکالیں، آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں، بیوی تھی سو لونڈی بن گئی، لونڈی تھی سو بیوی بن گئی۔''

ایک رات اچانک شہزادے کی آنکھ کھل گئی اور جنگل کی محفل پر اس کی نظر پڑی۔ وہ اس محفل کو ''اندر سبھا'' سمجھا۔ چھپ کر صبح تک اس دلچسپ منظر کو دیکھتا رہا۔ گڑیوں نے حسبِ معمول وہی مثل دہرائی۔ شہزادہ سمجھ گیا کہ یہ تو میری داستان ہے۔ آخر کار ساری اصلیت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ جس وقت وہ عورت نہانے کو گئی تو شہزادے نے چھت پر چڑھ کر شہزادی سے کہا:

''مجھے اصل بات کا پتہ چل گیا ہے۔ اب یقین کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی شہزادی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ شہزادے کو اصلیت کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے شہزادی سے معافی مانگی اور اسے چھت سے اتار کر محل میں لایا۔ اس کے بعد اس عورت سے کہا تو ڈلا کٹنی نکلی۔ تو نے اب تک دو زندگیاں تباہ کیں۔ یہ سن کر عورت لرز گئی۔ شہزادے نے اس کو زمین میں دفن کرا دیا۔ پھر شہزادی کو لے کر اس کے ملک میں پہنچا۔ بیٹی کو باپ سے ملایا۔ باپ کی آنکھیں بھی روشن ہو گئیں اور سلطنت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شہزادی کبھی کبھی شہزادے کو چھیڑنے کے لیے کہہ دیا کرتی تھی کہ دنیا میں بھی کیا کیا نیرنگی ہے۔ ساری سوئیاں نکالیں، آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں۔ بیوی تھی سو لونڈی بن گئی، لونڈی تھی سو بیوی بن گئی۔

تیسری حکایت اس طرح ہے:

ایک عورت اپنے شوہر سے کسی بات پر ناراض ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر کے تمام جسم میں سوئیاں چبھو کر اُسے بے روح کر دیا۔ پھر کچھ سوچ کر اس کے جسم سے سوئیاں نکالنا شروع کر دیں۔ اس نے تمام جسم کی سوئیاں نکال ڈالیں صرف آنکھوں کی باقی رہ گئی تھیں کہ وہ کسی کام سے باہر چلی گئی۔ اسی وقت اس کی لونڈی وہاں پہنچ گئی۔ لونڈی بہت ہوشیار تھی۔ اس نے جلدی جلدی آنکھوں کی سوئیاں نکال دیں۔ آخری سوئی نکلتے ہی وہ شخص زندہ ہو گیا اور اس نے یہ خیال کیا کہ مجھے دوبارہ زندگی عطا کرنے والی لونڈی ہی ہے۔ لہٰذا اس نے لونڈی سے شادی کر لی اور اپنی بیوی کو سخت سزا دی۔

آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا

سامنے سے سب کچھ لٹ گیا یا جاتا رہا اور تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ غافل اور بے فکر کی نسبت بولتے ہیں۔ امیر خسرو کی ایک اَن مل کا آخری ٹکڑا ہے۔ پورا جملہ یہ ہے:

''کھیر پکائی جتن سے، چرخہ دیا جلا، آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا، لا پانی پلا، لا پانی پلا۔'' اس کا پس منظر یہ ہے:

پس منظر: ایک کنویں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو راستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ وہ کنویں پر جا پہنچے اور ان پنہاریوں سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک انہیں پہچانتی تھی۔ اس نے دوسری پنہاریوں سے کہا:

''دیکھو کھسرو (خسرو) یہی ہے۔''

اس کے بعد پنہاریوں نے امیر خسرو سے پوچھا:

''کیا تم ہی خسرو ہو جس کے سب لوگ گیت گاتے ہیں۔ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور اَن مِل وغیرہ سنتے ہیں۔''

امیر خسرو نے کہا:

''ہاں میں ہی وہ امیر خسرو ہوں۔''

اس پر ان میں سے ایک بولی:

''مجھے کھیر کی بات کہہ دے۔''

دوسری نے چرخہ پر کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ تیسری نے ڈھول کے بارے میں کہنے کے لیے کہا، چوتھی نے کہا:

''میں تو کتے کے بارے میں کچھ سننا چاہتی ہوں۔''

چاروں پنہاریوں نے آپس میں بے میل چیزوں پر فرمائش کرنے کا مشورہ کر لیا تھا تاکہ امیر خسرو کو اس طرح دیر تک سن کر محظوظ ہو سکیں۔ امیر خسرو نے کہا:

''اچھا پہلے پانی پلا دو، مارے پیاس کے دم نکلا جاتا ہے۔''

وہ بولیں:

''جب تک ہماری فرمائش پوری نہ ہوگی۔ہم پانی نہیں پلائیں گی۔''

امیر خسرو نے مجبور ہو کر فوراً کہا:

''کھیر پکائی جتن سے، چرخہ دیا جلا، آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا، لا پانی پلا، لا پانی پلا۔''

اب اُس بوند سے بھینٹ نہیں ہوگی

اگر معمولی بات بھی بگڑ جائے تو اس کا سنوارنا مشکل ہوتا ہے۔اس کہاوت سے متعلق جو حکایت بیان کی جاتی ہے۔وہ یہ ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک عطار عطر فروخت کرنے کی غرض سے ایک رئیس کے یہاں گیا۔عطر دکھاتے وقت عطر کی ایک بوند زمین پر گر گئی۔رئیس نے اس بوند کو انگلی سے پونچھ کر اپنے کپڑوں پر لگا لیا۔یہ دیکھ کر عطار طنزاً مسکرا دیا۔رئیس کو اس کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی۔اس نے طیش میں آکر عطار کا تمام عطر خرید لیا اور اس کے سامنے ہی عطر کو زمین پر پھینکوا دیا۔عطار نے یہ دیکھ کر طنز بھرے لہجے میں کہا:

''حضور! کچھ بھی کیجیے، اب اُس بوند سے بھینٹ نہیں ہوگی۔''

اب بہو سے بھیک نہیں دلائیں گے

جب کوئی شخص اپنے فائدے کے لیے کنجوسی کرے اور اسے نقصان اٹھانا پڑے، تو کہتے ہیں۔اس کہاوت کے پس منظر میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک کنجوس بوڑھا آدمی اپنے دروازہ پر آنے والے ہر بھکاری کو اپنی بیوی کے ہاتھ سے ایک مٹھی اناج دلایا کرتا تھا۔کچھ دنوں کے بعد اس کے بیٹے کی شادی ایک خوبصورت لڑکی سے ہوگئی۔کنجوس بوڑھے نے سوچا کہ بیوی کے بجائے اگر وہ اپنی بہو کے حسین اور چھوٹے ہاتھوں سے بھکاریوں کو بھیک دلائے تو اناج کم خرچ ہوگا۔اس نے ایسا ہی کیا اور اپنی بہو کے ہاتھوں سے بھیک دلوانے لگا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بھکاریوں کو اناج تو کم ملنے لگا مگر بھیک لینے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔بہو کی خوبصورتی کے چرچے کے سبب اب وہ لوگ بھی بھیک لینے کے لیے آنے لگے تھے جو بھکاری نہیں تھے۔اس لیے پہلے کی بہ نسبت اب اناج زیادہ خرچ ہونے لگا۔

ابھی دلّی دور ہے

یہ تلمیحی ضرب المثل ایسے موقعوں پر بولتے ہیں جب حصول مطلب میں کافی دیر ہو یا بہت سا کام باقی رہ گیا ہو یعنی منزلِ مقصود ابھی دور ہے۔

اس تلمیحی ضرب المثل کی نسبت تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق گو بہ ظاہر سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی سے کچھ کہتا سنتا نہ تھا مگر بباطن از حد پرخاش وعداوت رکھتا تھا۔ چنانچہ جس وقت وہ بنگال سے واپس ہوا تو اس نے ایک قاصد کے ذریعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے حضور میں پیغام بھجوایا کہ آپ میرے پہنچنے سے قبل دہلی خالی کر دیں اور اپنے مسکن غیاث پور سے بھی ہاتھ اٹھائیں۔ چوں کہ حضرت محبوب الٰہی ایک دوسرے ہی عالم میں بیٹھے تھے۔ آپ کو یہ پیغام نہایت ناگوار گزرا۔ آپ نے پیغام کے جواب میں صرف اتنا فرمایا:

''بابا ہنوز دلّی دور است''

یعنی ابھی دلّی دور ہے۔ مقصد یہ کہ ابھی وہ پہنچ جائے، جب ہی یہ منصوبے ظاہر کرے۔ مرضی مولا کی کس کو خبر ہے؟ اگرچہ پہلے آپ خود کئی مرتبہ اس جگہ کو چھوڑ چکے تھے مگر اب کی دفعہ مطلق ارادہ نہیں کیا۔ چنانچہ خود بادشاہ ہی کو دہلی کے قریب پہنچ کر اپنے شہر میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ قصر تغلق کے نیچے جو اس کے بیٹے نے افغان پور میں اپنے باپ کے ٹھہرنے کے واسطے تعمیر کروایا تھا، دب کر مر گیا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس روایت کو دوسرے طریقہ سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ غیاث الدین تغلق کا لڑکا جونا خان اُپنے باپ کی مرضی کے خلاف اکثر حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور ارادت مندوں میں سے تھا۔ ایک روز حالت وجد میں حضرتِ محبوب الٰہی نے جونا خان نے فرمایا:

''جاؤ ہم نے تجھے سلطنت بخشی۔''

یہ خبر جب غیاث الدین کے کانوں میں پہنچی تو اس نے بنگال سے پیغام بھیجا کہ:

''یا شیخ آنجا باشد یا من۔''

اس پیغام کو سن کر حضرت نے فرمایا کہ:

''ہنوز دلّی دور است''

یعنی ابھی دلّی دور ہے۔ چنانچہ جب بادشاہ بنگال سے واپس آیا تو دہلی کے قریب اس قصر تغلق کے

نیچے دب کر ہلاک ہو گیا جو اس کے بیٹے نے افغان پور میں اپنے باپ کے قیام کے لیے بنوایا تھا۔

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جہانگیر نے ایک مرتبہ نور جہاں کے پاس قاصدِ صبار فتار کو بھیجا تھا۔ قاصد نے دعویٰ کیا تھا کہ میں ایک ہی روز میں لاہور سے دہلی پہنچ جاؤں گا اور دوسرے دن جواب لاکر آپ کے حضور میں پیش کردوں گا۔ جب وہ شام کے وقت دہلی کے قریب پہنچا تو اس نے ایک بڑھیا سے پوچھا:

''مائی! یہاں سے دلّی کتنی دور ہے''۔

بڑھیا نے جواب دیا:

''نوج دلّی دور''

عورتوں کی زبان میں ''نوج'' کے معنی مبادا یعنی خدا نہ کرے، کے ہیں۔ قاصد بے چارہ یہ سمجھا کہ اس نے ''ہنوز دلّی دور'' کہا ہے۔ وہ بہت گھبرا گیا اور پریشانی کے عالم میں چکر کھا کر گر پڑا۔ اسی وقت اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جہانگیر نے جب یہ واقعہ سنا تو اس کو بہت افسوس ہوا اور اس نے قاصد کی ایک عالیشان قبر بنوادی جو دہلی سے پانچ کوس پر تھی۔

اپنا اُلّو تو کہیں نہیں گیا

ہمارا مطلب ہر حال میں نکل ہی آئے گا۔ یہ کہاوت مطلب پرست شخص کے لیے بھی کہی جاتی ہے۔ کبھی مات نہ کھانے والا شخص جب ایسی حالت میں ہو کہ سبھی لوگ یہ سمجھیں کہ اب اس کی مات ہو جائے گی مگر واقعی ایسا نہ ہو تو شیخی بگھارتے ہوئے وہ شخص اس کہاوت کا استعمال کرتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی راجا کے یہاں گھوڑوں کا ایک سوداگر آیا۔ راجا نے اسے ایک لاکھ روپے دے دیے کہ ہمارے لیے عرب سے بہترین قسم کے گھوڑے لے آنا۔ سوداگر روپے لے کر چلا گیا۔ اس راجا کے شہر میں ایک تاریخ نویس بھی تھا۔ اس نے تاریخ میں لکھا ''راجا اُلو ہے''۔ راجا کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے تاریخ نویس کو بلا کر پوچھا:

''تم نے اپنی تاریخ کی کتاب میں ''راجا اُلو ہے'' کیوں لکھا؟''

تاریخ نویس نے جواب دیا:

''یوں ہی کسی ناواقف آدمی کو گھوڑے خریدنے کے لیے پیشگی ایک لاکھ روپے دے دینا

کہاں کی عقل مندی ہے۔ یہ الو پن نہیں تو کیا ہے؟ سوداگر خبطی تو نہیں ہے کہ ایک لاکھ کی رقم گھر بیٹھ کر نہ کھائے اور آپ کو گھوڑے لا کر دے۔"

راجا نے کہا:

"اگر سوداگر گھوڑے لے آیا تو؟"

مؤرخ نے برجستہ جواب دیا:

"پھر آپ کا نام کاٹ کر سوداگر کا نام لکھ دوں گا۔"

لہٰذا اپنا الو تو کہیں نہیں گیا وہ تو اپنی جگہ ہی رہا۔

اپنی ٹیک بھنجائی، بالم کی مونچھ کٹائی

اپنی ہٹ کو پورا کرنے کے لیے اپنا ہی نقصان کرنے والوں یا اپنی ضد کے آگے اپنی ہی بے عزتی کرانے والوں کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں یہ دلچسپ کہانی ہے:

کہانی: ایک مرتبہ ایک گاؤں میں شوہر اور بیوی کے درمیان بحث ہونے لگی کہ عورت اور مرد میں زیادہ عقل مند اور چالاک کون ہوتا ہے۔ بیوی عورتوں کو عقل مند اور چالاک کہتی تھی جب کہ شوہر مردوں کی حمایت کر رہا تھا۔ جب بحث و مباحثہ سے اس کا کوئی حل نہیں نکلا تو ایک دن بیماری کا بہانہ بنا کر عورت چارپائی پر لیٹ گئی۔ تمام علاج کروایا گیا مگر سب بے سود۔ فائدہ تو جب ہوتا اگر اسے کوئی بیماری ہوتی۔ شوہر بہت فکر مند ہوا تو ایک دن اس کی بیوی نے اس سے کہا:

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ جب تک آپ اپنی مونچھ نہیں کٹوائیں گے۔ میں اچھی نہیں ہوں گی۔ اگر تم مجھے چاہتے ہو تو اپنی مونچھ کٹوا دو۔ مونچھ کٹواتے ہی میں صحت یاب ہو جاؤں گی۔"

لہٰذا ناچار شوہر نے اپنی مونچھ کٹوا دی۔ مونچھ کٹواتے ہی عورت چارپائی سے اٹھ کر گانے لگی۔ اپنی ٹیک بھنجائی، بالم کی مونچھ کٹائی۔ شوہر بے چارہ یہ سن کر سمجھ گیا کہ اس نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ عورتوں کو عقل مند اور مردوں کو بدھو یا احمق ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ اب شوہر کو بھی تاؤ آیا اور اس نے ایک تدبیر سوچی۔ وہ فوراً اپنے سسرال پہنچا۔ داماد کو اچانک آتا دیکھ کر اس کی ساس گھبرا گئی اور داماد سے خیریت پوچھی۔ داماد نے افسردہ ہو کر کہا:

''آپ کی لڑکی قریب المرگ ہے۔ اگر آپ اس کی زندگی چاہتے ہیں تو مجھے ایک ہوشیار نے بتایا ہے کہ اس کے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ گھر کے تمام افراد اپنے اپنے سر مُنڈا کر گدھے پر سوار ہو کر میرے ساتھ اپنی بیٹی کے پاس چلیں۔''

ماں کو جس درجہ اپنی بیٹی سے محبت ہوتی ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دوسری چیز سے ہو۔ وہ فوراً تیار ہوگئی اور گھر کے ہر فرد کو ایسا کرنے کے لیے راضی کرلیا۔ جس وقت سب لوگ سر منڈائے ہوئے گدھے پر سوار اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچے۔ اس وقت اس کی بیوی چکّی پیستی ہوئی لہرا لہرا کر گا رہی تھی:

''ایسی ٹیک بھنجائی، بالم کی مونچھ کٹائی''

تبھی شوہر نے اس میں یہ ٹکرا جوڑا:

''دیکھ ری لگائی، جا مُنڈی پلٹن آئی''

بیوی نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو نہایت نادم اور شرمندہ ہوئی۔

اپنی ڈاڑھی سب پہلے بجھاتے ہیں

اگر کئی لوگوں کی ڈاڑھی میں ایک ساتھ آگ لگ جائے تو ہر شخص پہلے اپنی ڈاڑھی کی آگ بجھائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنا فائدہ پہلے دیکھتا ہے یا پہلے اپنے اوپر آئی ہوئی مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کے بعد دوسرے کی۔ اس کہاوت سے متعلق ایک پُرلطف چٹکلہ ہے:

چٹکلہ: ایک مرتبہ اکبر بادشاہ اور بیربل آپس میں بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ اچانک اکبر نے بیربل سے پوچھا:

''اگر ہم دونوں کی ڈاڑھی میں ایک ساتھ آگ لگ جائے تو تم کس کی ڈاڑھی کی آگ پہلے بجھاؤ گے؟''

بیربل نے فوراً جواب دیا: ''جہاں پناہ! اپنی ڈاڑھی سب پہلے بجھاتے ہیں۔''

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی

جب ہر شخص علیٰحدہ علیٰحدہ ہو کر اپنا کام کرے یا ہر شخص کی رائے الگ الگ ہو تو یہ مثل بولتے ہیں۔ اس مثل کے پس منظر میں کہا جاتا ہے کہ دہلی میں چھوٹی چھوٹی ہزاروں مسجدیں ان پٹھانوں اور مغلوں کی

بنوائی ہوئی ہیں جن کی کبھی ہندوستان پر حکومت تھی۔ پٹھان اور مغل عام طور پر تند مزاج ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کا احسان لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ دوسروں کی بنوائی ہوئی مسجدوں میں نماز پڑھنا بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان لوگوں میں سے متمول اشخاص نے نماز پڑھنے کے لیے علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی مسجدیں بنوائی تھیں۔ یہ مسجدیں بعض بعض مقامات پر تو بالکل پاس پاس ہی بنی ہوئی ہیں۔ انہیں مسجدوں کو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کہتے ہیں۔ الگ الگ اور چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں نماز پڑھنے اور اپنی رائے الگ رکھنے والوں کے لیے کہتے ہیں:

''اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی''

اپنی گئی کا دُکھ نہیں، جیٹھ کی رہی کا دُکھ ہے

ایسے بداندیش شخص کے لیے کہتے ہیں جنہیں اپنے نقصان کی اتنی پروا نہیں ہوتی جتنی دوسروں کو نقصان پہنچانے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کسی عورت کی ایک گائے کھو گئی۔ جب کہ اس کے جیٹھ یعنی شوہر کے بڑے بھائی کی تمام گائیں محفوظ تھیں۔ جب لوگ اس کی گائے کھو جانے کیلئے افسوس کرتے اور اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تو وہ کہتی تھی:

''مجھے اپنی گائے کھو جانے کی اتنی فکر نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے جیٹھ کی ایک بھی گائے کیوں نہیں کھو گئی، اس کی تمام گائیں کیوں اب تک محفوظ ہیں؟''

اپنی موت اپنے ہاتھوں بُلائی

اپنا نقصان آپ کیا۔ خود ہی اپنے جال میں پھنسے۔ خود ہی موت یا مصیبت کو دعوت دی۔ جب کوئی شخص ایسا کام کرتا ہے کہ وہ کام اسی کے لیے مصیبت یا پریشانی کا باعث بن جاتا ہے تب یہ ضرب المثل کہتے ہیں۔ دراصل عربی میں ایک ضرب المثل ہے جس کا ماخذ یہ حکایت ہے:

حکایت: ایک شکاری نے نیل گائے کو اپنے جال میں پھانس لیا مگر ذبح کرنے کے لیے اس کے پاس چھری نہ تھی۔ نیل گائے نے اپنے کھروں یعنی سُم سے، جال میں پھنسی ہوئی حالت اور گھبراہٹ میں زمین کھودنا شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں کھودی گئی زمین میں ناگاہ ایک چھری نظر آئی۔ شکاری نے اس

چھری کو فوراً اٹھالیا اور نیل گائے کو ذبح کر دیا۔ اس طرح اپنے کھروں سے گھبراہٹ میں زمین کھود کر نیل گائے نے اپنی موت اپنے ہاتھوں بلائی۔

اترا شحنہ، مردک نام

جب کوئی ظالم افسر معزول کر دیا جائے یا کسی حاکم کا اقتدار ختم ہو جائے یا پھر کسی ظالم و جابر کو اپنے ظلم کی سزا بھگتنا پڑے تو یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے تعلق سے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہتے ہیں کہ کسی جگہ ایک کوتوال نہایت ظالم و جابر تھا۔ اس کے ظلم سے ہر شخص خوف زدہ رہتا تھا۔ جب اس کے ظلم و ستم حد سے تجاوز کر گئے تو وہ معزول کر دیا گیا۔ اپنی برطرفی کے بعد جب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں ان لوگوں نے اسے خوب زدوکوب کیا اور اس کا سارا مال و اسباب بھی لوٹ لیا جن پر وہ ظلم و جبر کیا کرتا تھا۔ جس وقت معزول کوتوال پٹ رہا تھا اور اس کی اگلی پچھلی ساری کسر نکالی جا رہی تھی اسی وقت کسی ظریف نے کہا: ''اترا شحنہ، مَردَک نام''۔ جواب ضرب المثل بن گیا ہے۔

ادھار کھائے بیٹھے ہیں

جانی دشمن ہے۔ کسی ایک کے ساتھ مستقل دشمنی کرنے کے محل پر بولتے ہیں۔ اس کے پس منظر میں بیان کیا جاتا ہے کہ:

پس منظر: ہندوستان میں بہت پرانا قاعدہ یہ تھا کہ ہندو راجاؤں میں جب کوئی راجا مر جاتا تو اس کا تمام لباس اور سامان و اسباب وغیرہ جو اس کے روزانہ استعمال میں رہا کرتا تھا اس کے عزیز وہ کل سامان و اسباب کسی برہمن کو دے دیا کرتے تھے اور برہمن اسی وعدے پر قرض لیا کرتے تھے کہ بھائی جب کوئی راجا مرے گا تو ہم اس وقت تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔ اس برہمن کو مستقل فکر رہتی تھی کہ راجا جلد مر جائے تو میرا قرض ادا ہو۔ اسی لیے یہ اصطلاح ضرب المثل بن گئی کہ فلاں انسان فلاں انسان پر ادھار کھائے بیٹھا ہے یعنی اس کا جانی دشمن ہے۔

اڑھائی دن کی بادشاہت

دیکھیے: اڑھائی دن کی سقہ نے بھی بادشاہت کی ہے

اڑھائی دن کی سقہ نے بھی بادشاہت کی ہے

کنایتاً چند روز کے لیے دولت میسر ہونے، چندروزہ حکومت یا ناپائیدار خوشی کو ظاہر کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص اتفاقاً چند روز کیلئے کسی اعلیٰ عہدہ پر پہنچ جائے اور سب پر اپنا رعب جمائے تو بھی اس مثل کو کہتے ہیں۔

یہ تلمیحی مثل نظام نامی سقے کی ڈھائی روزہ بادشاہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب ہمایوں بادشاہ شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر فرار ہوا تو اسے اپنی جان بچانے کیلئے دریا میں گھوڑا ڈالنا پڑا تھا۔ نظام نامی سقہ نے ہمایوں بادشاہ کو دریا میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے اپنی مشک کا سہارا دے کر اس کی جان بچائی تھی۔ ہمایوں نے اس کے صلہ میں اس سے کچھ مانگنے کو کہا تو نظام سقہ نے جواب دیا:

''حضور میری دیرینہ خواہش ہے کہ چند روز کے لیے میں بھی بادشاہ بنوں۔''

کچھ دنوں کے بعد ہمایوں بادشاہ نے اسے اڑھائی دن کی سلطنت بخش دی۔ اس اڑھائی روزہ حکومت میں نظام سقہ نے اپنی مشک کے چمڑے کا سکہ چلایا تھا جس میں ڈھائی روپے کی قیمت کی سونے کی کیل لگی ہوئی تھی۔ اس مثل کو کنایتاً ایسی حکومت کے لیے بھی بولتے ہیں جس میں بدنظمی ہو اور بدعنوانیوں کی وجہ سے اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز نہ ہو۔

اس برتے پر تتّا پانی

دیکھیے: کس برتے پر تتّا پانی۔

اسپغول ٹھنڈا بھی گرم بھی

جب کوئی شخص تھوڑی دیر میں اپنی رائے بدلے اور کسی ایک اصول پر کاربند نہ رہے تو یہ مثل کہتے ہیں۔ ڈِھلمِل یقین یا دوسرے کی ہاں میں ہاں ملانے والے شخص پر اس کہاوت کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس مثل کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی کہاوت ہے:

کہاوت: ایک شخص نے ایک مریض کو مشورہ دیا کہ:

''اسے گرم دوا کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس کے لیے اسپغول مفید ہوگا۔ کیوں کہ اسپغول

گرم ہوتا ہے۔"

مریض نے جب صلاح کار سے کہا کہ اسپغول تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ صلاح کار اپنی رائے بدلتے ہوئے فوراً کہا:

"ہاں ٹھنڈا بھی ہوتا ہے۔"

مریض نے کہا:

"ابھی تو آپ اسے گرم کہہ رہے تھے اور اب ٹھنڈا کہنے لگے۔"

صلاح کار نے کہا:

"دونوں ہے یعنی اسپغول ٹھنڈا بھی ہے اور گرم بھی۔"

اس دن کی باتیں میں کہہ دوں گی

دوسرے کے اوپر کہی گئی بات کو یا عام بات کو اپنے اوپر کہی گئی بات سمجھنا اور اس سے ڈر کر اپنے راز کو افشا کر دینے والے کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک بار ایک رئیس آدمی اپنے کسی دوست کی بارات میں گیا۔ اسی بارات میں ایک طوائف بھی ناچنے کی غرض سے گئی تھی۔ رئیس رفعِ حاجت کے لیے ایک بیر کے درخت کی اوٹ میں گئے۔ بیر کے درخت میں پھل لگے ہوئے تھے۔ پھل دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے ایک بیر توڑ کر کھالیا۔ اسی درمیان وہاں سے وہ طوائف گزری۔ رئیس نے سمجھا کہ اس نے انہیں پاخانہ کرتے اور بیر کھاتے ہوئے دیکھ لیا ہے اگر چہ وہ دیکھ نہیں سکی تھی۔

دوسرے روز جب رقص کی محفل میں طوائف نے ناچتے ہوئے یہ گانا گایا کہ:

"راجا، اس دن کی باتیں کہہ دوں گی"

رئیس نے سمجھا کہ اس گانے کے ذریعہ وہ پاخانہ کرتے وقت بیر کھانے کے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ انہوں نے اس کا منہ بند کرنے کے لیے بہ طور رشوت پانچ روپے کا نوٹ نذر کیا۔ طوائف نے سمجھا کہ رئیس کو اس گانے کے یہ بول بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے انعام دے کر عزت افزائی کی ہے۔ لہٰذا اب طوائف نے خاص طور پر رئیس کی طرف مخاطب ہو کر بار بار یہی بول دہرانے

لگی۔ رئیس نے چار پانچ بار اس کو دس دس پانچ پانچ روپے دیے کہ شاید اب یہ اپنی زبان بند کر لے مگر ایسا نہیں ہوا۔ طوائف اور شدت سے انہی بول کو دہرانے لگی۔ آخر کار رئیس پریشان اور گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بھری محفل میں طوائف سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

''تو کیا بتائے گی، میں خود بتاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے سب کے سامنے پاخانہ کرتے وقت بیر کھانے کا واقعہ بیان کر کے اپنے راز کو کھول کر رکھ دیا۔

اسلام قُلی پانڈے

آدھا ہندو آدھا مسلمان۔ آدھا اس مذہب کا آدھا اس مذہب کا۔ جو ہندو ہو کر مسلمان یا عیسائیوں جیسے لباس پہنے یا مسلمان ہو کر عیسائیوں یا ہندوؤں جیسے کپڑے پہنے یا کچھ ہندوؤں اور کچھ مسلمانوں کے مذہبی نشانات اختیار کرے، ان کے لیے طنز سے کہتے ہیں۔ اس سے متعلق ایک چھوٹی سے حکایت ہے۔ جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک مسلمان فقیر نے دیکھا کہ برہمنوں کا بھوج ہے۔ برہمنوں کو کھانے کے لیے پوڑیاں مل رہی ہیں۔ اس کا دل للچانے لگا مگر مشکل یہ تھی کہ یہ پوریاں صرف برہمنوں ہی کے لیے تھیں۔ کسی غیر برہمن یا دوسرے مذاہب والوں کیلئے نہیں تھیں۔ اس نے سوچا اگر میں برہمن کا بھیس بنالوں تو یہ پوریاں مجھے بھی مل جائیں گی۔ اس نے برہمنوں کی طرح دھوتی پہنی، تِلک یعنی قشقہ لگایا، زنار یعنی جینو پہنا اور بغل میں پوتھی داب کر برہمنوں کے بھوج میں پہنچ گیا اور پوریاں بانٹنے والوں سے کہنے لگا:

''دھوتی ببیں، پوتھی ببیں، درگلو زنار، اسلام قلی، پانڈے منم پوریاں دیار''

یعنی میں نے دھوتی پہن لی ہے،، پوتھی لے لی ہے، گلے میں جینو بھی ڈال لیا ہے۔ اسلام سے منحرف ہو کر میں پانڈے ہو گیا ہوں، اب میرے لیے پوریاں لائیے۔

اکیلے دُکیلے کا اللہ بیلی

تنہا آدمی کا اللہ ہی مددگار ہے۔ یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کسی کام کو کوئی تنہا شخص کرے اور اس کا کوئی مددگار نہ ہو۔ یا پھر اکیلا شخص ایسا کام کرے جس میں خطرہ ہو۔ اس کہاوت سے متعلق

ایک بڑھیا کی دلچسپ حکایت ہے جو یہ ہے:

حکایت: دہلی کے دس میل کے فاصلے پر ایک نالہ تھا جہاں درختوں کے جھنڈ بہ کثرت تھے۔ ایک بڑھیا اس جگہ بیٹھ کر بھیک مانگا کرتی تھی اور اس کے بیٹے پوتے ان درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ جاتے تھے۔ جب ایک دو آدمیوں کا وہاں سے گزر ہوتا تھا تو وہ بڑھیا پکار کر کہتی تھی:

''اکیلے دُکیلے کا اللہ بیلی''

بڑھیا کے یہ جملے سن کر اس کے بیٹے پوتے سمجھ جاتے تھے کہ کوئی تنہا شخص گزر رہا ہے یا اس کے ساتھ دو ایک لوگ ہوں گے۔ لہٰذا وہ لوگ فوراً گھات سے نکل کر اس شخص کے مال و اسباب کو لوٹ لیا کرتے تھے اور اگر وہ مقابلہ کرتا تو اسے مار ڈالتے۔ اس کے برعکس جب چند آدمی مل کر وہاں سے گزرتے تو وہ ٹھگوں کی نانی آواز لگاتی:

''جماعت سے کراہت ہے'' یا ''جمعہ جماعت کی خیر''

اس وقت وہ راہزن اپنی گھات سے باہر نکلنے سے باز رہتے، کیوں کہ بڑھیا کے ان جملوں سے وہ سمجھ جاتے تھے کہ ایک ساتھ کئی آدمی گزر رہے ہیں۔ مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا اور لوٹ مار ہوتی رہی۔ آخر کار جب وہ بڑھیا اور اس کے بیٹے پوتے ایک روز پکڑے گئے تو ان صداؤں کا بھید کھلا۔ کچھ دنوں کے بعد اس بڑھیا نے اس نالے پر ایک پل بنوایا جو فرید آباد کے نزدیک بڑھیا کے پل کے نام سے مشہور ہے۔

اگاڑی تمہاری، پچھاڑی ہماری

آگے کا حصہ تمہارا اور پیچھے کا حصہ ہمارا۔ ایسے مطلبی اور چالاک شخص کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے جو فائدے کی چیز تو خود لینا چاہے اور بے کار یا خسارے کی چیز دوسرے کو دینا چاہے یا دے دے۔ ایسا شخص جو نفع بخش چیز سے خود فائدہ حاصل کرے اور گھاٹے والی چیز دوسرے کے حوالے کرے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: دو بھائیوں نے شراکت میں ایک بھینس خریدی۔ ان میں سے ایک بھائی نہایت چالاک اور ہوشیار تھا۔ اس نے دوسرے بھائی سے کہا:

''بہتر ہوگا اگر ہم دونوں بھائی اس بھینس کو آدھا آدھا بانٹ لیں۔ ایسا کرنے سے ہم لوگوں کے درمیان کبھی جھگڑے کی نوبت نہیں آئے گی۔ بھینس کا اگلا حصہ تم لے لو اور

پچھلا حصہ مجھے دے دو یعنی بھینس کی اگاڑی تمہاری، پچھاڑی ہماری۔"

دوسرا بھائی جو سیدھا تھا اس نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔اب روزانہ کا معمول ہوگیا کہ سیدھا والا بھائی بھینس کو کھلاتا پلاتا اور ہوشیار بھائی بھینس کے پچھلے حصہ سے دودھ دوہتا رہتا اور مزے اڑاتا۔

الٹا چور بیکنٹھ جائے

جب کسی مجرم یا قصوروار شخص کو عزت واحترام ملے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔اس کہاوت سے متعلق یہ حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک چور چوری کرنے کے ارادے سے ایک مکان میں گھس گیا۔وہاں ایک عورت کو اکیلا پاکر اس نے گھر کا تمام سامان اپنے قبضہ میں کرلیا۔یہاں تک کہ عورت کے تمام زیورات بھی اتار کر لوٹ لئے۔اب عورت کی ایک انگلی میں صرف ایک چھلا رہ گیا تھا۔چور نے جب عورت سے اس چھلے کو بھی اتار کردینے کیلئے کہا تو عورت نہایت عاجزی سے بولی:

"تو نے میرے گھر کا تمام مال واسباب اور میرے تمام زیورات لوٹ کر اپنے قبضہ میں کرلئے ہیں اگر ایک چھلا نہ لے گا تو تیرا کیا بگڑ جائے گا؟"

چور نے جواب دیا:

"میں اس چھلے کو بیچ دوں گا اور اس سے جو روپے حاصل ہوں گے اس سے چار سادھوؤں کو بھوجن کراؤں گا۔"

چور کی اس بات کو سن کر وِشنو بھگوان نازل ہوگئے اور خوش ہوکر اس چور کو مع جسم بیکنٹھ یعنی جنت لے گئے۔

الٹا نام جپت جگ جانا، بالمیکی بھئے برہم سمانا

رام کا نام چاہے جس روپ میں لیا جائے باعثِ نجات ہوگا۔یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص صدق دل سے خدا کو یاد کرے یا اس کی عبادت کرے مگر عبادت وریاضت کا ظاہری طریقہ اسے معلوم نہ ہو۔اس کہاوت کا تعلق ایک تلمیحی واقعہ سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

واقعہ: بالمیکی منی کا شمار سنسکرت کے مشہور قدیم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ان کا جنم بھرگ خاندان

میں ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نہایت خونخوار اور ظالم ڈاکو تھے۔ یہ جنگلوں میں رہزنی کیا کرتے تھے۔ مسافروں کے مال واسباب کو لوٹنا اور انہیں قتل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایک مرتبہ چند سادھو جنگل سے گزر رہے تھے کہ بالمیکی نے ان کا مال واسباب لوٹ کر اپنے قبضہ میں کرلیا۔ کسی سادھو نے بالمیکی سے کہا:

''اب تک تم نے نہ جانے کتنے مسافروں کا قتل کیا ہے، نہ جانے کتنے راہ گیروں کا مال واسباب لوٹا ہے اور اسی لوٹ کے مال سے اپنے خاندان کی پرورش کررہے ہو۔ کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تمہارے گناہوں کی سزا میں تمہارے خاندان والے تمہارا ساتھ دیں گے؟ کیا تمہارے ساتھ نرک یعنی دوزخ میں جائیں گے؟ یعنی جن کے لیے تم بے گناہوں کا قتل کررہے ہو، مصیبت پڑنے پر وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔''

بالمیکی نے سادھو کی نصیحت کا اثر قبول کیا، اس نے سادھو سے کہا:

''مہاراج! تو پھر میں کیا کروں کہ مجھ پاپی کی بخشش ہوجائے۔''

سادھو نے کہا:

''قتل وغارت گری اور لوٹ سے باز آؤ، توبہ کرو اور رام نام کا جاپ کرو۔''

سادھوؤں کے جانے کے بعد وہ رام کے نام کا جاپ کرنے لگا مگر رام کے بجائے ''مرا، مرا'' کہنے لگا تو ''رام'' کا الٹا ہے۔ اسی رام کے الٹے نام یعنی ''مرا، مرا'' کو جپتے جپتے بالمیکی بزرگ کامل ہوگئے۔ رامائن انہیں کا نتیجۂ فکر ہے۔ رامائن کی مقبولیت اور ان کی بزرگی کے سبب اس کہاوت کا وجود ہوا کہ ''الٹا نام جپت جگ جانا، بالمیکی بھئے برہم سمانا۔''

ان تلوں میں تیل نہیں

یہاں مطلب حاصل نہ ہوگا۔ نہایت خسیس، بخیل اور بے فیض شخص کے لیے یہ مثل کہی جاتی ہے۔

اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ہندوستان میں جمہوری نظام سے پہلے زمیندار اور مہاجن دونوں کسانوں کا استحصال کرتے تھے اور لوٹ کھسوٹ کے کردار تھے۔ زمیندار کی زندگی میں ساری رونق کسانوں کی محنت سے تھی اور مہاجن کے مزے زمیندار اور کسانوں کی وجہ سے تھے۔

ایک مرتبہ ایک گاؤں کے زمیندار نے اپنے بیٹے جسے کنور صاحب کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا، کو قریب کے ایک گاؤں میں اپنے مہاجن کے پاس پانچ سو روپے قرض لینے کے لیے بھیجا۔ مہاجن نے کنور صاحب کی خوب خاطر و مدارت کی اور پانچ سو کی رقم اُس کے حوالے کر دی۔ رقم لے کر وہ اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ اسے راستے میں گھونگٹ کاڑھے ہوئے ایک جوان عورت نظر آئی جو اپنے سر پر رکھے ہوئے پیتل کے کٹوردان کو اپنے ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے تھی اور ایک ہاتھ میں چمکتی ہوئی پیتل کی لٹیا لیے تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو کھیت پر کھانا دینے جا رہی تھی۔ کنور اس کے پیچھے لگ گیا۔ آہٹ پا کر عورت نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ کنور اس عورت کے قریب آ کر گانے کے لہجے میں کہنے لگا:

"جو سندر مکھڑا دکھاوے، پانچ سو کی تھیلی پاوے"

عورت کے دل میں لالچ پیدا ہوا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اب اس کا کھیت تھوڑی دور رہ گیا تھا۔ اس نے گھونگٹ پلٹ دیا اور کنور کی پانچ سو کی تھیلی اپنے قبضہ میں کر کے تیزی سے اپنے کھیت کی طرف چل دی۔ اس کے پیچھے کنور بھی چلتا رہا۔ جب کنور کھیت کی مینڈھ کے قریب پہنچا تو اس کی نظر ایک تنومند جوان کسان پر پڑی جو اس عورت کا شوہر تھا۔ کنور ٹھٹک کر رک گیا اور معاملہ کی نزاکت کو محسوس کر کے الٹے پاؤں لوٹ پڑا۔ بغیر رقم کے گھر جانا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا وہ کچھ سوچ کر پھر مہاجن کے پاس پہنچا اور دوبارہ پانچ سو روپے اس سے طلب کیے۔ مہاجن نے اس کے انداز اور اس کی وحشت سے بھانپ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ صاف صاف بیان کرو۔ کنور نے مہاجن سے سب حال کہہ سنایا۔ مہاجن نے کہا تم میرے ساتھ اسی کھیت تک چلو۔ میں تم کو سارے روپے دلا دوں گا۔ مہاجن نے کنور کو ساتھ لیا اور دوسری طرف سے بیچ کھیت میں داخل ہو گیا۔ وہ کھیت تِلوں کا تھا۔ کسان کھیت میں کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی بیوی پاس بیٹھی تھی۔
مہاجن ان دونوں کی طرف بڑھتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا:

"ان تلوں میں تیل نہیں۔ ان تلوں میں تیل نہیں"

کسان اور اس کی بیوی نے مہاجن کی جب یہ بات سنی تو کسان مہاجن سے مخاطب ہو کر بولا:

"حضور کیا آج زمیندار صاحب کے بیٹے کنور صاحب کو کھیت کی جنس دلانے آئے ہیں؟
فصل تو اچھی ہے۔ کیا کنور صاحب خریدنے کے لیے تیار ہیں۔"

عورت کسان اور زمیندار کی باتوں کو سن رہی تھی۔ اسے شک ہوا کہ زمیندار کے بیٹے نے مہاجن سے ساری بات بتا دی ہے اور اب مہاجن کسان یعنی اس کے شوہر سے اس کی شکایت کرنے آیا ہے۔
عورت مسکرا کر بولی:

''میں نے زمیندار کے بیٹے کو اب سے کچھ دیر پہلے راستے میں ہی کھیت کی جنس بیچ دی ہے اور پانچ سو روپے پیشگی بھی لے لیے ہیں جو میرے پاس ہیں۔''

مہاجن نے اب اور قریب آ کر سنانے کے لیے زور زور سے کہنا شروع کر دیا:

''ان تلوں میں تیل نہیں، ان تلوں میں تیل نہیں۔ نقصان ہوگا اور رقم ڈوب جائے گی۔''

کسان کو اپنی فصل کی برائی نہایت نا گوار ہوئی۔ وہ جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا اور مہاجن سے کہنے لگا:

''ساہوکار جی کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ اگر ان تلوں میں تیل نہیں، تو کیا ہوا ہم نے آپ کی رقم ہڑپ کر لی ہے یا بے ایمانی کر جائیں گے۔ یہ دھری ہے ساری رقم، میں زبردستی اپنی فصل کیوں بیچنے لگا۔ یہ تو عورت کی نا سمجھی تھی، جو کنور صاحب سے میری غیر موجودگی اور بنا مجھ سے بتائے راستے میں سودا کر لیا۔ یہ لیجئے، اٹھائیے اپنی رقم۔''

مہاجن نے روپیوں سے بھری تھیلی اٹھا کر اپنے قبضہ میں کی اور کنور کو دے کر اس کے گھر روانہ کیا۔ عورت مسکراتی رہی اور کسان فخر سے اپنی فصل کو دیکھتا رہا۔

اندھوں نے ہاتھی چھوا، سب نے الگ الگ کہا

جب کوئی شخص یا کئی اشخاص کسی چیز کے بارے میں پوری معلومات نہ رکھیں اور اس کے متعلق نامکمل، ادھوری یا غلط بات کہیں تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک کہانی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: ایک مرتبہ کئی پیدائشی اندھوں نے ہاتھی کے متعلق جاننا چاہا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ چوں کہ انہوں نے کبھی ہاتھی کو دیکھا نہیں تھا۔ اس لیے ان کے قریب ایک ہاتھی لایا گیا تاکہ وہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر اس کی ہیئت کا اندازہ کر سکیں۔ اب اندھوں نے ہاتھی کو اپنے اپنے ہاتھوں سے چھونا شروع کیا۔ جس اندھے نے ہاتھی کا جو حصہ چھوا اس نے اس کی ہیئت کو ویسا ہی سمجھا۔ جس نے ہاتھی کی دم کو چھوا، اس نے سمجھا ہاتھی رسی جیسا ہوتا ہے۔ جس نے ہاتھی کی ٹانگ پکڑی اس نے سمجھا ہاتھی کھمبے کی طرح ہوتا ہے۔ ایک اندھے نے ہاتھی کا کان چُھوا تو وہ سمجھا ہاتھی سوپ جیسا ہوتا ہے۔ ایک اندھے نے ہاتھی کی سونڈ پکڑی تو گمان کیا کہ ہاتھی اجگر یا موٹے سانپ کی طرح ہوتا ہے۔ ایک اندھے نے ہاتھی کا دانت پکڑا تو سمجھا ہاتھی ہڈی یا پتھر کی طرح سخت ہوتا ہے اس کی بناوٹ تلوار کی نیام جیسی ہوتی ہے۔ غرض جس اندھے

نے ہاتھی کا جو حصہ چھوا، اس کی ہیئت کو ویسا ہی سمجھا۔ کسی بھی اندھے کو ہاتھی کے پورے جسم کی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔

اندھیر نگری، چوپٹ راج

دیکھیے: اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔

اندھیر نگری، چوپٹ راجا

دیکھیے: اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔

اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا

یہ مثل ایسی حکومت یا ایسے نظام کے لیے بولتے ہیں جہاں اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تمیز نہ رہی ہو۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہو۔ بادشاہ یا حاکم کی غفلت اور بدعنوانیوں سے ملک میں بدنظمی پھیلی ہو۔ جہاں حاکم کی بے پروائی سے اندھا دھند مچی ہو۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک دلچسپ مشہور کہانی بیان کی جاتی ہے جو معمولی ہیر پھیر کے ساتھ تقریباً یکساں ہے۔ کہانی اس طرح ہے:

کہانی: بستی سے دور جنگل میں ایک گرو کا آشرم تھا۔ تحصیل علم کے بعد ایک چیلا گرو کا آشیرواد لے کر بستی کی طرف روانہ ہوا۔ گرو نے اپنے چیلے کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا:

''بھگوان نہ کرے تم پر کوئی مصیبت آئے۔ پھر بھی اگر تم کبھی کسی پریشانی سے دوچار ہو تو اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے اتار کر اپنے منہ میں ڈال لینا۔ میں تمہاری مدد کیلئے وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

آشیرواد لینے کے بعد چیلا گھومتا ہوا ایک بستی میں پہنچا جس کا نام اندھیر نگری تھا۔

بعض روایت کے مطابق گرو اور چیلا دیس بدیس گھومتے ہوئے ایک ایسے نگر میں پہنچے جس کا نام اندھیر نگری تھا۔ وہاں ہر چیز ٹکے سیر بکتی تھی۔ چیلے نے اپنے گرو سے کہا:

''میں تو اسی نگر میں رہنا پسند کروں گا کیوں کہ یہاں مٹھائی بھی ٹکے سیر بکتی ہے اور ساگ بھی ٹکے سیر بک رہا ہے یعنی بھاجی بھی ٹکے سیر ہے اور کھاجا بھی ٹکے سیر، گھی بھی ٹکے سیر

ہے، مکھن، ملائی بھی ٹکے سیر۔''

چیلے کو تعجب تھا کہ جس نگری میں جیون اتنا آسان ہے، ہر چیز ایک بھاؤ بک رہی ہے۔ اس کا نام اندھیر نگری کیوں پڑا؟ گرو نے چیلے کو ہر چند سمجھایا کہ یہ اندھیر نگری ہے۔ یہاں سارے کام اندھا دھند ہوتے ہیں۔ یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن چیلا نہ مانا اور وہیں رہنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں مٹھائیاں، گھی، دودھ، مکھن اور ملائی وغیرہ کھا کھا کر خوب تنومند ہو گیا۔

ایک دن چیلا بازار سے گزر رہا تھا۔ وہاں ایک عمارت کی دیوار چنی جا رہی تھی۔ چیلے نے وہیں ایک آدمی سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اچانک وہاں دھماکہ ہوا۔ دیوار گر پڑی تھی اور ایک مزدور دیوار سے دب کر مر گیا تھا۔ آناً فاناً لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ اتنے میں وہاں راجا کے سپاہی آ گئے۔ مکان کے مالک کو گرفتار کر کے راجا کے سامنے لے گئے۔ سپاہیوں نے راجا سے کہا:

''راجا جی اس کے مکان کی دیوار گرنے سے ایک مزدور دب کر مر گیا ہے۔''

راجا نے فوراً حکم دیا:

''اس کو پھانسی دے دی جائے۔''

مالک مکان نے کہا:

''راجا جی قصور میرا نہیں ہے۔ اصل قصور اس معمار کا ہے جس نے اس دیوار کو ٹھیک سے چنا نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے دیوار گر گئی۔''

بادشاہ نے فوراً حکم دیا:

''اچھا اسے چھوڑ دو اور معمار کو پھانسی دے دو۔''

سپاہیوں نے معمار یعنی راج کو گرفتار کر کے راجا کے سامنے پیش کیا راج نے اپنی صفائی میں کہا:

''حضور! سارا قصور اس بہشتی کا ہے جس نے گارے میں پانی زیادہ ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے گارا پتلا ہو گیا اور دیوار کمزور بنی۔''

حکم ہوا:

''راج کو چھوڑ دو اور بہشتی کو پھانسی دے دی جائے۔''

یہاں سے یہ حکایت دو طرح سے بیان کی جاتی ہے اوّل یہ کہ بہشتی بے چارہ کوئی جواب نہ دے

سکا۔ راجا کے سپاہی اسے پکڑ کر پھانسی گھر میں لے گئے۔ جب پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈالا گیا تو وہ بہت ڈھیلا تھا۔ یعنی بہشتی کی گردن بہت پتلی تھی اور پھندا بہت چوڑا تھا۔ پھانسی دینا مشکل ہو رہا تھا۔ راجا کے سامنے اس مسئلے کو پیش کیا گیا۔ راجا نے فوراً حکم دیا:

''کسی موٹی گردن والے کو پکڑ کر پھانسی دے دی جائے کیونکہ پھانسی دینا ضروری ہے، خواہ کوئی بھی ہو۔''

پوری اندھیر نگری میں سب سے موٹی گردن والا وہی چیلا تھا۔ سپاہیوں نے اسے پکڑ کر، اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا۔

دوسری روایت یہاں سے اس طرح ہے کہ جب بہشتی کو راجا کے سامنے پیش کیا گیا تو بہشتی نے بیان دیا:

''راجا جی مجھے ایک مسٹنڈ چیلے کی وجہ سے پھانسی دی جا رہی ہے۔ حالانکہ میں بے قصور ہوں۔ سارا قصور اسی چیلے کا ہے۔ میں اپنی مشک کا منہ ہاتھ سے بند کر کے پتلی دھار سے پانی ڈال رہا تھا۔ چیلا وہیں کھڑا ہوا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے قریب سے ایک چھکڑا نکلا تو اس سے بچنے کے لیے وہ تیزی سے میری طرف آیا اور اس کے بڑھنے سے میری مشک کو دھکا لگا اور میرا ہاتھ ڈھیلا ہو گیا جس سے پانی ایک دم نکل پڑا۔''

اب راجا نے مزدور کا قاتل چیلے کو قرار دیا اور فوراً پھانسی کا حکم سنا دیا۔ راجا کے سپاہی اسے پکڑ کر آناً فاناً پھانسی گھر میں لے گئے۔ اب چیلے کی سمجھ میں آگیا کہ اسے اندھیر نگری کیوں کہتے ہیں۔ اب تک تو خوب مٹھائیاں، دودھ، گھی، مکھن وغیرہ کے مزے اڑائے تھے اور اب اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑ رہا تھا۔ چیلے کو اپنی جان بچانے کی فکر ہوئی۔ اسے گُرو کا اپدیش یاد آیا۔ فوراً انگوٹھی کو انگلی سے اتار کر اپنے منہ میں رکھا۔ گُرو وہاں پہنچ گئے یا کہیں سے گھومتے پھرتے اچانک وہاں آ گئے۔ انہوں نے جب یہ معاملہ دیکھا تو کوتوال سے گزارش کی کہ:

''چیلے کے بجائے مجھے پھانسی دے دی جائے۔ میری بھی گردن موٹی ہے۔''

راجہ کے کوتوال نے گُرو سے پوچھا:

ایسا آپ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

گُرو نے کہا:

''ارے آج کا دن بہت اچھا ہے۔ آج کے دن جو پھانسی چڑھے گا سیدھا سورگ لوک یعنی جنت کو جائے گا۔''

کوتوال نے کہا: تو پھر پھانسی پر میں چڑھوں گا۔

جب اس کی خبر وزیر تک پہنچی تو وزیر نے کہا:

''کوتوال سے میرا مرتبہ بڑا ہے، پھانسی پر مجھے چڑھنا چاہئے۔''

سپاہیوں نے یہ خبر راجہ تک پہنچادی۔ اب راجا سے نہ رہا گیا اس نے سوچا جنت کا مستحق میرے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟ اس پھانسی کے پھندے کا حق دار صرف میں ہوں۔ ایسا مبارک اور تیرتھ کا دن خوش قسمتی ہی سے ملتا ہے۔ راجا نے فرمان جاری کیا کہ:

''اس مسٹنڈ چیلے، اس کے گرو، کوتوال اور وزیر سب یہاں سے دفع ہو جائیں اور بغیر کسی دیر کے مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے۔''

لیجئے چوپٹ راجا کھٹ کھٹ کرتے پھانسی پر چڑھ گئے اور گرو جی دانش مندی سے اپنے چیلے کو صاف بچالائے۔ انہوں نے چیلے کو سمجھایا:

''تو آشرم سے نکل کر سنسار کے موہ میں پھنس گیا تھا۔ کچھ نہ سمجھا، اب کبھی مت بھولنا ''اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔''

سنسار میں ہوشیاری سے رہنے کی ضرورت ہے جب ہی سے یہ مثل مشہور ہوگئی۔

اندھے سوجھے بہرائچ

جس شخص کو ہمیشہ اپنے مطلب یا اپنے فائدے کی فکر لگی رہے اس کے لیے کہاوت کہی جاتی ہے۔

اس کہاوت کا تعلق سپہ سالار جنگ مسعود غازی کی درگاہ واقع بہرائچ سے ہے۔ ایسا مشہور ہے کہ اگر کوئی نابینا یعنی اندھا شخص جیٹھ کے مہینے میں سپہ سالار مسعود غازی، جو غازی میاں کے نام سے مشہور ہیں، کی درگاہ میں عقیدت سے حاضر ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ جیٹھ کے مہینے میں وہاں ایک بڑا میلا بھی لگتا ہے اور غازی میاں کا عرس بھی ہوتا ہے۔ لوگ طرح طرح کی اپنی منت اور مرادیں لے کر وہاں حاضری دینے جاتے ہیں جن میں ان اندھوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ غازی میاں کے طفیل سے ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔

اندھے کے کندھین لنگڑا چڑھا، بن گیا ان کا کام

اگر لنگڑا اندھے کے کندھے پر بیٹھ جائے۔ لنگڑا راستہ بتائے اور اندھا چلے تو دونوں اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے یا اپنی منزلِ مقصور تک پہنچ جائیں گے۔ یعنی اندھا لنگڑے کی اور لنگڑے اندھے کی لاچاری کو دور کرسکتا ہے۔ آپس کے میل ملاپ اور باہمی تعلقات سے مشکل کام بھی ہو جاتے ہیں۔ عقل اور تدبیر کے ذریعہ مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک چھوٹی سی مشہور حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک گاؤں میں اچانک آگ لگ گئی۔ آگ سے بچنے کے لیے گاؤں کے لوگ گاؤں کو چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اندھا دیکھ نہ سکنے کے سبب آگ سے گھِر گیا اور بھاگ نہ سکنے کی وجہ سے لنگڑے کا بھی یہی حال ہوا۔ آخر میں ان دونوں کو ایک تدبیر سوجھی۔ لنگڑا اندھے کے کندھے پر بیٹھ گیا اور اسے راستہ بتانے لگا۔ اس طرح تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ گاؤں چھوڑ کر محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔

اندھے نے راہ پوچھی، کنویں میں جا گرا

جب کوئی شخص کسی نادان یا احمق کو ہدایت دے، اس کی رہبری کرے اور اس کے فائدے کی باتیں بتائے مگر وہ اپنی لاعلمی اور نادانی کے سبب فائدے کی جگہ نقصان اٹھائے تو اس کہاوت کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک اندھے نے کسی نیک شخص سے کہیں کا راستہ پوچھا۔ اس نے اندھے کو صحیح راستہ بتا دیا۔ اندھا اپنی سمجھ کے مطابق اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ لیکن کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک کنویں میں گر گیا۔ اگر وہ نیک شخص کے بتائے ہوئے راستے ہی پر چلتا اور خود سمجھ دار ہوتا تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔

ان کو بھی خوش رکھنا چاہیے

ان کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ ان سے بھی ڈرنا چاہئے۔ ان سے بھی رشتہ یا تعلق قائم رکھنا چاہئے۔
اس کہاوت کا استعمال ایسے محل پر کیا جاتا ہے جب کوئی شخص ڈھلمل یقین ہو۔ نہ اِدھر کا ہو نہ اُدھر کا۔ جس کا

ایمان ناپختہ ہو۔اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جواس طرح ہے:

حکایت: کوئی غیر مسلم مذہب اسلام سے بہت متاثر ہوااور وہ ایک روز مسلمان ہوگیا۔اب وہ باقاعدہ نماز پڑھتا، رمضان کے مہینے میں روزے رکھتا۔مذہب اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا مگر اس کے دل میں اپنے پُرانے ہندودھرم کی چاہت کہیں نہ کہیں موجودرہی۔ایک روز وہ مسجد سے نماز پڑھ کر کہیں جارہا تھا کہ راستے میں اسے ہنومان کا مندرنظر آیا۔وہ مندر کے سامنے کھڑا ہوگیا اور ہاتھ جوڑ کر ہنومان کی مورتی کونمستے کرنے لگا۔ایک مسلمان نے جب اسے ایسا کرتے دیکھاتواس سے کہا:

''تم تو مسلمان ہو۔تم نے مذہب اسلام کوقبول کیا ہے۔خدااوراس کے رسول پرایمان لائے ہوتو پھر کیوں ہاتھ جوڑ کر ہنومان کی مورت کونمستے کرتے ہو۔''

اس شخص نے جواب دیا:

''بے شک میں اب بھی مسلمان ہوں لیکن ''انہیں بھی خوش رکھنا چاہیے۔''

ان کو بھی لکھو

کسی احمق اورنادان شخص کیلئے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سے حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک دن اکبر بادشاہ نے اپنے خاص درباری بیربل سے پوچھا کہ:

''اس دنیا میں آنکھ والوں کی تعدادزیادہ ہے یااندھوں کی؟''

بیربل نے برجستہ جواب دیا:

''جہاں پناہ اندھوں کی تعدادزیادہ ہےاورآنکھ والوں کی کم۔''

اکبر نے بیربل سے کہا:

''تم اسے کیسے ثابت کرسکتے ہو؟''

بیربل نے جواب دیا:

''حضوراس کے لیے مجھے ایک منشی اور ایک رجسٹر کی ضرورت ہوگی تا کہ اس رجسٹر میں اندھوں کے نام لکھے جاسکیں۔''

بادشاہ نے بیربل کی یہ درخواست منظور کرتے ہوئے اپنے ایک منشی کو رجسٹر دے کر بیربل کے

حوالے کر دیا۔ بیربل اس منشی کو لے کر نکل پڑے اور راستے میں بیٹھ کر کنکر چننے لگے۔ جو بھی اس راستے سے گزرتا وہ بیربل کو کنکر چنتے دیکھ کر پوچھتا تھا:

"بیربل یہ کیا کر رہے ہو؟"

اس پر بیربل اس کو جواب دینے کے بجائے اپنے منشی سے کہتے تھے کہ:

"ان کو بھی لکھو"

منشی اس کا نام اپنے رجسٹر میں اندھوں کی فہرست میں لکھ لیتا تھا۔ اس طرح ایک لمبی فہرست تیار ہو جانے کے بعد جب بیربل نے اسے اکبر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تو اکبر بیربل کی دانائی کا قائل ہو گیا اور مسرت کا اظہار کیا نیز انہیں انعام واکرام سے بھی نوازا۔

انگور کھٹے ہیں

جب کسی کو کوئی چیز نہ ملے تو اس میں عیب نکال کر اپنے دل کو تسلی کی خاطر یہ جملہ کہا جاتا ہے۔ تمام کوشش کے باوجود بھی جب مطلوبہ چیز میسر نہ ہو سکے تو خفت مٹانے کے لیے اس میں عیب نکالنے والے کے لیے کہتے ہیں۔ اس مثل کے تعلق سے ایک مشہور حکایت ہے۔ جانوروں کی الگ الگ خوبیاں اور خصلتیں ہوتی ہیں۔ لومڑی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بہت چالاک اور دھوکے باز جانور ہے۔ اس کی چالاکی کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک حکایت اس مثل کے تعلق سے بھی بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک دن ایک لومڑی غذا کی تلاش میں نکلی۔ سارا دن اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی رہی مگر کھانے کے لیے کچھ نہ ملا۔ اسی جستجو میں وہ ایک باغ میں پہنچی۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ روشوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ کیاریوں میں صاف پانی بہہ رہا تھا۔ اس منظر سے وہ لطف اندوز ہوئی۔ تکان دور کرنے کے لیے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ باغ کے اندرونی حصے میں گئی۔ باغ کے ایک گوشے میں انگور کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ رس سے بھرے ہوئے انگور کے خوشے لٹک رہے تھے۔ جنہیں دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ خوشوں کو تکتے ہوئے اوپر کو منہ اٹھا کر وہیں بیٹھ گئی اور خوش ہو کر خود سے کہنے لگی:

"جوئندہ یابندہ" یعنی جو ڈھونڈتا ہے پاتا ہے۔ میں ابھی تک بیکار سارے جنگل میں

خاک چھانتی پھرتی رہی۔ واہ رے میری قسمت۔ اتنی عمدہ غذا کسے نصیب ہوگی۔ آج سے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ انگور تو مہینوں کے لیے کافی ہیں۔"

پھر اس نے اپنے چاروں طرف گھوم گھوم کر جائزہ لیا کہ کہیں کوئی آدمی، کتا یا جانور اس کی تاک میں چھپا نہ ہو۔ ہر طرح مطمئن ہوکر وہ انگور کے ایک خوشے کی طرف منہ کھول کر اچھلی جو سب سے نیچے تھا مگر اس کا منہ اس تک نہ پہنچ سکا۔ کہنے لگی:

"عمدہ چیز آسانی سے کہاں ہاتھ آتی ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد اس نے رخ بدل کر زور سے چھلانگ لگائی مگر اس بار بھی اس کا منہ انگور کے کسی خوشے تک نہ پہنچ سکا۔ سوچنے لگی دریا کے کنارے سے پیاسا پھرنا بے وقوفوں کا کام ہے۔ کبھی ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔ یہ سوچ کر اس نے ہمت کر کے اپنے جسم میں پھرتی پیدا کی اور پے در پے اپنی قوت بھر انگور کے خوشوں کی طرف کئی چھلانگیں لگائیں مگر ایک مرتبہ بھی انگور کے کسی خوشے تک اس کی رسائی نہ ہوسکی۔ وہ تھک کر نڈھال ہوگئی اور مایوس ہوکر باغ سے واپس چل دی مگر مُڑ مُڑ کر للچائی نظروں سے انگوروں کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ اسی درمیان ایک دوسرے لومڑی وہاں آگئی اور معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر کہنے لگی:

"اے بہن! کیوں واپس چل دیں؟ کیا انگور نہیں ملے؟"

شکست خوردہ لومڑی نے اپنی جھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا:

"بہن ایسا نہیں ہے۔ انگور تو بہت لگے ہیں مگر سارے کے سارے انگور کھٹے ہیں اور کھٹے انگور مجھے پسند نہیں۔"

اوت پڑے سو کام کرو

دیکھیے: ضرورت پڑے سو کام کرو۔

او راہ گیر! میرے منہ میں بیر توڈال دو

نہایت کاہل، سست اور بے عمل شخص کے لیے طنزاً کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی یہ حکایت مشہور ہے۔

حکایت: ایک مرتبہ کسی پیڑ کی چھاؤں میں ایک نہایت کاہل اور سست آدمی سو رہا تھا۔ پیڑ جامن یا

بیر کا تھا۔ اچانک جامن یا بیر کا پکا ہوا پھل پیڑ سے ٹوٹ کر اس کی چھاتی پر گرا جس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پھل کو اپنی چھاتی پر پڑا ہوا دیکھ کر للچاتا رہا مگر کاہلی اور سستی کے سبب اس پھل کو اٹھا کو خود اپنے منہ میں نہیں رکھا اور انتظار کرتا رہا کہ کوئی راہ گیر اِدھر سے گزرے تو اس سے کہے کہ پھل کو اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہاں سے کوئی راہ گیر گزرا تو اس نے اس سے کہا:

"او راہ گیر! میرے منہ میں بیر تو ڈال دو۔"

او راہ گیر! میرے منہ میں جامن تو ڈال دو

دیکھیے: او راہ گیر! میرے منہ میں بیر تو ڈال دو۔

اوپر برچھی نیچے کنواں، جس سے بنیے کا فارقت ہوا

مجبور ہو کر کسی کام کے کرنے کے محل پر اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی سے زبردستی یا ڈرا دھمکا کر کوئی کام کرائے تو مجبوراً کام کرنے والا اس مثل کو کہتا ہے۔ اس مثل کے پس منظر میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک خان صاحب نے کسی بنیے سے سود پر ایک موٹی رقم ادھار لی۔ کچھ دنوں کے بعد خان صاحب نے اس رقم کو کھا پی کر برابر کر دیا۔ اب خان صاحب کے پاس دینے کے لیے رقم کے نام پر پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچی۔ اصل رقم کا ذکر کیا خان صاحب نے سود کا بھی ایک پیسہ ادا نہیں کیا۔ بنیے کو روز بروز اپنی رقم کی فکر بڑھنے لگی اور وہ خان صاحب سے تقاضے پر تقاضے کرنے لگا۔ تقاضوں سے پریشان ہو کر روپے دینے کے بہانے خان صاحب نے بنیے کو اپنے گھر بلایا۔ بنیا رقم ملنے کی لالچ میں خوشی خوشی خان صاحب کے گھر پہنچا۔ خان صاحب کے گھر میں ایک کنواں تھا۔ اس نے بنیے کو کنویں میں رسی سے باندھ کر لٹکا دیا اور برچھی دکھا کر کہنے لگا کہ:

"کل روپے کی فارقتی یعنی بے باقی کا رقعہ لکھ دو ورنہ جان سے ہاتھ دھوؤ گے۔ برچھی سے مار کر اسی کنویں میں ڈال دیئے جاؤ گے۔"

بنیا تھا بہت ہی چالاک اور ہوشیار، اس نے فوراً بے باقی کی رسید لکھ دی مگر اسی رسید یا رقعہ کے پیچھے یہ جملہ بھی لکھ دیا کہ:

''اوپر برچھی نیچے کنواں، جس سے بنیے کا فارقت ہوا۔''

کچھ دنوں کے بعد بنیے نے عدالت میں نالش کر کے خان صاحب سے اپنی کل رقم وصول کر لی۔

اوپر والا جانے

دیکھیے: بڑھیا کی کھیر رنگ لائی۔

اونٹ سستا ہے، پٹّا مہنگا ہے

دیکھیے: اونٹ کے گلے میں بلی

اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

دیکھیے: اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

اونٹ کی قیمت اونٹ کی پیٹھ پر، مجھ پر نہیں

اونٹ کی جو قیمت ہے وہ اونٹ کی پیٹھ پر ہے۔ میرے پاس نہیں۔ یہ کہاوت اس موقع پر کہی جاتی ہے جب کسی کام میں لگائی گئی رقم ہر حال میں وصول ہو جائے خواہ اس میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سے حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک تاجر اپنا کچھ سامانِ تجارت اونٹ کی پیٹھ پر لاد کر کہیں بیچنے کے لیے جا رہا تھا۔ راستے میں اس کا اونٹ مر گیا تو دوسرے تاجر ساتھی نے اس سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''اونٹ کے مرنے اور نقصان ہونے کا مجھے بے حد افسوس ہے۔''

اس پر تاجر نے جواب دیا:

''یار افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں۔ اونٹ کے مرنے پر کتنا نقصان ہوگا۔ اس کی قیمت تو اس کی پیٹھ پر لدے ہوئے سامان کو فروخت کرنے سے نکل آئے گی۔ میں قطعی گھاٹے میں نہیں ہوں۔''

اونٹ کی گردن میں قلادہ

دیکھیے: اونٹ کے گلے میں بلی۔

اونٹ کے گلے میں بلی

بے میل جوڑ، بے میل کام یا بے میل رشتہ ہونے کے محل پر اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ سخت اور نامناسب شرط کے موقع پر بھی اس کہاوت کو کہا جاتا ہے۔ جب کسی نفع بخش چیز کے ساتھ کوئی نقصان دہ چیز مجبوراً گلے پڑے یا جب کوئی شخص کسی کام میں ایسی اڑچن پیدا کرے جس سے وہ کام مشکل ہو جائے تو بھی اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے پس منظر میں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ کئی حکایات بیان کی جاتی ہیں۔ جس میں سے یہ تو خاص ہیں۔ پہلی حکایت اس طرح ہے:

حکایت: ایک بار کسی شخص کا اونٹ کھو گیا۔ وہ اونٹ کی تلاش میں جنگل جنگل مارا مارا پھرتا رہا۔ جب کئی روز گزر گئے تو اس نے پریشان ہو کر اور تھک ہار کر قسم کھائی کہ جس روز مجھے اونٹ مل جائے گا تو اسے دو پیسے میں بیچ دوں گا۔ اتفاق سے ایک روز اونٹ مل گیا تو وہ اپنی قسم پر بہت افسوس کرنے لگا۔ قسم پوری کرنے کے لیے ایک تدبیر کی۔ اونٹ کے گلے میں بلی باندھ دی اور بلی کی قیمت سو روپے رکھی۔ اونٹ کو بازار میں لے جا کر آواز لگانے لگا:

> ''ہے کوئی جو دو پیسے میں اونٹ خریدے اور سو روپے میں بلی مگر شرط یہ ہے کہ جو بھی خریدے گا دونوں یعنی اونٹ اور بلی کو ایک ساتھ ہی خریدے گا۔''

اس نے کئی مرتبہ آواز لگائی مگر اس شرط کو سن کر اونٹ اور بلی کو خریدنے کے لیے کوئی بھی اس کے پاس نہیں آیا۔ اس طرح اس کی قسم بھی پوری ہو گئی اور اونٹ بھی اسی کے پاس رہا۔

کئی لوگ اس حکایت کو اس طرح بھی بیان کرتے ہیں کہ اس شخص نے بلی کے بجائے اونٹ کی گردن میں ایک قلادہ یعنی پٹا باندھ دیا تھا اور اونٹ کی قیمت دو پیسے، پٹے یا قلادہ کی قیمت سو روپے رکھی تھی۔ دونوں کو ایک ساتھ خریدنے کی پہلی اور آخری شرط تھی۔ ایک آدمی اس شخص کے پاس پہنچا اور بولا:

> اونٹ سستا ہے اگر اس کی گردن میں قلادہ یا پٹا نہ ہوتا۔''

یہ حکایت اس طرح بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک آدمی کے پاس ایک اونٹ تھا۔ اونٹ بہت شریر

اور بگڑا ہوا تھا۔ کام کے وقت اپنے مالک کو بہت پریشان کرتا تھا۔ جدھر منہ اٹھاتا ادھر ہی بلبلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس کا مالک اس سے بہت تنگ اور نہایت عاجز تھا۔ گھر کا کوئی شخص اس سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ اگر مالک کو کوئی دوسرا کام کرنا ہو یا کہیں جانا ہو تو اونٹ کے مزے تھے۔ وہ بغیر کام کیے خوب کھاتا پیتا تھا۔ آخر کار مالک اس کی انہی بری عادتوں سے بیزار ہو گیا اور اسے بیچ دینے کا عہد کر لیا۔ گاؤں کے تمام لوگ اونٹ کی سرکشی اور خرابیوں سے واقف تھے۔ قرب و جوار میں بھی اس کے نکھے پن کا چرچا تھا۔ مالک نے اسے کئی بار بیچنے کی کوشش کی مگر کسی بھی قیمت پر کوئی اس کو خریدنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ آخر کار مجبور ہو کر اور اکتا کر اس نے قسم کھائی کہ کہ اب اسے نخاس میں لے جا کر دس روپے میں بیچ دوں گا۔ لوگوں نے جب مالک کی اس بات کو سنا تو آپس میں صلاح و مشورہ کیا کہ دس روپے میں اونٹ کیا برا ہے۔ کچھ لوگ اونٹ خریدنے کے لیے مالک کے گھر گئے۔ مالک نے سوچا کہ گھر پر بندھا ہوا اونٹ دس روپے میں بیچ دوں گا تو میرے بچے ناراض ہوں گے اور بیوی تو جان ہی کھا جائے گی۔ اگر اسے نخاس میں لے جا کر بیچوں گا تو گھر کے کسی فرد کو خبر نہ ہوگی۔ ہاں بعد میں جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ مالک نے اپنی اس بات کو لاکھ چھپایا مگر دھیرے دھیرے سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔ گاؤں کی چند عورتوں نے یہ بھید اس کی بیوی پر ظاہر کر دیا۔ بیوی نے رات کو اپنے شوہر سے کہا:

”تمہیں کچھ پتا ہے۔ گاؤں میں کیا بات چل رہی ہے۔ تم میرے اونٹ کو نخاس لے جا کر دس روپے میں بیچو گے۔ شاید تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔“

مالک نے کہا:

”ہاں تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ تم تو اونٹ کے پاس بھی نہیں جا سکتی ہو۔ جانتی ہو اس سرکش اونٹ سے میرا کتنا کام بگڑ چکا ہے۔ اس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے اور میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میں تو اس سے ہار گیا۔ تمام تدبیریں کیں مگر یہ اپنی بری حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ اب تو میں پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دس روپے میں بیچوں گا۔“

بیوی بگڑ کر بولی:

”اچھا تمہاری مرضی۔ چاہے جو کچھ کرو۔ خوب گھر میں آگ لگاؤ اور تاپو۔“

نخاس میں لے جانے سے پہلے صبح کو مالک نے اونٹ کو خوب کھلایا اور پلایا اور اس کے جسم کو رگڑ

رگڑ کر صاف کیا۔ اس کے بعد اس کے گلے میں ایک رسی باندھی اور رسی سے ایک بلی باندھ کر لٹکا دی۔ اونٹ کو لے کر نخاس کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارا گاؤں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی اس پر ہنسنے لگی اور بولی:

''ابھی تو تمہارا دماغ ہی خراب ہوا ہے کل کو بیوی بچوں کو بھی لے جا کر نخاس میں بیچ آنا۔''

مالک جب اونٹ کو لے جا کر نخاس پہنچا تو اس کے چاروں طرف بھیڑ لگ گئی۔ اونٹ کے گلے میں بندھی ہوئی بلی دیکھ کر سب حیران تھے۔ مالک آواز لگا رہا تھا:

''اونٹ دس روپے میں اور بلی سو روپے میں۔ جس کے پیسے ہاتھ ہے۔ دونوں کا سودا ساتھ ہے۔''

دس روپے اونٹ کی قیمت سن کر وہاں بہت سے خریدار جمع ہو گئے مگر جب انہوں نے بلی کی قیمت سو روپے سنی تو ہکا بکا رہ گئے۔ دونوں کا سودا ایک ساتھ کی شرط سے خریداروں کی جیب میں پڑے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ کچھ من چلے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ایک من چلا بولا:

''یار دس روپے میں مریل اونٹ بھی کسی زمانے میں نہیں بکا ہوگا۔ مفت ہے مفت ہے مگر بلی کی قیمت نے مصیبت پیدا کر دی ہے۔ پھر بھی اتنی قیمت میں دونوں کیا برے ہیں۔ بلی کے دام ضرور زیادہ ہیں مگر اونٹ تو دس ہی روپے میں ملے گا۔ ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔''

ایک شخص کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے بڑھ کر ایک سو دس روپے میں دونوں کو خرید لیا اور خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مالک بھی خوش خوش گھر واپس آیا اور بیوی کے ہاتھ میں دس روپے دے کر کہا:

''یہ لو اونٹ کی قیمت۔ میں اسے نخاس میں بیچ آیا ہوں۔''

بیوی نے غصہ میں وہ روپے پھینک دیئے۔ اس کے بعد مالک نے اس میں سو روپے ملا کر بیوی کو ایک سو دس روپے دیے تو بیوی نے کہا:

''یہ کیا؟''

مالک نے کہا:

''اونٹ تو دس روپے ہی کا بیچا ہے مگر اس کے ساتھ بلی کی قیمت سو روپے وصول کی ہے۔''

بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور خوش ہو کر کہنے لگی:

''ارے تم تو بہت ہوشیار اور چالاک نکلے۔ میں ہی بدھو ہوں۔ ''اونٹ کے گلے میں بلی'' کا مطلب اب سمجھی۔''

اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ

دیکھیے: اونگھتے کو دھکے کا بہانہ۔

اونگھتے کو دھکے کا بہانہ

دوسرے کے معمولی قصور پر سارا الزام اُس پر لگا دینے کے محل پر اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح ہے:

حکایت: ایک شخص نیند میں بھرا ہوا بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا اور اونگھتے اونگھتے وہیں پر گر پڑا۔ اتفاق سے اس وقت کسی شخص سے اس کو ذرا سا دھکا لگ گیا تو اونگھ سے گرنے والا ناراض ہو کر کہنے لگا:

''میں اچھا بھلا بیٹھا تھا۔ اس نے دھکا مار کر مجھے گرا دیا۔''

ایسی بات بنائی، بالم کی مونچھ منڈائی

دیکھیے: اپنی ٹیک بھنجائی، بالم کی مونچھ منڈائی۔

ایسے جنگل میں چاول

خلاف امکان واقعہ پیش آنے کے محل پر یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ خلاف توقع بات پر جلدی سے یقین کر لینے اور اپنی عقل سے کام نہ لینے کے موقع پر بھی اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت سے متعلق ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی جنگل میں کبوتروں کا ایک جھنڈ اڑ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کبوتر نے دیکھا کہ جنگل میں بہت سے چاول بکھرے پڑے ہیں۔ خوش ہو کر اُس نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا، دیکھو زمین پر کتنے چاول بکھرے پڑے ہیں۔ ہم لوگ بلاوجہ ایک ایک دانے کی تلاش میں دور دور اڑتے پھرتے ہیں۔ آؤ ہم سب نیچے اتریں اور چاول چگ کر اپنی بھوک مٹائیں۔ ایک بوڑھے اور تجربہ کار کبوتر نے ان کو سمجھایا کہ:

"اس میں ضرور کوئی چال ہے۔ ایسے جنگل میں چاول کہاں؟ ہم لوگوں کو پکڑنے کے لیے کہیں کسی شکاری نے چاول پھیلا رکھے ہوں اور خود شکاری کسی آڑ میں چھپ کر نہ بیٹھا ہو۔"

مگر لالچ کی وجہ سے انہوں نے اس بوڑھے کبوتر کی بات نہ مانی اور زمین پر چاول کی لالچ میں اتر گئے۔ انہوں نے جوں ہی چاولوں کو چگنے کے لیے اپنی چونچیں کھولیں شکاری نے انہیں اپنے جال میں پھانس لیا۔

ایک آنے کا دودھ لیا، اس میں بھی مکھی!

صاحب! اتنے تھوڑے دودھ میں مکھی نہیں تو کیا ملے گا ہاتھی

یہ کہاوت نہایت بخیل یعنی کنجوس شخص کے لیے کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق یہ چھوٹی سی حکایت مشہور ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کسی آدمی نے ایک دوکاندار سے ایک آنے کا دودھ خریدا جس میں مکھی پڑی ہوئی تھی۔ آدمی نے دوکاندار سے کہا:

"اس میں تو مکھی پڑی ہوئی ہے۔ تو دوکاندار نے جواب دیا:

صاحب ایک آنے کے ذرا سے دودھ میں مکھی نہیں تو کیا ہاتھی نکلے گا۔"

ایک دن کا مہمان، دو دن کا مہمان، تیسرے دن بلائے جان

دیکھیے: دعوتِ شیراز اسی کا نام ہے۔

ایک نکٹا سو کو نکٹا کر دیتا ہے

ایک بدکار اور برا شخص بہتوں کو برا کر دیتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک چور، چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اور بادشاہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اس چور کی ناک کٹوا دی۔ ناک کٹتے ہی چور خوش ہو کر ناچنے اور جھومنے لگا۔ جب لوگوں نے اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا:

''ناک کٹنے کے بعد مجھے خدائے تعالیٰ کا دیدار ہو رہا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ ناک ہی کے سبب خدا کا دیدار نہیں ہوتا تھا۔''

اس کی باتوں کے جھانسے میں آ کر ایک دوسرے آدمی نے بھی اپنی ناک کٹوا دی۔ چور نکٹے نے اس کے کان میں کہا:

''اب تم بھی یہی کہو کہ مجھے خدا کا دیدار ہو رہا ہے ورنہ لوگ تمہیں گاؤدی اور احمق سمجھیں گے اب تم بھی خوب جھومو اور ناچو۔''

لہٰذا اس شخص نے بھی ایسا کہنا اور کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ان کی باتوں میں آ کر لوگوں نے اپنی ناکیں کٹوانا شروع کر دیں۔ دھیرے دھیرے نکٹوں کی تعداد بڑھنے لگی اور سینکڑوں تک جا پہنچی۔ جب بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو بادشاہ نے نکٹوں کے مکھیا کو بلا کر پوچھا:

''کیا یہ سچ ہے کہ ناک کٹوانے سے خدائے تعالیٰ کا دیدار ہوتا ہے۔''

نکٹوں کے مکھیا نے کہا:

''حضور! اگر آپ کو یقین نہ ہو تو اپنی ناک کٹوا کر دیکھ لیں۔''

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ بادشاہ بھی اپنی ناک کٹوانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن اس کے وزیر نے بادشاہ کو منع کر دیا۔ وزیر نے بادشاہ سے کہا:

''حضور پہلے میں خود اپنی ناک کٹوا کر دیکھوں گا کہ ناک کٹنے سے خدائے تعالیٰ کا دیدار ہوتا ہے یا نہیں یعنی ان باتوں میں کتنی سچائی ہے؟''

بادشاہ نے وزیر کے مشورے کو مان لیا۔ آخر کار وزیر نے اپنی ناک کٹوا لی۔ ناک کٹتے ہی نکٹے چور

اور نکٹوں کے کھیانے وزیر کے کان میں کہا:

''اب تم بھی یہی کہو کہ ناک کٹنے سے خدا کا دیدار ہو رہا ہے ورنہ لوگ تم کو بے وقوف کہیں گے۔''

لیکن وزیر نے ان کی باتوں کو نہیں مانا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ تمام نکٹوں کو گرفتار کر کے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ اس طرح ان کو ان کے فریب کی سزا بھی مل گئی اور بادشاہ بھی نکٹا ہونے سے بچ گیا۔

اینٹ کی پانت، دمدار

جس کسی شخص کو اپنی قوت اور لیاقت کا اندازہ نہ ہو اور وہ اپنی صلاحیت سے زیادہ کسی کام کو کرنے کیلئے تیار ہو جائے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک اعتقاد سے ہے:

اعتقاد: کانپور ضلع کے ایک گاؤں مکن پور میں حضرت بدیع الدین زندہ شاہ مدار کی درگاہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی روحانی قوت یا کرامت کی وجہ سے ان کی تُربت کے اوپر ایک بھاری پتھر فضا میں معلق ہے۔ ہر شخص کو ایسی روحانی قوت و کرامت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔

(یہ کہاوت صرف اعتقاد اور سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ میں بذاتِ خود کئی مرتبہ زندہ شاہ مدار رحمۃ اللہ علیہ کی مزارِ اقدس واقع مکن پور میں حاضر ہوا مگر آپ کی تُربت عالیہ کے اوپر نہ تو فضا میں معلق کوئی پتھر ہی نظر آیا اور نہ ہی اس قسم کے کوئی آثار ہی معلوم ہوئے)۔

بابا آغا اپنا پیسہ کھاتا ہے

دیکھیے: بابا زرِ خودمی خورم۔

بابا زرِ خودمی خورم

ایک مرتبہ ایک کابلی پٹھان ہندوستان آیا۔ راجدھانی دہلی کو دیکھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ جامع مسجد، لال قلعہ، درگاہ نظام الدین، مہرولی وغیرہ گھومنے کا پروگرام تھا۔ صدر بازار اور اردو بازار کے علاقہ میں گھوم کر وہ سبزی منڈی کی طرف چل دیا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستان کتنا اچھا ملک ہے۔ یہاں کی سلطنت دہلی میں طرح طرح کی چیزیں بک رہی ہیں۔ کابل میں ایسی چیزیں اس نے کبھی نہیں دیکھی

تھیں۔غریب سے غریب آدمی بھی ان چیزوں کو بازار سے خرید خرید کر کھا رہا تھا۔پٹھان نے دل میں سوچا اس ملک کے باشندے کتنے خوش قسمت ہیں۔انہیں طرح طرح کی چیزیں کم داموں میں میسر ہیں۔بازار میں ایک طرف خوش رنگ سنگترے بک رہے ہیں۔اس نے کئی سنگترے خریدے اور خوب مزے لے لے کر کھائے۔کم پیسوں میں اتنے خوش ذائقہ اور خوش رنگ پھل میسر آنے پر اسے تعجب ہو رہا تھا۔اس کے بعد اس نے خرید کر کئی امرود کھائے، کیلے اور سیب وغیرہ بھی کھائے۔کچھ آگے بڑھا تو ایک کاچھی سرخ سرخ مرچیں لیے ہوئے بیٹھا تھا۔مرچوں کا سرخ رنگ اور ان کی سڈول بناوٹ دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔اس نے اشارے سے کاچھی سے مرچیں مانگیں۔کاچھی نے ڈھیر ساری مرچیں دے دیں اور صرف دو پیسے لئے۔پٹھان خوش رنگ مرچوں کو لے کر ایک چبوترے پر بیٹھ گیا اور مرچیں چبانا شروع کر دیں۔

اس کے منہ میں مرچیں لگیں۔آنکھ سے آنسو اور ناک اور منہ سے رال اور تھوک بہنے لگا مگر پٹھان نے مرچوں کو چبانا جاری رکھا۔یہ تماشہ دیکھنے کیلئے وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔آپس میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں لوگ پٹھان کی بیوقوفی پر ہنس رہے تھے۔کچھ دیر کے بعد ایک نوجوان آگے بڑھا اور آغا خان سے کہنے لگا:

''خان یہ کیا کرتا ہے۔یہ تو مرچیں ہیں اور مرچوں کو اس طرح نہیں کھایا جاتا۔ان سے تو چٹنی وغیرہ بنتی ہے۔سالن میں ڈالی جاتی ہیں۔انہیں اس طرح نہیں کھایا جاتا۔''

خان نے جواب دیا:

''بابا! ہم کچھ نہیں جانتا۔تم لوگ کیا کہتا ہے؟ تم لوگ یہاں کیوں کھڑا ہے؟''

خان ان کی باتوں کا جواب بھی دے رہا تھا اور مرچیں بھی برابر کھاتا جا رہا تھا۔آخر میں اس نے بھیڑ سے کہا:

''تم لوگ یہاں سے جاتا کیوں نہیں۔اس طرح کیا دیکھتا ہے؟''

''بابا زرِ خودی خورم'' بابا آغا اپنا پیسہ کھاتا ہے۔(مزید دیکھیے: خان اپنا پیسہ کھاتا ہے)۔

یہ کہاوت ایسے موقعوں پر بولی جاتی ہے جب کوئی اپنا مال کھائے اور لوگ اس پر بے وجہ تنقید کریں یا پھر ایسے محل پر بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے جہاں کوئی شخص اپنے پیسے کو بیجا صرف کرے یا پھوہڑ پن سے خرچ کرے یعنی جسے پیسہ خرچ کرنے کی تمیز نہ ہو۔

بارات بج جائے گی

ایک مرتبہ کسی بنیے سے ایک پٹھان نے ایک موٹی رقم سود پر ادھار لی مگر پٹھان نے جب کئی سال تک نہ تو ادھار لی ہوئی رقم ادا کی اور نہ ہی اس کا سود۔ بنیے نے اصل رقم اور سود ادا کرنے کے لیے تقاضے پر تقاضے کرنا شروع کر دیے پھر بھی پٹھان نے ایک بھی پیسہ نہیں دیا۔ بنیے نے جب پھر تقاضا کیا تو پٹھان نے بنیے سے کہا:

''فلاں دن تم گھر آ جانا۔ آپ کی اصل رقم اور سود کا ایک ایک پیسہ ادا کر دیا جائے گا۔''

بنیا خوش ہو گیا اور ایک ایک دن گن کر انتظار کرنے لگا اور مقررہ روز پٹھان کے گھر پہنچ گیا۔ پٹھان نے اس کو عزت و احترام سے ساتھ ایک کمرے میں بٹھایا اور خاطر و مدارت کی۔ اسی درمیان بنیے سے کہا:

''بس تھوڑی ہی دیر میں آپ کا سارا پیسہ ادا ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر پٹھان اپنے گھر کے باہر آیا۔ وہاں باجا بجانے والے پہلے ہی سے موجود تھے جن کو اجرت پر لایا گیا تھا۔ پٹھان نے باجے والوں سے کہا:

''اب تم لوگ زور زور سے باجا بجانا شروع کرو۔ جب تک میں نہ کہوں باجے برابر بجاتے رہوگے۔''

یہ کہہ کر اندر گیا تو بنیے نے اس سے پوچھا:

''باہر باجے کیسے بجنے لگے ہیں۔''

پٹھان نے کہا:

''یہ تمہاری بارات بج رہی ہے اور ابھی تمہارا ایک ایک پیسہ چکتا ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے دو مسٹنڈوں کو بلایا۔ جنہوں نے آتے ہی بنیے کو لات گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ بنیے کو مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ اب تو پٹھان کے پاس تقاضے کو نہیں آؤ گے کہو سارا پیسہ مع سود ہم نے پالیا، مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے مرتا کیا نہ کرتا۔ بنیے نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

''میری جان بخش دو۔ میں نے سارا پیسہ پالیا۔ اب تقاضا کرنا کیسا اور زیادہ بارات نہ بجاؤ۔''

آخر پٹھان کے کہنے پر بنیے کی جان بخشی ہوئی۔ بنیا مسٹنڈوں کی مار سے اس قدر ڈر اور سہم گیا تھا

اس نے اس واقعہ کا کسی سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ البتہ جب کہیں باجے بجتے تو وہ ادھر کا رخ نہ کرتا اور اپنی جان پہچان والوں کو بھی ادھر نہ جانے کے لیے کہتا۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا:

''بھئی ایسا کیا ہے کہ ہم ادھر نہ جائیں۔''

تو بس اتنا ہی کہتا:

''بارات بج رہی ہے، کسی کا حساب چُک رہا ہے اگر تم ادھر جاؤ گے تو تمہاری بھی بارات بج جائے گی۔''

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی شخص کو ڈرا دھمکا یا مار پیٹ کر کسی کام کو کرنے اور کسی سے کچھ نہ کہنے کے لیے کہیں۔ یہ کہاوت وہ شخص بھی کہتا ہے جس سے زبردستی یا ڈرا دھمکا کر کوئی کام کرایا گیا ہو۔

بار بار چندن بار بار پانی، سالگ رام گھُل گئے تب جانی

رات دن کسی چیز کے پیچھے پڑے رہنے کے سبب جب وہ چیز برباد ہو جائے تو بیٹھ کر پچھتانے اور ہاتھ ملنے والے کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت اس طرح ہے:

حکایت: ایک سیٹھ جی سالگ رام کے بہت بڑے بھکت تھے۔ سالگ رام وہ چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے گول پتھر ہوتے ہیں جنہیں ہندو وشنو کی مورتی سمجھتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ سیٹھ جی صبح اٹھتے ہی سالگ رام کی پوجا کرتے اور اسے نہلاتے۔

سیٹھ جی گھر بار اور بیوی بچوں سے بے نیاز اپنا زیادہ وقت سالگ رام کی پوجا پاٹ ہی میں لگاتے تھے۔ بار بار اسے نہلاتے اور چندن لگاتے تھے۔ ان کی بیوی بچے اس پوجا پاٹ سے بہت پریشان تھے۔ بیوی نے سیٹھ جی کو بہت سمجھایا کہ سالگ رام کی پوجا پاٹ صبح کے وقت ہی کرنا بہتر ہے۔ یہ نہیں کہ رات دن ہی پوجا کرتے رہیں مگر جب سیٹھ جی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو بیوی نے مجبور ہو کر ایک تدبیر کی۔ اس نے سالگ رام کو اٹھا کر کہیں رکھ دیا اور اس کی جگہ پر ایک کالے رنگ کا بڑا جامن رکھ دیا۔ سیٹھ جی جب صبح سو کر اٹھے تو جام کو سالگ رام سمجھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی۔ اس کے بعد جوں ہی نہلانے کیلئے اس پر پانی ڈال کر ہاتھ سے دھونے لگے تو جامن گھل کر بہہ گیا۔ سیٹھ جی سمجھے سالگ رام گھل کر سدھار گئے ہیں۔ انہوں نے چلا چلا کر اپنی بیوی کو بلایا۔ بیوی دوڑتی ہوئی ان کے پاس آئی تو انہوں نے کہا:

''سالگ رام گھل کر سدھار گئے، اب کیا ہوگا؟''

بیوی نے کہا:

''گھل کر نہ سدھارتے تو کیا کرتے۔ دن بھر تو تم ان کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے اور بار بار نہلایا کرتے تھے۔ اس لیے وہ نرم ہو کر گھل گئے۔ بار بار چند بار بار پانی، سالگ رام گھل گئے تب جانی۔''

اب سیٹھ جی کے پاس افسوس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ گردن جھکا کر بیٹھ گئے۔ جب بیوی نے انہیں اس حال میں دیکھا تو ان سے کہا:

''گھبرانے اور افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں، سالگ رام گھل گئے تو گھل جانے دو۔ پنڈت جی سے کہہ کر اس کا انتظام کرالیا جائے گا مگر آئندہ اس بات کو دھیان رکھنا کہ سالگ رام کی صبح صبح ہی پوجا کرنا اور انہیں بار بار نہ نہلانا ورنہ وہ پھر نرم ہو جائیں گے اور گل کر سدھار جائیں گے۔''

بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی بھلا

دیکھیے: بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی جئے گا۔

بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی جئے گا

یہ مثل ایسے محل پر بولتے ہیں جہاں معمولی نقصان اٹھانے کے بعد انسان ہوشیار ہو جائے اور پھر اس شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کے سلسلے میں حسبِ ذیل حکایت مشہور ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک بلی سر جھکائے، غریب صورت بنائے چوہے کی تاک میں بیٹھی تھی۔ اتفاقاً ایک چوہے کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس پر جھپٹی تو چوہا اپنی جان بچا کر بل میں گھس گیا۔ مگر چوہے کی دم اس کے ہاتھ میں آئی۔ بلی نے چوہے سے محبت بھرے لہجے میں کہا:

''چوہے بھائی! باہر آؤ۔ میں تو تم سے کھیلتی تھی۔ تم سے کھیلنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ بل سے باہر آؤ تو پہلے تمہاری دم چھوڑ دوں گی پھر ہم تم ساتھ ساتھ خوب کھیلیں گے۔''

چوہا ہوشیار تھا۔ اس کے مطلب کو تاڑ گیا اور بلی کو جواب دیا:

"بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی جئے گا"۔

بدھیا مری تو مری، آگرہ تو دیکھا

نقصان تو ہوا مگر تجربہ بھی تو حاصل ہوا۔ جب کوئی شخص فائدے کے لیے کوئی کام کرے یا کہیں جائے مگر نقصان اٹھا کر اسے واپس آنا پڑے تو یہ مثل کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے سلسلے میں ایک واقعہ ہے جسے لوگ اس طرح بیان کرتے ہیں:

واقعہ: ایک بنجارہ اپنا کچھ مال بیل کی پیٹھ پر لاد کر آگرہ گیا۔ وہاں اس نے اپنے مال کو بیچنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا کچھ بھی مال نہ بِکا۔ الٹے ایک دن اس کا بیل ہی مر گیا۔ جب بنجارا اپنے گاؤں واپس آیا تو لوگوں نے اس کی خیریت پوچھی۔ بنجارے نے مال نہ بکنے اور بیل کے مر جانے کی بات بتائی۔ لوگوں نے جب اس سے ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا تو اس نے کہا:

"کوئی بات نہیں۔ بدھیا مری تو مری، آگرہ تو دیکھا۔"

برے وقت ہی دشمن سے دوستی

مصیبت پڑنے ہی پر دشمن سے دوستی کرنا چاہئے۔ دشمن سے دوستی صرف برا وقت آنے پر ہی کام آسکتی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک چوہا رات کے وقت کھانے کی تلاش میں اپنے بل سے باہر نکلا۔ ایک الو نے چوہے کو دیکھ لیا اور اس کی تاک میں بیٹھ گیا۔ چوہا سہم کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک نیولا بھی چوہے کی گھات میں تھوڑی دور پر چھپ کر بیٹھ گیا جسے چوہے نے تاڑ لیا تھا۔ چوہے نے سوچا۔ اب جان کا بچنا محال ہے کیوں کہ مجھے کھانے کی فکر میں الو اور نیولا دونوں بیٹھے ہیں۔ دونوں میری جان کے دشمن ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت چوہے کی نظر ایک بلی پر پڑی جو ایک جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ بلی چوہے کی جان کو کب بخشتی ہے مگر اس وقت وہ جال میں پھنسی ہوئی تھی۔

چوہا بلی کے پاس گیا اور اس نے اپنے ازلی دشمن بلی سے دوستی کر لی۔ چوہے نے آناً فاناً اپنے دانتوں سے جال کو کاٹ ڈالا۔ بلی جونہی جال سے باہر نکلی الو اور نیولے نے ڈر کر اپنی راہ لی۔ اس کے

بعد بلی چوہے کے پاس آئی اور اس سے کہنے لگی:

''تم نے میری جان بچائی ہے۔ برے وقت میرے کام آئے ہو۔ اب ہم تم باقاعدہ ہمیشہ کے لیے دوستی کرلیں۔''

چوہے نے جواب دیا:

''دشمن سے دوستی صرف مصیبت آنے ہی پر کی جانی چاہیے۔''

بڑی ٹیڑھی کھیر ہے

دیکھیے: ٹیڑھی کھیر ہے۔

بڑے تیس مار خاں ہیں

دیکھیے: تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں۔

بڑھیا کی کھیر رنگ لائی

جب کوئی راز کسی ایسی چیز یا بات سے ظاہر ہو جائے جس کا بظاہر اس راز سے کوئی تعلق نہ ہو، تو یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے تعلق سے ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کھیر کھانے کے لیے کسی بڑھیا کا دل چاہا۔ رات کا وقت تھا۔ اس نے دودھ، چاول، شکر وغیرہ ہانڈی میں ڈال کر ہانڈی چولہے کے اوپر رکھ دی اور اپنے بستر پر تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گی۔ ہانڈی چولہے پر چڑھی ہوئی تھی، چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ کھیر کھدر بدر کر کے پکنے ہی والی تھی کہ اچانک بڑھیا کی آنکھ لگ گئی۔ اب بڑھیا اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ اتنے میں دو چور بڑھیا کے گھر میں چوری کرنے کے لیے گھس آئے۔ ایک چور تو چھت پر چڑھ گیا اور آہٹ لینے کیلئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دوسرا چور گھر میں سامان کو تلاش کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی پر پڑی۔ اس نے ہانڈی کو کھول کر دیکھا تو گرما گرم کھیر تیار تھی۔ کھیر کو دیکھ کر چور کی بھوک جاگ اٹھی۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک رکابی میں کھیر نکال کر جلدی جلدی کھانے لگا ادھر نیند میں مست بڑھیا نے

اپنے بستر پر کروٹ لی تو اس کا سیدھا ہاتھ بستر پر کھل گیا اور آدھا ہاتھ چارپائی سے باہر آ گیا۔ آہٹ پا کر چور نے بڑھیا کے بستر کی طرف دیکھا۔ بڑھیا کا سیدھا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ اس نے سمجھا بُوھیا کھیر مانگ رہی ہے۔ اس نے ڈوئی سے فوراً کھیر نکالی اور جوں ہی بڑھیا کی ہتھیلی پر ڈالی۔ بڑھیا چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ گرم کھیر سے اس کا ہاتھ جل گیا تھا۔ چیخ سن کر چور تو بڑھیا کی چارپائی کے نیچے گھس گیا اور محلے والے بڑھیا کے پاس آ کر اس کی چیخ کا سبب معلوم کرنے لگے بڑھیا نے اپنے پڑوسیوں سے کہا:

''آج کھیر کھانے کیلئے دل چاہا۔ کھیر پکانے کیلئے ہانڈی کو چولہے پر چڑھادیا اور میں ذرا آرام کرنے کیلئے لیٹی کہ میری آنکھ لگ گئی۔ ہانڈی تو چولہے پر چڑھی تھی۔ میں سو رہی تھی۔ اب گرم گرم کھیر سے میرا ہاتھ کیسے جلا یہ اوپر والا جانے۔''

چور جو چھت کے اوپر چھپا بیٹھا تھا وہ سمجھا کہ بُوھیا اس پر الزام لگا رہی ہے۔ جب کہ یہ سارا کارنامہ اس کے دوسرے ساتھی کا ہے جو بڑھیا کی چارپائی کے نیچے چھپا ہے۔ اس نے چھت سے جھانک کر بڑھیا سے کہا: ''اے بڑی بی! میں تو اوپر تھا۔ مجھ پر کیوں الزام لگاتی ہو۔ یہ ساری کارستانی نیچے والے کی ہے۔''

نیچے والے نے جب یہ سنا تو فوراً نکل کر بھاگا مگر پکڑا گیا۔ اوپر والے چور کو بھی محلے کے لوگوں نے گھیر کر پکڑلیا اور دونوں کی پٹائی کی۔ اس طرح دونوں چوروں کو پکڑوانے میں بڑھیا کی کھیر رنگ لائی۔

بڑھیا کے مرنے کا غم نہیں، موت نے گھر دیکھ لیا

نقصان کا غم نہیں، راستہ ہمیشہ کے لیے ہوگیا۔ یہ روایت غلط پڑگئی۔ ایک مثال قائم ہوگئی۔ اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی شخص کو ایک جیسا نقصان بار بار اٹھانا پڑے یا کوئی شخص اس کی دکھتی رگ سے بار بار فائدہ اٹھائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کسی گاؤں میں ایک بڑھیا اپنے لڑکے اور بہو بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک روز بڑھیا بیمار ہوگئی۔ بہت علاج کرایا گیا مگر بڑھیا کو نہ اچھا ہونا تھا نہ اچھی ہوئی۔ جب بڑھیا کی وفات ہوگئی تو اس کا بیٹا چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ بڑھیا کی بہو اور بیٹیاں بھی رو رہی تھیں مگر بیٹے کا حال سب سے بُرا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بال نوچتا اور سینہ پیٹتا۔ ان کے رونے کی آواز سن کر محلے اور آس پاس کے لوگ آ گئے اور انہیں سمجھا کر صبر و تحمل سے کام لینے کی صلاح دینے لگے۔ محلے کے لوگوں نے جب لڑکے سے

کہا:

''موت تو سب کو آنا ہے، صبر سے کام لو اور ماں کی مغفرت کے لیے دعا کرو۔''

لڑکے نے روتے روتے جھنجھلا کر کہا:

''بڑھیا کے مرنے کا غم نہیں، موت نے گھر دیکھ لیا۔ آج بڑھیا مری ہے، کل میری بہن مرے گی، پرسوں بیوی مرے گی، اس طرح ہر روز کوئی نہ کوئی مرتا رہے گا، کیوں کہ موت نے گھر دیکھ لیا ہے۔''

بِش دیتے بِشیاری، ایسے دین دیال

اگر کوئی شخص کسی کا برا چاہے اور اس کو اس سے فائدہ ہو جائے یا کوئی شخص جس تدبیر سے کسی کو نقصان پہنچانا یا کسی کی جان لینا چاہے اور وہی تدبیر اس کے حق میں مفید ثابت ہو تو یہ کہاوت استعمال کی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے یہ چھوٹی سی حکایت بیان کی جاتی ہے۔

حکایت: ایک شخص کسی کی جان لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس شخص کو سمجھا بجھا کر اپنی بیوی کے پاس بھیجا۔ ادھر اس نے اپنی بیوی کو ایک چٹھی لکھی کہ فلاں شخص تمہارے پاس آ رہا ہے۔ میں نے اسے بھیجا ہے۔ اسے وِش (زہر) دے دینا۔ بھیجنے والے شخص کی ایک خوبصورت بیٹی تھی جس کا نام وِشیا یا وِشیاری تھا۔ گھر میں سبھی لوگ اسے پیار سے وِش کہہ کر بلاتے تھے۔ بیوی نے وِش کو زہر نہ سمجھ کر وِشیا یا وِشیاری سمجھا۔ وہ آدمی جوں ہی اس کی بیوی کے پاس پہنچا۔ بیوی نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ اس کو بٹھایا۔ خاطر مدارت کی اور اپنی پیاری بیٹی وِشیا کو اس کے حوالے کر دیا۔ شادی کرنے کے بعد وِشیا کو لے کر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

بگڑا شاعر مرثیہ گو

شاعری میں درجہ کمال کو نہ پہنچنے والا شاعر مرثیہ گوئی اختیار کر لیتا ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے:

سبب: عہد میر وسودا میں مرثیہ گوئی کی حالت بہت خراب تھی۔ ایسے بہت سے شعراء وجود میں آ گئے تھے جنھیں فن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان لوگوں نے مرثیہ گوئی کو اختیار کیا۔ اس مرثیہ گوئی کی بدولت اور

مرثیہ کے احترام کی وجہ سے وہ لوگ اعتراضات سے محفوظ رہتے تھے۔ اکثر و بیشتر گویوں کو اس دینی خدمت کی بدولت اچھا خاصا مالی فائدہ بھی پہنچتا رہتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے اساتذہ اور صاحبانِ فن نے ان کی نسبت یہ جملہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جس نے دھیرے دھیرے مثل کی صورت اختیار کر لی۔ ایک عرصہ تک یہ مثل اسی طرح بولی جاتی رہی۔ جب وہ دور آیا کہ جس میں یہ مثل اپنے حقیقی معنی میں بولی جانے کے قابل نہیں رہی یعنی دورِ انیس و دبیر، عشق و تعشق میں تو ایک جملہ کا اضافہ اور کیا گیا۔ ''بگڑا گویا سوز خواں''۔ بعض حضرات نے ''سوز خواں'' کے بجائے ''مرثیہ خواں'' بھی لکھا ہے جو غلط ہے اور معنی میں دل کھول کر اجتہاد کیا ہے۔

بگڑا شاعر مرثیہ گو، بگڑا گویّا سوز خواں

دیکھیے : بگڑا شاعر مرثیہ گو۔

بگلے کا شکار مکھن سے

بگلے کو مکھن سے پکڑنا۔ کسی کام کو بے ڈھنگے پن یا احمقانہ انداز میں کرنے کے محل پر یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے یہ ایک چھوٹی سی حکایت ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک شکاری پرندوں کو پکڑنے کیلئے نکلا۔ کسی تالاب میں بہت سے بگلے تھے۔ ایک بگلے کو پکڑنے کے لیے اس نے بگلے کے سر پر مکھن رکھ دیا تا کہ دھوپ سے مکھن پگھل کر بگلے کے سر سے بہنے لگے اور بہہ کر اس کی دونوں آنکھوں میں پہنچ جائے جس سے وہ اندھا ہو جائے۔ اندھا ہونے کے بعد شکاری اس کو آسانی سے پکڑ لے۔

بلائے طویلہ، بر سر میموں

دیکھیے : طویلے کی بَلا بندر کے سر۔

بلی کو پہلے ہی دن مارنا چاہیے

دیکھیے گُربہ کشتن روزِ اول۔

بلی کو مارا تو سب نے دیکھا، بلی نے دودھ گرایا تو کسی نے نہیں دیکھا

اندرونی باتوں کو جانے بغیر صرف ظاہری باتوں کو دیکھ کر یا سن کر اگر کسی کو قصوروار ٹھہرایا جائے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔اس میں حکایت یہ ہے کہ:

حکایت: ایک شخص کی پالتو بلی نے اس کا تمام دودھ گرادیا۔اس پر وہ بلی کو مارنے دوڑا۔بلی بھاگ کر باہر چلی گئی۔وہ شخص بلی کا پیچھا کرتا ہوا باہر پہنچ گیا اور بلی کو پکڑ کر مارنے لگا۔بلی کو پٹتے دیکھ کر محلے کے کچھ لوگ وہاں جمع ہو گئے اور اس شخص کو برا بھلا کہنے لگے۔کسی نے کہا:

''اے بھئی بے منہ کے جانور کو کیوں مارتے ہو؟''

کسی نے کہا:

''اس جانور نے تمہارا ایسا کیا بگاڑا ہے جو اتنی بری طرح پیٹ رہے ہو۔''

غرض جس کے منہ میں جو آیا بلی کی ہمدردی اور اس شخص کی برائی میں کہتا رہا۔آخر کار جھنجھلا کر اس نے ان لوگوں سے کہا:

''بلی کو مارا تو سب نے دیکھا، بلی نے دودھ گرایا تو کسی نے نہیں دیکھا۔لہٰذا اسے مارنے کی وجہ کو کوئی نہیں جانتا ہے۔اسی لیے تم سب مجھے برا بھلا کہہ رہے ہو اور بلی کی ہمدردی کر رہے ہو۔''

بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟

ظالم سے بچاؤ کے انتظام کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا۔یہ کہاوت ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب ہر شخص ظالم کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر تو بتائے مگر اس کے خلاف قدم اٹھانے کی کسی میں ہمت نہ ہو۔اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت مشہور ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی جگہ بہت سے چوہے تھے وہاں ایک ظالم بلی بھی تھی جو روزانہ کئی چوہوں کو اپنی خوراک بنالیا کرتی تھی۔روز بروز چوہوں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی۔بلی کے ظلم سے تنگ آکر ایک روز چوہوں نے پنچایت کی۔تمام چوہے آپس میں غور وفکر کرنے لگے کہ بلی سے جان بچانے کی تدبیر کی جائے۔بلی ہر روز ہم میں سے کچھ چوہوں کو کھا جاتی ہے۔اگر ایسا ہی رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہماری نسل ہی ختم

ہو جائے گی۔ کئی چوہوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق بلی کے ظلم سے بچاؤ کی تدابیر پیش کیں۔ ایک چوہے نے کھڑے ہو کر کہا:

''بھائیو! میرے خیال سے بہترین تدبیر یہ ہے کہ ہم لوگ کہیں سے ایک گھنٹی حاصل کر لیں اور اسے بلی کے گلے میں باندھ دیں۔ بلی جہاں جائے گی، گھنٹی بجے گی۔ ہم لوگ بلی سے ہوشیار رہیں گے۔''

یہ تدبیر تمام چوہوں کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ تالیاں بجانے لگے اور مارے خوشی کے جھوم اٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھا اور تجربہ کار چوہا کھڑا ہوا اور تمام چوہوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

''تجویز بہت اچھی ہے۔ میری سمجھ میں بھی آ گئی ہے۔ میں تمہاری لیاقت اور ذہانت کی داد دیتا ہوں مگر ہم چوہوں میں سے ایک بھی ایسا ہے جو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے؟''

بوڑھے چوہے کی یہ بات سن کر سب خاموش ہو گئے۔ اب کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ سب سکتہ کے عالم میں تھے۔ سب ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں:

''بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟''

تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے ہر چوہا وہاں سے کھسکنے لگا اور پنچائت بغیر کسی نتیجے کے ٹائیں ٹائیں فش ہو گئی۔

بَنج کریں گے بانیے اور کریں گے رِیس، بَنج کیا تھا جاٹ نے رہ گئے سَو کے تیس

بنج یعنی تجارت کرنا بنیوں ہی کا کام ہے۔ دوسرے لوگ دیکھا دیکھی میں یا مقابلہ کی غرض سے تجارت کر بیٹھتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی شخص اپنا پیشہ چھوڑ کر دوسرے کا پیشہ اختیار کرے اور اس میں اس کو نقصان ہو۔ مطلب یہ کہ ہر شخص کو اپنا پیشہ کرنا چاہئے دوسروں کی ریس یا دیکھا دیکھی کام کرنے سے نقصان ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے یہ حکایت مشہور ہے:

حکایت: ایک جاٹ اور ایک بنیے میں بہت دوستی تھی۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ جاٹ کاشتکاری کرتا تھا اور بنیا لین دین کے علاوہ بَنج بیوپار بھی کرتا تھا۔ جاٹ کو کھیتی باڑی میں کبھی فائدہ ہوتا

اور کبھی نقصان اور کبھی معمولی فائدہ۔ اس کے خاندان کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ اس کے برعکس بنیا روز بروز خوش حال ہوتا جاتا تھا۔ جاٹ نے ایک دن سوچا کہ بنیا سوداگری سے خوش حال ہوتا جارہا ہے اور میری مالی حالت روز بہ روز بگڑتی جارہی ہے۔ اس نے بھی سوداگری کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے دوست بنیے سے مشورہ کیا کہ وہ کس چیز کی تجارت کرے جس ۔سے اس کی بھی مالی حیثیت بہتر ہو جائے۔ بنیے نے مشورہ دیا کہ نزدیک کے جنگل میں ببول کا گوند بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے اور آس پاس کے گاؤں والوں سے سستا مل جاتا ہے۔ میں تو ایک آنہ سیر خریدتا ہوں اور عام طور سے چار آنے سیر بیچ ڈالتا ہوں۔ تم بھی گوند خرید لیا کرو۔ خاصا نفع مل جایا کرے گا۔ جاٹ نے بنیے کی صلاح مان لی اور ایک سو روپے کا گوند خرید کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ منتظر رہا کہ کوئی تھوک کا گاہک آئے تو اس کے ہاتھ تمام گوند فروخت کردوں۔ ادھر بنیا گوند کو خرید کر اکٹھا کرتا اور جب کسی شہر جاتا تو گوند کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ منڈی میں اس وقت گوند کا جو بازار بھاؤ ہوتا اسی بھاؤ پر فروخت کر دیتا۔

جاٹ بنیے کے تجارتی ہتھکنڈوں سے ناواقف تھا۔ وہ اپنے گوند کو اپنے گھر ہی میں رکھے رہا اور تھوک خریدار کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اسے کوئی گاہک نہ ملا۔ کچھ دنوں کے بعد برسات کا موسم آ گیا۔ پانی برسنے سے گوند خراب ہو گیا اور گوند کا بازار بھی مندا پڑ گیا یعنی گوند کم قیمت پر بکنے لگا۔ جاٹ نے جب اپنے دوست بنیے سے گوند خراب ہو جانے کی بات بتائی تو بنیے نے کہا اور بارش ہونے سے گوند بالکل خراب ہو جائے گا۔ لہٰذا اس وقت جس قیمت میں بکے فوراً فروخت کر دینے ہی میں عافیت ہے۔ جب گوند کا کوئی خریدار نہ ملا تو مجبوراً جاٹ نے اپنے اسی بنیے دوست کے ہاتھ سو روپے میں خریدا گیا گوند صرف تیس روپے میں بیچ ڈالا۔ اس طرح جاٹ کو نفع کے عوض نقصان اٹھانا پڑا یعنی سو روپے قیمت کے گوند کے صرف تیس روپے ہی ہاتھ لگے۔

بندر بانٹ، آپسی جھگڑے کا نتیجہ

آپسی جھگڑے میں نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب فریقین کے درمیان باہمی جھگڑا ہو اور دونوں کو نقصان اٹھانا پڑے۔ لوگوں کے جھگڑے میں انصاف کے نام پر اپنا کام بنانے والے کے لیے بھی اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ اور مشہور کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک دن دو بلیاں کسی کے گھر میں داخل ہوئیں۔ کھانے کی تلاش میں گھر کے اندر اِدھر اُدھر پھرتی رہیں۔ انہیں کچھ کھانے کو نہ ملا۔ دونوں باورچی خانے میں پہنچیں۔ تمام چیزیں نعمت خانے میں بند تھیں۔ اتفاق سے ایک ڈلیا میں ایک روٹی رکھی ہوئی تھی۔ ایک بلی اسے لے کر بھاگی۔ دوسری بلی نے اس کا پیچھا کیا۔ ایک درخت کے نیچے پہنچ کر دونوں جھگڑا کرنے لگیں۔ دونوں کی چھینا جھپٹی میں روٹی نیچے گر گئی تھی۔ اب دونوں نے اپنے جسم کے بال کھڑے کیے، جسم کو پھلایا، گردنوں کو قدرے آگے کیا۔ ان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ دونوں نے غرا غرا کر ایک دوسرے پر اپنی طاقت کا اظہار کیا اور رعب جمانے کی کوشش کی لیکن اپنا حق لینے کی کوشش میں نہ تو کوئی کسی سے دبی اور نہ پیچھے ہٹی۔ آخر کار گتھم گتھا کی نوبت آ گئی۔ درخت پر ایک بندر بیٹھا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس فکر میں تھا کہ دونوں لڑتے لڑتے تھک جائیں تو میں دخل دے کر کسی طرح اس روٹی کو حاصل کر کے اپنی بھوک مٹالوں۔ چنانچہ موقع دیکھ کر وہ نیچے اترا اور بلیوں سے کہنے لگا:

> ''تم دونوں ایک ہی نسل کی ہو اور ضرورت مند بھی ہو۔ تمہیں روٹی کے روپ میں خوراک بھی حاصل ہوگئی ہے مگر لالچ اور خود غرضی نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ انصاف کو بھول گئیں۔ تم دونوں اگر اس روٹی کو برابر بانٹ لیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ تم تو رات دن گھروں کے اندر جاتی ہو اور وہاں سے خوراک حاصل کر کے اپنا پیٹ بھر لیتی ہو۔ ہمیں دیکھو کہ کسی کے گھر نہیں جاتے۔ ہم بندروں کی فوج جنگلوں میں رہتی ہے۔ بچے بھی ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی کسی کو مارتا نہیں۔ آپس میں لڑتا جھگڑتا نہیں۔ ایک ہی درخت پر کئی بندر رات گزار دیتے ہیں۔ اگر آپس میں کبھی تھوڑی بہت ناراضگی ہو بھی گئی تو پنچ فیصلہ کر دیتے ہیں۔ یہاں بیچ راستے میں لڑ کر اپنی بدنامی کرا رہی ہو۔ اگر تمہاری آواز سن کر کوئی کتا آ گیا تو وہ روٹی بھی ہڑپ کر جائے گا اور تم دونوں کی بری گت بھی کرے گا۔''

بلیاں بندر کی سمجھ داری اور انصاف کی باتوں سے بہت متاثر ہوئیں اور کہنے لگیں:

> ''واقعی ہم سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ آپ اوپر تشریف رکھتے ہیں۔ اب آپ ہی ہمارا انصاف کر دیں۔''

بندر کسی گھر سے ایک ترازو اٹھا لایا۔ اس نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا کچھ چھوٹا تھا اور دوسرا کچھ بڑا۔ دونوں ٹکڑوں کو ترازو کے ایک ایک پلڑے میں رکھا اور تولنے لگا۔ جس ٹکڑے کا وزن زیادہ

تھا۔ اسے پلڑے سے اٹھایا۔ دانت سے تھوڑا سا کاٹا اور کھا گیا۔ دوبارہ تولنے پر اب دوسرا ٹکڑا زیادہ ہو گیا تھا۔ اس نے اب دوسرے ٹکڑے کو بھی دانت سے کاٹا اور کھا گیا۔ بندر اسی عمل کو دہراتا رہا اور بلیاں انصاف کی منتظر رہیں۔ آخر میں ایک چھوٹا سا ٹکڑا رہ گیا۔ بندر نے بلیوں سے کہا:

''اب اس سے کیا مزید ٹکڑے کروں۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے سے تمہارا کیا بھلا ہوگا۔ تمہاری نیت کی خرابی نے پہلے ہی سارا کام بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ ہمدردی کی اور اتنی دیر محنت سے تولتا رہا۔ کب سے ترازو کو اٹھائے ہوں مگر دونوں ٹکڑوں کے وزن کو برابر نہ ہونا تھا نہ برابر ہوئے۔ اب تو میرے ہاتھ بھی تھک گئے ہیں۔ چلو! یہ ٹکڑا ہی میری مزدوری میں دے دو تو میرا بھی بھلا ہو جائے۔''

یہ کہہ کر بندر نے وہ ٹکڑا بھی کھالیا اور کہنے لگا:

''آج سے میل ملاپ کا سبق یاد رکھنا۔''

دونوں بلیوں نے ایک دوسرے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور یہ کہہ کر اپنا اپنا راستہ لیا۔

''بندر بانٹ، آپسی جھگڑے کا نتیجہ''۔

بندر کا کام بڑھئی گیری نہیں

دیکھیے: کارِ بوزینہ نیست نجاری۔

بندگی ایسی اور انعام ایسا

اگر کوئی شخص کسی کی بھلائی کرے اور اس کے عوض اس کو برا بھلا کہا جائے یا سزا دی جائے تو اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کا استعمال ایسے موقع پر بھی کرتے ہیں جب کوئی شخص کوئی بڑا کام کرے اور اسے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت بیان کی جاتی ہیں۔ جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک بار ایک برہمن کسی بادشاہ کے دربار میں گیا اور تین بار سلام یا بندگی کرنے کے بجائے صرف ایک بار ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جب کہ اس دربار کا اصول تھا کہ بادشاہ کے دربار میں جو بھی حاضر ہوگا اور وہ جھک کر اور ہاتھ کو اپنی پیشانی تک لے جا کر تین بار سلام کرے گا۔ سلام کرنے کے بعد

دست بستہ نیچی نظر کر کے بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوگا۔ برہمن کے ایک بار سلام کرنے پر بادشاہ نے اپنی بے عزتی محسوس کی اور فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس بدتمیز اور دربار کے آداب سے ناواقف برہمن کو میرے سامنے تین طمانچوں کی سزا دی جائے۔ برہمن جو انعام واکرام کی لالچ میں بادشاہ کے دربار میں گیا تھا، اپنے دل میں سوچنے لگا:

''بندگی ایسی اور انعام ایسا''۔

بن کے گئے فقیر، پوری ملی نہ کھیر

جب کوئی شخص کسی جگہ بڑی امیدوں کے ساتھ جائے اور اس کے برعکس وہاں اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جائے یا پھر اس کی بے عزتی کی جائے تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے:

کہاوت: ایک زمانہ تھا جب لوگ فقیروں اور درویشوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ انہیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی تعظیم وتوقیر اور خاطر ومدارات کو لوگ اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ انہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر ایک شخص فقیر بن کر کسی کے یہاں دعوت میں جا پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ فقیر سمجھ کر اس کی خاطر ومدارات کریں گے اور پرلطف کھانے کھلائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ لوگ تو دعوت میں بہترین بہترین کھانے کھا رہے تھے۔ اسے کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے بھگا بھی دیا۔ گھر کی طرف بھوکا لوٹتے ہوئے وہ اپنے آپ سے گویا ہوا:

''بن کے گئے فقیر، پوری ملی نہ کھیر''۔

بنیے کا بہکایا اور جوگی کا پھٹکارا

بنیوں کے بہکاوے اور درویشوں کی بددعا سے بچنا مشکل ہے۔ بنیا کس طرح بہکاتا ہے اس سے متعلق ایک کہانی اس طرح ہے:

حکایت: ایک شخص کو کہیں سے ایک اشرفی مل گئی۔ وہ اسے بیچنا چاہتا تھا۔ خریدار کی تلاش میں وہ ایک بنیے کے پاس گیا اور اشرفی دکھا کر بیچنے کی خواہش ظاہر کی۔ بنیا اسے سستے دام میں خریدنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اشرفی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اس کے دام پانچ روپے لگائے۔ جب وہ شخص اتنے کم دام پر بیچنے کے لیے راضی نہ ہوا۔ تب بنیے نے چھ روپے دام لگائے اور جب اس پر بھی وہ راضی نہ ہوا تو بڑھتے بڑھتے

اس کے دام چودہ روپے تک لگا دیئے۔اب اس شخص نے سوچا اشرفی کی قیمت زیادہ ہوگی تبھی چودہ روپے تک اس نے لگا دیے ہیں۔اس نے بنیے سے کہا:

''میں صراف کو دکھائے بغیر نہیں بیچوں گا۔''

بنیے نے اس کا یہ رخ دیکھ کر ہمدردی جتاتے ہوئے کہا:

''ویسے تو یہ تیس روپے کا مال ہے اس سے کم قیمت میں کسی کے ہاتھ نہ بیچنا۔''

اب اس شخص کے دماغ میں اشرفی کی قیمت تیس روپے بیٹھ چکی تھی۔وہ سارا دن پورے بازار میں اشرفی کو بیچنے کیلئے گھومتا پھرتا مگر اس اشرفی کو تیس روپے تو کیا دس روپے میں بھی خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔آخر مایوس ہوکر پھر اسی بنیے کے پاس گیا اور چودہ روپے ہی میں اس کے ہاتھ فروخت کر دی۔

بنیے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے

سیانا آدمی کسی خاص نفع کی امید میں اپنا نقصان کرتا ہے۔اس کہاوت کے پس منظر میں دو حکایات ہیں۔پہلی حکایت اس طرح ہے:

حکایت ۱: بھرے بازار میں کسی جگہ ایک روپیہ پڑا ہوا تھا۔بھیڑ کی وجہ سے اب تک کسی کی نظر اس پر نہ پڑ سکی تھی۔اتفاق سے بنیے کا ایک نوجوان لڑکا بھی اس کے قریب سے گزرا۔اس کی نگاہ اس روپے پر پڑ گئی۔اس نے سوچا اگر میں اسے جھک کر اٹھاتا ہوں تو بھیڑ بھاڑ ہے لوگ اٹھاتے دیکھ لیں گے۔ہوسکتا ہے کوئی یہ بھی کہہ دے کہ یہ روپیہ میرا ہے۔یہ سوچ کر وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا، دھکم دھکا کرتا ہوا اس جگہ پر جا کر گر پڑا جہاں روپیہ پڑا ہوا تھا۔اس نے گرتے ہی وہ روپیہ لوگوں کی نظروں سے بچ کر اٹھا لیا مگر بھیڑ میں دو ایک لوگوں نے دیکھ ہی لیا اور کہا:

''بنیے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے''۔

حکایت ۲: ایک بنیے کا بیٹا اپنے سر پر تیل سے بھری ہانڈی اپنے سر پر رکھ کر اپنی دوکان کی طرف آرہا تھا کہ چلتے چلتے راستے میں گر پڑا۔تیل کی ہانڈی ٹوٹ گئی اور سارا تیل زمین پر پھیل گیا۔لوگ اس کے پاس پہنچ گئے اور ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔کچھ لوگ اس کے باپ کے پاس گئے اور افسوس کے ساتھ لڑکے کے گرنے اور تیل کی ہانڈی ٹوٹنے کی اطلاع دی۔بنیے نے ان لوگوں سے کہا:

''اس میں افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے نے

راستے میں کوئی اتنی قیمتی چیز پڑی دیکھی ہوگی جس کی قیمت تیل اور ہانڈی سے زیادہ ہوگی۔"

آخر کو معلوم ہوا کہ اس لڑکے نے راستے میں ایک اشرفی پڑی ہوئی دیکھی تھی اس لیے وہ وہاں گر پڑا تھا۔ تا کہ اشرفی اٹھاتے ہوئے اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ لوگوں نے کہا:

"سچ ہے بنیے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔"

بوجھ کیا! چکی کا پاٹ

دعویٰ علم و عقل کے باوجود بے وقوفی کرنا۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر کہی جاتی ہے جب کوئی شخص واقعی عالم و عاقل ہو یا اپنے کمال اور علم و ہنر کا دعویٰ کرنے کے باوجود بیوقوفی کا کام کرے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کسی بادشاہ نے اپنے شہزادے کو ایک نجومی کے سپرد کیا کہ اس کو خوب اچھی طرح علم نجوم پڑھاؤ۔ چنانچہ استاد نے نہایت محنت، توجہ اور شفقت سے شہزادے کو علم نجوم پڑھانا شروع کردیا۔ ساتھ میں نجومی کا لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ ایک سال کے بعد جب دونوں پڑھ لکھ کر فارغ ہو گئے تو بادشاہ نے امتحان کی تاریخ مقرر کی۔ شہزادہ اور اس کا ہم سبق استاد زادہ دربار میں بلائے گئے۔ بھرے دربار میں بادشاہ نے اپنی مٹھی میں سونے کی انگوٹھی چھپا کر اپنے بیٹے سے پوچھا:

"بتاؤ! ہمارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

شہزادے نے نجوم کے قاعدے کے مطابق حساب لگا کر بتایا:

"کہ آپ کے ہاتھ میں کوئی گول چیز ہے۔ جس کا رنگ سنہرا ہے، بیچ میں خالی ہے۔ معدنیات کی قسم سے ہے۔"

بادشاہ بہت خوش ہوا کہ اس کے بیٹے نے علم نجوم میں اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی ہے۔ اس کے بعد اس نے شہزادے سے پھر سوال کیا:

"اس چیز کا نام بتاؤ جو میری مٹھی میں ہے۔"

اس پر شہزادے نے کہا:

"آپ کی مٹھی میں چکی کا پاٹ ہوگا۔"

بادشاہ اور حاضرین یہ جواب سن کر حیران رہ گئے۔

اب معلم کے لڑکے کا نمبر آیا۔ بادشاہ نے اس سے بھی یہی سوالات کیے:

''بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے؟''

اس نے بھی وہی سب علامات بتائیں جو شہزادے نے بتائی تھی۔ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا:

''اس چیز کا نام کیا ہے جو میری مٹھی میں ہے۔ معلم کے لڑکے نے کہا:

''سونے کی انگوٹھی ہے۔''

بادشاہ نے دربار میں نجومی کو بلایا اور برہم ہو کر کہا:

''یہ کیا معاملہ ہے کہ تم نے اپنے بیٹے کو تو مکمل علم دے دیا ہے اور شہزادے کو ناقص رکھا ہے۔''

نجومی نے عرض کیا:

''جہاں پناہ! مجھ میں جتنا علم تھا وہ میں نے دونوں کو برابر سکھلایا بلکہ شہزادے کو خاص توجہ اور محنت سے سکھایا ہے۔ آپ نے ملاحظہ بھی فرمایا کہ جہاں تک علم کا سوال ہے دونوں نے علم نجوم کے مطابق آپ کی مٹھی میں بند چیز کی علامات صحیح صحیح بتائی ہیں۔ اب عقل کو میں کیا کروں۔ یہ پڑھانے کی چیز نہیں۔ ہر شخص مختلف طبیعت اور مختلف ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ علم نے سونے کی انگوٹھی سے متعلق تمام تفصیلات بتا دیں۔ مٹھی میں انگوٹھی آسکتی ہے یا چکی کا پاٹ۔''

بوڑھا کتا بانچے سون، لگی ہے تو مارے گا کون؟

بوڑھا کتا شگن دیکھ کر کہتا ہے کہ گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں لیکن سانکل یا زنجیر نہیں چڑھائی گئی ہے۔ نہایت کاہل اور سست لوگوں کے لیے اس کہاوت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کہاوت سے متعلق ایک حکایت اس طرح ہے:

حکایت: کاہلوں کے ایک گھر میں محلے کے کتے گھس کر کھانے پینے کی چیزوں کو نہ صرف کھا پی جاتے تھے بلکہ برباد بھی کر دیتے تھے۔ کتوں کی اس حرکت سے تنگ آ کر گھر کے مالک نے پھاٹک لگوا دیا۔ پھاٹک لگا دیکھ کر کتوں کو فکر ہوئی اور انہوں نے ایک پنچائت یہ سوچنے کے لیے کی کہ اب ہم لوگوں کا پیٹ

کیسے بھرے گا؟ کئی کتوں نے اپنی عقل کے موافق تجاویز رکھیں۔ ایک تجربہ کار اور بوڑھا کتا کھڑا ہو کر کہنے لگا:

''آپ لوگ فکر بالکل نہ کریں میں شگن سے بتاتا ہوں کہ پھاٹک تو بند کر دیا گیا ہے مگر ابھی سانکل یا زنجیر نہیں چڑھائی گئی ہے کیوں کہ اس گھر کا ہر فرد ایک دوسرے سے کاہلی اور سستی میں بڑھا ہوا ہے۔ اس لیے ہم لوگ پہلے ہی جیسے بے فکر ہو کر کھا پی سکتے ہیں۔''

سبھی کتے خوش ہو کر جھومنے لگے۔

بہت ٹیڑھی کھیر ہے

دیکھیے: ٹیڑھی کھیر ہے۔

بہت گھمنڈ لنکا ڈھائے

غرور اور گھمنڈ کرنے والے شخص کو ایک نہ ایک دن نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں لنکا کے راجا راون کے غرور کی کہانی بہت مشہور ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: زمانہ قدیم میں سونے کی لنکا پر کبیر کا قبضہ تھا۔ کبیر کے پاس سونے، چاندی، ہیرے جواہرات اور دولت کے بے شمار خزانے تھے۔ راون، کبیر کا پیدائشی دشمن تھا۔ اس نے کبیر کی دولت کو دیکھ کر قسم کھائی کہ میں بھی کبیر کی طرح دولت مند اور لنکا کا راجا بن کر ہی دم لوں گا۔ لہٰذا وہ اپنے دونوں بھائیوں کنھ کرن اور وِبھیشن کو ساتھ لے کر تپسیا کرنے لگا۔ دس ہزار سال تک تپسیا کرنے کے بعد بھی جب اس کی مراد پوری نہ ہوئی تو اس نے اپنے دسوں سر کاٹ کر آگ میں ڈال دیئے۔ تب برہما نے خوش ہو کر دعا دی کہ دیتیہ، دانو، یکچھ وغیرہ تمہیں کبھی مار نہ سکیں گے۔ راون اس دعا سے غرور اور گھمنڈ سے پھول گیا۔ اس نے لنکا کے راجا کبیر کو شکست دے کر لنکا پر قبضہ کر لیا اور خود راجا بن بیٹھا۔ کبیر لنکا چھوڑ کر کیلاش پہاڑ چلے گئے۔ برہما کی دعا کے اثر سے راون نے تینوں لوک فتح کر لئے اور اِندر، یم وغیرہ کو بھی شکست دے دی۔ تینوں لوک فتح کرنے کے بعد راون اور بھی مغرور اور گھمنڈی ہو گیا۔ اس کا ظلم بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر ایک کو ستانے لگا تھا۔ یہاں تک کہ نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا بھی کرنے لگا تھا۔ ایک مرتبہ سہس ترارجن نے راون کو جنگ میں ہرا کر قید کر لیا تھا مگر پُلستیہ کے کہنے پر چھوڑ دیا تھا۔ بالی نے بھی ایک بار راون کو

شکست دی تھی۔ جس وقت رام چندر جی اپنے بھائی لکچھمن اور بیوی سیتا کے ساتھ ڈنڈ کارنیہ میں بَنباس کی مدت گزار رہے تھے۔ اس وقت یہ سیتا کی خوبصورتی کے چرچے سن کر گھمنڈ سے چور اس جنگل میں بھکاری کے بھیس میں آیا اور اکیلا پا کر چھل کپٹ سے سیتا کو اٹھا کر لنکا لے گیا۔ جب رام چندر جی کو خبر ہوئی تو انہوں نے بندروں کی فوج لے کر سمندر پر پل بنا کر لنکا پر چڑھائی کر دی۔ جنگ میں مغرور راون اور اس کے ساتھی مارے گئے۔ رام نے لنکا کی حکومت راون کے بھائی وِبھیشن کے سپرد کی اور سیتا جی کو اپنے ساتھ لے کر اجودھیا آئے۔ اس طرح مغرور اپنے انجام کو پہنچا۔

بھُس میں چنگی ڈال بی جمالو دور کھڑیں

جو شخص دوسروں کو لڑوا کر خود علیحدہ ہو جائے اور تماشہ دیکھے، ایسے شخص کیلئے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں بی جمالو نامی عورت کا کردار ہے جو لگائی بجھائی کر کے لوگوں کو آپ میں لڑا دیا کرتی تھی اور خود الگ ہو کر تماشہ دیکھتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ اودھ کی رہنے والی تھی۔ اسے لوگوں کو آپس میں لڑوانے میں مزہ آتا تھا۔ اس کی انہیں حرکتوں کی وجہ سے یہ کہاوت وجود میں آئی اور مشہور ہو گئی۔

بھک منگے نے پیر پھیلائے

جب کوئی شخص پہلے کسی سے تھوڑی سی مدد مانگے اور بعد میں دھیرے دھیرے اپنی تمام ضروریات پوری کر لے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک بھکاری، کھانا، کپڑا اور مکان کی تلاش میں کسی امیر شخص کے یہاں گیا۔ سب سے پہلے اس نے گھر میں بیٹھنے کی اجازت لی۔ اس کے بعد اس نے کہا:

''میں کئی دن کا بھوکا ہوں اگر کچھ کھانے کو مل جائے تو میری بھوک مٹے اور آپ کو ثواب ملے۔''

امیر شخص نے اسے کھانا کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد بھکاری نے کہا:

''آپ بڑے خدا ترس اور رحم دل ہیں۔ غربا پروری میں آپ کا ثانی نہیں، میں

غریب الوطن ہوں۔ میرا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ ایک بسواز مین بھی نہیں ہے۔ اگر حضور رہنے کیلئے گھر کا ایک کونا عطا کردیں تو میرا رویاں رویاں آپ کو دعا دے گا۔"

امیر شخص نے ترس کھا کر رہنے کے لیے جگہ فراہم کردی۔ اس طرح بھکاری نے دھیرے دھیرے اپنی ضروریات کی تمام چیزیں حاصل کرلیں۔

بھیرویں ہے تو ہماری بھی واہ

جب کوئی شخص کسی چیز کی ناواقفیت پر واقفیت کا فخریہ اظہار کرے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ بالکل غافل اور انجان کے متعلق کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس بات سے خوش ہو کہ اس کی ہی مرضی کی بات ہو رہی ہو بھلے ہی وہ اس سے ناواقف ہو تو بھی اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی گاؤں کے زمیندار نے ایک مشہور طوائف کو ناچ گانے کے لیے بلایا۔ رات کو کھانا کھا کر اور گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر گاؤں کے بہت سے شوقین جمع ہوگئے۔ طوائف نے پہلے حمد، نعت، کرشن بھکتی اور رام بھکتی کے گیت گائے۔ پھر غزلیں شروع کیں۔ جن کی سمجھ میں آرہا تھا وہ خوب داد دے رہے تھے۔ جو نہیں سمجھ رہے تھے وہ گانے کی آواز اور ناچنے کے ڈھنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جو پیسے والے تھے انہوں نے فرمائشی گانوں پر انعام دینا شروع کیا۔ گاؤں کے مکھیا اور کسانوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی طوائف کو روپے دینے شروع کردیئے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی آواز سنائی دینے لگی۔

ایک طرف کچھ گنوار بھی بیٹھے تھے۔ ان میں ایک تھوڑا بہت واقف کار بھی تھا۔ زمیندار کے یہاں اٹھنے بیٹھنے سے تہذیب کی کچھ باتیں سیکھ گیا تھا۔ وہ طوائف کے گانوں کا مطلب اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا جاتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"تم لوگوں کو جو گانا پسند ہو بتاؤ۔ ہم اس طوائف تک تمہاری فرمائش پہنچادیں وہ ضرور گائے گی"

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے:

"اس میں کیا ہرج ہے ایک گانا اپنی پسند کا بھی رہے۔"

ہمت کرکے ایک گنوار نے کہا:

''اس سے کہو بھیرویں گائے رات گزر رہی ہے۔''

لہٰذا طوائف سے بھیرویں گانے کے لیے کہا گیا۔ طوائف اس وقت بھیرویں ہی گا رہی تھی۔ اس نے کہا:

''میں اس وقت بھیرویں ہی گا رہی ہوں۔''

واقف کار گنوار نے اپنے دوست سے کہا:

''یار وہ تمہارے دل کی بات پہلے ہی سمجھ گئی اور کہہ رہی ہے میں تو اس وقت بھیرویں ہی گا رہی ہوں۔''

گنوار کھڑا ہو گیا اور طوائف کو ایک روپیہ انعام دے کر بولا:

''اگر بھیرویں ہے تو ہماری بھی واہ''۔

اس پر سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔

بھے کا بھوت، شک کی ڈائن

وہم اور شک دونوں نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ دراصل بھوت اور ڈائن کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ صرف انسان کا وہم اور شک ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں کئی کہانیاں ہیں جن میں سے دو بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں:

کہانی ۱: پہلی کہانی یہ ہے کہ رات کو لیٹتے وقت ایک بنیے کی بیوی اپنے شوہر کی چارپائی کے نیچے آب دست کے لیے ایک لوٹا پانی بھر کر رکھ دیتی تھی۔ بنیا روز صبح اس لوٹے کو لے کر پاخانہ کے لیے چلا جاتا تھا۔ دیوالی سے ایک روز قبل بنیے کی لڑکی نے ایک لوٹے میں گیرو گھول کر باپ کی چارپائی کے نیچے رکھ دیا تاکہ گیرو رات بھر میں ٹھیک سے گھل جائے اور وہ صبح اٹھ کر دیوار میں گاڑے یعنی گھلے ہوئے گیرو سے دیوالی کے موقع پر گھر کی دیواروں پر بیل بوٹے وغیرہ بنائے۔ رات کو لیٹتے وقت جب بنیے کی بیوی لوٹے میں پانی لے کر چارپائی کے نیچے رکھنے آئی تو اس نے دیکھا ایک لوٹا پہلے ہی سے بھرا ہوا رکھا ہے۔ سمجھی کہ آج اس کی بیٹی پانی بھر کر رکھ گئی ہے۔ بنیا جب صبح سو کر اٹھا تو اس نے چارپائی کے نیچے سے لوٹا اٹھایا اور پاخانہ کرنے چلا گیا۔ اس نے گیرو کے اسی گھول سے آب دست کیا۔ آب دست لے چکنے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ سرخ ہیں۔ پاخانہ بھی سرخ ہے اور زمین میں خون ہی خون پھیلا ہوا ہے وہ گھبرا گیا اور

سوچنے لگا کہ اس پر کسی نے جادو کردیا ہے یا پھر کوئی بڑی بیماری ہوگئی ہے۔ گرتا پڑتا گھر آیا اور چارپائی پر لیٹ رہا۔ اس کی بیوی بھی گھبرا گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو بلانے کیلئے کسی کو بھیجا۔ کچھ لوگ جھاڑ پھونک کرانے کے لیے اوجھا کے پاس گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بنیے کی لڑکی جاگ گئی جو اب تک سورہی تھی۔ وہ باپ کی چارپائی کے پاس لوٹا اُٹھانے گئی مگر اس لوٹے کو وہاں نہ پاکر رونے اور چیخنے لگی۔ اس کے رونے کا سبب پوچھنے پر معلوم ہوا کہ جس لوٹے میں اس نے گیرو گھولا تھا اسی سے بنیے نے آب دست کیا ہے۔ اس پر نہ تو کسی نے جادو ٹونا کیا ہے اور نہ اسے کوئی بیماری ہے۔ یہ سن کر بنیا ہوش میں آگیا اور اس کی بیماری جاتی رہی۔

کہانی ۲: دوسری سبق آموز حکایت اس کہاوت کے تعلق سے یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی گاؤں کے کنارے پر ایک پرانا مقبرہ تھا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں ایک بھوت ہے۔ اگر کوئی شخص رات کے وقت اس مقبرہ میں چلا جائے تو پھر وہاں سے واپس نہیں آئے۔ صبح اس کی لاش ہی ملتی ہے۔ اس لیے خوف کے مارے رات کے وقت اس مقبرے کے اندر جانا تو کیا لوگ اس کے قریب سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ ایک نوجوان جو بھوت اور ڈائن وغیرہ کے وجود پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے کہا:

''یہ صرف بھے کا بھوت ہے۔ میں اگر رات کے وقت اس مقبرے کے اندر جا کر واپس آجاؤں تو مجھے کیا انعام ملے گا؟''

اس کے ساتھیوں نے کہا:

''ہم لوگ تم کو دس روپے دیں گے مگر ہم لوگوں کو یہ کیسے پتا چلے گا کہ تم وہاں سے ہو کر لوٹے ہو۔''

صلا مشورے کے بعد یہ تجویز رکھی گئی:

''تم کل بارہ بجے رات کو یہ کیل لے کر مقبرہ کے اندر جاؤ گے۔ اس کیل کو قبر کے سرہانے کی طرف گاڑ کر واپس آجاؤ گے۔ صبح ہونے پر ہم لوگ وہاں جا کر دیکھیں گے۔ اگر کیل گڑی ہوگی تو تمہارا انعام تم کو مل جائے گا اور اگر تم وہاں نہیں گئے تو دس روپے کی مٹھائی منگوا کر ہم لوگوں کو کھلاؤ گے۔''

رات آنے پر وہ کیل لے کر مقبرے کے اندر گیا اور قبر کے سرہانے کی طرف کیل گاڑ دی اور جوں ہی وہاں سے اٹھ کر چلنے لگا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے کُرتے کا دامن پکڑ لیا ہو۔ لاکھ ہمت

کے باوجود نفسیاتی اثر کے سبب اس کے ذہن و دل میں کچھ نہ کچھ خوف تو موجود ہی تھا۔ اب اس کا یہ معمولی خوف یقین میں بدل گیا۔ وہ سمجھا بھوت نے پکڑ لیا ہے۔ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا اور مارے خوف کے حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب مر بھی گیا۔ جب اس کے ساتھی صبح ہونے پر اس کی تلاش میں مقبرے کے اندر گئے تو اس کی لاش پڑی ہوئی تھی اور کرتے کے دامن سے ہوتی ہوئی کیل زمین میں گڑی تھی۔ کیل گاڑتے وقت جلدی میں اس کا دامن بھی کیل کی زد میں آ گیا تھا جو اس کی موت کا سبب ہوا۔

بھیگی بلی ہے

کسی کام کو نہ کرنے کے لیے بہانہ کرنے والا۔ جب کوئی شخص کسی کام کو نہ کرنا چاہے اور لگا تار ٹال مٹول، بے جا انکار اور بہانہ کرے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے۔ جو اس طرح ہے:

حکایت: برسات کا موسم تھا، شام ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لالہ کندن لال نے سرِ شام کھانا کھایا اور چادر اوڑھ کر کوٹھے میں اپنی چار پائی پر لیٹ گئے۔ ان کے ملازم کھچڑو نے چلم بھر کر ان کے پاس رکھ دی۔ لالہ جی نے دو چار کش لگائے اور اونگھنے لگے۔ ان کو نیند آ گئی اور وہ خراٹے لینے لگے۔ لالہ جی کو سوتا دیکھ کر اور خراٹوں کی آواز سن کر کھچڑو میں بھی سستی آ گئی، وہ بھی چادر تان کر سو گیا۔ لالہ جی جب ایک نیند لے کر چونکے تو ان کو چلم کی طلب ہوئی۔ انہوں نے چلم پر ہاتھ رکھا۔ چلم میں اب ٹھنڈی راکھ کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ انہوں نے ملازم کو آواز دی:

"کھچڑو! کھچڑو!!"

کوئی جواب نہ ملا۔ اب لالہ جی نے تیز آواز سے پکارنا شروع کیا:

"ارے کھچڑو! کہاں ہے، سو رہا ہے یا مر گیا۔ بولتا کیوں نہیں"۔

لالہ جی کی تیز آواز سے کھچڑو جاگ گیا اور غنودگی میں بولا:

"لالہ جی میں جاگ رہا ہوں۔ کہیے کیا بات ہے؟"

لالہ جی نے کہا:

"ارے کھچڑو ذرا باہر نکل کے تو دیکھ آسمان پر تارے ہیں کہ نہیں"۔

ملازم نے کہا:

''ایک بھی تارا نظر نہیں آتا۔ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا ہے۔''

لالہ جی نے کہا:

''کھچڑوا ابھی تو بہت رات باقی ہے۔''

کھچڑو بولا:

''جی سرکار ابھی بہت رات باقی ہے۔''

لالہ جی بولے:

''نیند تو اچٹ گئی، اب آنکھ دیر میں لگے گی۔''

کھچڑو نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''جی سرکار! ٹھنڈ جو ہے۔ آرام کیجئے۔''

لالہ جی بولے:

''کھچڑو! ذرا چلم ہی بھر لا۔ ایک دو کش تو لگا لوں۔''

کھچڑوا اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لیٹے ہی لیٹے کہنے لگا:

''اب آگ کہاں رہی ہے۔ سب بجھ کر راکھ ہو گئی ہے۔''

لالہ جی نے کہا:

''کوئی بات نہیں۔ ایک کنڈا لے کر جلا لے۔''

کھچڑو بولا:

''لالہ جی کنڈے تو ضرور جلا لوں مگر پانی برس رہا ہے۔''

لالہ جی نے کہا:

''پانی برسنے کی آواز تو نہیں آ رہی۔''

کھچڑو نے جواب دیا:

''لالہ جی بڑے زور کا پانی پڑ رہا ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں تو جانے کب سے جاگ رہا ہوں۔ ہر طرف کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ دیکھیے کتنا گھنگھور اندھیرا ہے۔''

لالہ جی نے کہا:

''ارے بھیا! ذرا باہر نکل کر تو دیکھ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بارش تھم گئی ہے۔''

کھچڑو بولا:

''اچھا جاتا ہوں''

اور پھر کروٹ بدل کر پڑے پڑے ہی کہنے لگا:

''لالہ جی، اب بھی بوندیں پڑ رہی ہیں۔''

لالہ جی بگڑ کر بولے:

''ارے کھچڑو! یہ کیا بات ہے۔ چارپائی سے اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ میں نے اب تک تیرے اٹھنے کی کوئی آہٹ نہیں سنی۔ تو لیٹے ہی لیٹے باتیں بنائے جا رہا ہے۔ آخر کیا معاملہ ہے۔ تجھے کیسے پتا چلا کہ اب بھی بارش ہو رہی ہے؟''

کھچڑو بولا:

''سرکار میں سچ کہتا ہوں۔ بالکل ابھی ابھی ایک بلی باہر سے میری چارپائی کے نیچے آئی ہے۔ میں نے اس پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو وہ بھیگی ہوئی ہے۔ جس سے پتا چلا کہ بارش ابھی تھمی نہیں ہے۔''

پار اتروں تو بکرا دوں

جب مصیبت میں گھرا ہوا شخص خدائے تعالیٰ، دیوی دیوتاؤں، پیر فقیر کو یاد کرے اور ان کی منت مانے اور مصیبت ٹل جانے پر بھول جائے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح ہے:

حکایت: ایک شخص ناؤ میں بیٹھ کر کسی دریا کو پار کر رہا تھا۔ بیچ دریا میں پہنچتے ہی اچانک زوردار طوفان آ گیا، کشتی سوار گھبرا گیا۔ اس کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ طوفان رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ کسی پیر کا نام لے کر اور گڑگڑا کر کہنے لگا:

''اے پیر بابا! اگر یہ طوفان رک جائے اور میں دریا کے پار سلامت پہنچ جاؤں تو آپ کے نام پر ایک بکرا قربان کر دوں گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد طوفان تھم گیا، اسے کچھ سکون ہوا۔ جان بچتی ہوئی نظر آئی، سوچنے لگا

بکرا تو سو روپے سے کم نہیں ملے گا۔ اگر میں بیس پچیس روپے کی مرغی خرید کر قربان

کردوں تو کیا مضائقہ۔ لہٰذا اب اس نے کہا:

''اے پیر بابا! بکرا تو بہت پیسوں کا ملے گا۔ میں آپ کے نام پر مرغی ضرور قربان کروں

گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ دریا کے پار سلامت پہنچ گیا تو اپنے کپڑے سے ایک جوں نکال کر

ماردی اور کہنے لگا:

''جان کے بدلے جان ہی تو قربان کی ہے۔ بلاوجہ پیسوں کا زیاں کیا معنی؟''

پانچوں پنڈے، چھٹے نراین

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں پانچ بڑے بڑے مشیر ہوں اور وہاں ایک ان سب سے بڑھ

کر مدبر اور تجربہ کار نعمتِ غیر مترقبہ کی طرح آجائے اور جس کے آنے سے کامیابی کی امید بندھ جائے۔

جہاں کئی اعلیٰ اشخاص موجود ہوں وہاں ایک اور دانشور آجائے تو بھی یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے

وجود میں آنے کی نسبت مشہور ہے کہ:

نسبت: پنڈے جنہیں پانڈے بھی کہتے ہیں۔ مہابھارت کی لڑائی کے ہیرو ہیں۔ جن کے نام

ہیں۔ جُدِھشٹر، بھیم سین، ارجن، نگل، سہدیو۔ یہ پانچوں بھائی کوروؤں سے جنگ کر رہے تھے۔ ان

پانچوں کے ساتھ چھٹے نراین یعنی کرشن بھی ہو گئے۔ شری کرشن جی کے مشورہ پر عمل کرنے ہی سے انہیں فتح

حاصل ہوئی اور کوروؤں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

پانڈے جی پچھتائیں گے، چنے کی روٹی کھائیں گے

دیکھیے: پانڈے جی پچھتائیں گے، وہی چنے کی کھائیں گے۔

پانڈے جی پچھتائیں گے، سوکھے چنے چبائیں گے

دیکھیے: پانڈے جی پچھتائیں گے، وہی چنے کی کھائیں گے۔

پانڈے جی پچھتائیں گے، وہی چنے کی کھائیں گے

جب کوئی شخص ہار کر یا مجبور ہو کر وہی کام کرے جو پہلے بہت سمجھانے، منانے پر بھی اپنی ضد کے آگے نہ کیا ہو تو اس وقت یہ کہاوت طنزاً کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے یہ حکایت بیان کی جاتی ہے۔

حکایت: کسی گاؤں میں ایک برہمن رہتا تھا۔ اس کو چنے کی دال یا روٹی قطعی ناپسند تھی۔ ایک بار اس کے گھر میں پکانے کے لیے چنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لہٰذا اس کی بیوی پنڈتائین نے چنے کی دال اور روٹی پکائی۔ پنڈت جی نے جب کھانے کے لیے چوکے پر آگئے تو چنے کی دال اور روٹی دیکھ کر بھر گئے اور ناراض ہو کر باہر چل دیئے۔ بیوی نے انہیں بہت سمجھایا کہ: "گھر میں اس کے علاوہ پکانے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ چلئے آج یہی کھا لیجئے" مگر پنڈت جی بغیر کھائے باہر چلے گئے۔ کچھ وقفہ گزرنے کے بعد ان کی بھوک بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا۔ پنڈت جی کی بھوک بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب پنڈت جی کی بھوک برداشت سے باہر ہو گئی تو پنڈت جی چپ چاپ گھر کے اندر آئے اور چوکے پر جا کر بیٹھ گئے۔ بیوی ان کا مطلب سمجھ گئی۔ بیوی نے ان کے سامنے وہی چنے کی دال اور روٹی پنڈت جی کے سامنے کھانے کیلئے رکھ دی جسے پنڈت جی نے چپ چاپ کھا لیا۔ جب پنڈت جی کھانا کھا چکے تو ان کی بیوی نے ہنس کر کہا: "پانڈے جی پچھتائیں گے، وہی چنے کی کھائیں گے۔"

پانڈے دونوں دین سے گئے

پانڈے جی دونوں طرف سے مارے گئے۔ جب کوئی شخص ایسا کام کرے جس سے وہ ادھر کا رہے نہ اُدھر کا، اس وقت یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے:

حکایت: ایک برہمن مذہب اسلام کے اصولوں سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے سوچا کہ میں نے ہندو دھرم کو چھوڑ کر اور اسلام مذہب کو اختیار کر کے اچھا نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اس نے مذہب اسلام کو چھوڑنے اور دوبارہ ہندو دھرم کو اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے پنڈتوں سے شدھی کرن اور ہندو دھرم میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پنڈتوں نے ہندو دھرم کے اصولوں کے مطابق اسے ہندو دھرم اپنانے کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے وہ مذہب اسلام سے بھی گیا اور ہندو دھرم سے بھی گیا۔ وہ کسی طرف کا نہیں رہا۔ اس طرح پانڈے دونوں دین سے گئے۔

پڑھیں ہیں پر گُڑھے نہیں

علم تو ہے مگر تجربہ نہیں۔ جب پڑھا لکھا شخص اپنی تعلیم کے مقصد کو نہ سمجھے تو کہتے ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ شخص عمل سے کورا ہے، تجربات نہیں رکھتا ہے یا اس کے مشاہدے میں خامی ہے تو بھی یہ مثل کہی جاتی ہے۔

اس مثل کے تعلق سے ایک کہانی بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: ایک نجومی نے اپنے بیٹے کو ایک سال تک علم نجوم کی تعلیم دی۔ جب اس نے علم نجوم میں مہارت حاصل کر لی تو اسے امتحان کے لیے ایک مال دار آدمی کے پاس بھیجا گیا۔ مالدار آدمی نے اپنی مٹھی میں سونے کی انگوٹھی بند کر کے اس سے پوچھا:

"اپنے علم نجوم کے ذریعہ بتاؤ کہ میری مٹھی میں کیا چیز ہے؟"

اس نے حساب لگا کر کہا:

"آپ کی مٹھی میں دھات کی بنی ہوئی کوئی چیز ہے۔ جس میں سوراخ ہے اور وہ گول گول ہے۔ اس میں پتھر بھی ہے۔"

یہ تمام علامتیں بتانے کے بعد وہ خاموش ہو گیا تو مالدار شخص نے کہا:

"مجھے تو صاف صاف اس چیز کا نام بتاؤ جو میری مٹھی میں بند ہے۔"

اس نے کچھ غور کرنے بعد کہا:

"آپ کے ہاتھ میں چکی کا پاٹ ہے۔"

مالدار شخص نے نجومی کو بلا کر کہا:

"تمہارا لڑکا علم نجوم میں ابھی ماہر نہیں ہے۔ اس نے میری مٹھی میں بند انگوٹھی کی نشانیاں تو ٹھیک بتائیں مگر جب اس سے نام پوچھا تو کہنے لگا۔ مٹھی میں چکی کا پاٹ ہے۔"

نجومی نے جواب دیا:

"حضور! یہ پڑھے تو ہیں پر گوڑھے نہیں یعنی یہ تعلیم یافتہ تو ہے مگر تجربہ کار نہیں۔ اس نے کبھی انگوٹھی نہیں دیکھی ہے البتہ گھر کی چکی کا پاٹ ضرور دیکھا ہے۔ انگوٹھی اور چکی کے پاٹ کی بہت سی علامات ایک جیسی ہیں۔ اس لیے اس نے انگوٹھی کے بجائے چکی کا پاٹ، ناواقفیت کی بنا پر ہی کہا ہے۔"

پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل

شریف ہو کر ذلیل کام اختیار کرنے اور بدقسمت ہنرمند یا صاحبِ کمال ہو کر ادنیٰ کام کرنے والے کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ جب کسی صاحب علم کی قسمت بگڑ جائے اور وہ کسی ادنیٰ پیشے کو اپنا ذریعہ معاش بنانے پر مجبور ہو جائے تو حیرت سے کہتے ہیں۔ اس کہاوت سے متعلق یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے

واقعہ: ایک شخص جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش میں ایک مدت تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ جب اسے کہیں ملازمت نہ ملی تو اس نے یہ سوچ کر کہ "روٹی تو کھائے کسی طور مچھندر" گھر گھر جا کر تیل بیچنے کا ارادہ کیا۔ چند پیسوں کا کسی طرح انتظام کر کے اس نے تھوڑا سا تیل خریدا۔ ہانڈی میں تیل اور ترازو لے کر بیچنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ آواز لگاتے لگاتے اس کا گزر نور جہاں کے محل سے ہوا۔ نور جہاں کو تیل کی ضرورت تھی اس نے تیل لینے کے لیے اس نوجوان تیل بیچنے والے کو اپنے پاس بلایا۔ تیل کا بھاؤ پوچھنے پر نوجوان نے فارسی زبان میں جواب دیا۔ نور جہان اس کی فارسی دانی پر دنگ رہ گئی اور اس سے کل حالات دریافت کیے۔ اس کے بعد نور جہاں نے کہا:

"پڑھیں فارسی بیچیں تیل یہ دیکھو قدرت کے کھیل"

(واضح ہو کہ اس وقت سرکاری اور شرفا کی زبان فارسی تھی)۔

پکائی کھیر ہو گیا دَلیا

دیکھیے: واہ پیر علیا، پکائی کھیر ہو گیا دلیا۔

بگڑی گئی بھینس کی گانڑ میں

یہ کہاوت رشوت خور حاکم کے لیے کہی جاتی ہے۔ ایسا مُنصف جو رشوت کو دونوں فریقین سے لے مگر فیصلہ اسی کے حق میں سنائے جس کی گھوس زیادہ ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک گھوس لینے والے منصف کے پاس جھگڑے کا ایک مقدمہ پہنچا۔ طرفین کو منصف کی رشوت خوری کا پتا تھا۔ لہٰذا ایک شخص نے منصف کو ایک نہایت قیمتی پگڑی نذر کی تا کہ مقدمہ کا

فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ جب دوسری طرف کو لوگوں کو پتا چلا کہ معاملہ بگڑنے والا ہے۔ فریق اول کی طرف سے منصف کے حضور قیمتی پگڑی پہنچائی جا چکی ہے تو انہوں نے ایک اچھی نسل کی دودھ دینے والی قیمتی بھینس منصف کو پیش کر دی۔ فیصلہ فریق ثانی یعنی بھینس نذر کرنے والے کے حق میں ہوا۔ اس کے بعد فریق اول یعنی پگڑی دینے والا منصف کے پاس گیا اور اس سے کہا:

''حضور میں نے اسی امید پر آپ کے حضور قیمتی پگڑی پیش کی تھی کہ آپ فیصلہ میرے حق میں سنائیں گے مگر آپ نے مجھے ہرا کر چھوڑ کر فریق ثانی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔''

اس پر منصف نے جھنجھلا کر کہا:

''پگڑی گئی بھینس کی گانڑ میں۔''

پلے پارس بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل

دولت مند ہو کر ذلیل کام اختیار کرنے والوں کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ یا جس شخص کے پاس دولت ہو مگر وہ اس سے بے خبر رہ کر ذلیل پیشہ اختیار کرنے کیلئے مجبور ہو یا صاحب کمال ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی قدر سے ناواقف ہو تو بھی اس کہاوت کا استعمال جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب تھوڑی ترمیم کے ساتھ وہی بیان کیا جاتا ہے جو ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کھیل'' میں بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھیے پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل)۔

جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ایک نوجوان سر پر تیل کا گھڑا رکھے ہوئے، ہاتھ میں ترازو اور باٹ لیے ہوئے، گلی گلی آواز لگا کر تیل بیچتا پھر رہا تھا۔ جب اس کا گزر نور جہاں کے محل کے سامنے سے ہوا تو نور جہاں اس کی آواز سن کر دروازے پر آ گئی۔ اسے تیل خریدنا تھا۔ تیل کا وزن کرنے کے لیے نوجوان نے ترازو کے ایک پلڑے یعنی پلے پر برتن رکھا اور دوسرے پلے پر پتھروں کے باٹ رکھے۔ پتھروں کے یہ باٹ اصل باٹ سے وزن کر کے بنائے گئے تھے۔ جن پتھروں کے ٹکڑوں سے وہ نوجوان تیل تول رہا تھا ان میں سے ایک پارس نامی پتھر بھی تھا جس سے نوجوان بے خبر تھا۔

وہ اس پتھر کو بھی عام پتھر ہی سمجھ رہا تھا۔ نور جہاں کو پارس پتھر کی پہچان تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گئی اور ایک دم کہہ اٹھی:

''پلے پارس بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔''

پنچ کہیں بلی تو بلی ہی سہی

بہت سے آدمی مل کر اگر کسی غلط بات کی تائید کردیں تو دوسرے کو بھی مجبوراً ماننی پڑتی ہے۔ اپنی رائے کے خلاف اگر کئی لوگوں کی رائے ایک جیسی ہوتو اسے تسلیم کرنا چاہئے۔ اس مثل کے تعلق سے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جواس طرح ہے:

حکایت: ایک بنیا اپنی دوکان بند کرنے کے بعد حفاظت کی غرض سے باہر سورہا تھا۔ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ایک چور چوری کرنے کے ارادے سے دُکان میں گھُس گیا۔ آہٹ سے بنیے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر سے دوکان کی کنڈی لگالی۔ چور نے اپنے آپ کو پھنسا ہوا دیکھ کر بنیے کو دھوکہ دینے کی تدبیر کی۔ وہ میاؤں میاؤں کرکے بلی کی بولی بولنے لگا۔ اس پر بنیے نے کہا:

"ابھی تو تم بند ہی رہو۔ صبح کو پہلے یہاں پنچوں کو اکٹھا کرلوں گا پھر دوکان کھول کر تمہیں ان کے سامنے پیش کروں گا۔ اگر پنچوں نے تجھے بلی کہہ دیا تو بلی ہی سہی۔"

پنچوں کا کہنا سر آنکھوں پر مگر پرنالہ یہیں گرے گا

پنچوں کا فیصلہ مجھے منظور ہے لیکن پرنالہ یعنی موری یہیں پر رہے گی۔ اپنی ہٹ کے آگے کسی کی نہ ماننے والا شخص۔ یہ کہاوت ایسے ہٹی اور ضدی شخص کے لیے کہی جاتی ہے جو کسی کا کہنا نہیں مانتا۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک واقعہ ہے جواس طرح بیان کیا جاتا ہے:

حکایت: کسی شخص کے گھر کی موری کا پانی اس کے پڑوسی کے گھر میں جاتا تھا۔ جب پڑوسی کے کئی بار کہنے کے باوجود بھی اس شخص نے اپنی موری وہاں سے نہیں ہٹائی تو اس جھگڑے کے فیصلے کے لیے پنچوں کو بلایا گیا۔ پنچوں نے موقع کا معائنہ اور فریقین کے بیانات لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ موری کو اِدھر سے ختم کردیا جائے اور دوسری طرف بنالی جائے۔ فیصلہ سن کر اس شخص نے کہا: "پنچوں کا کہنا سر آنکھوں پر مگر پرنالہ یہیں گرے گا"، یعنی موری جہاں ہے وہیں رہے گی۔

پورا پیڑ ہلایا، سب نے چکھ کر کھایا

یہ کہاوت ایسے موقع پر کہی جاتی ہے جب یہ کہنا مقصود ہو کہ انسان کو ایسا کام کرنا چاہئے جس سے

زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔

اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے:

حکایت: ایک آدمی کسی پھل دار درخت پر چڑھا ہوا توڑ توڑ کر پھل کھا رہا تھا۔ کسی شخص نے اسے دور سے دیکھ لیا۔

وہ بھی اس پیڑ کے نیچے آ گیا اور پیڑ پر چڑھے ہوئے آدمی سے کہا:

''دو، چار پھل مجھے بھی توڑ کر دے دو تا کہ میں بھی ان کا لطف حاصل کر سکوں۔''

اس نے کچھ پھل توڑ کر زمین پر گرا دیئے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے بہت سے لوگ پیڑ کے نیچے جمع ہو گئے اور اس سے کہنے لگے کہ ان کے لیے بھی کچھ پھل توڑ کر زمین پر گرا دے۔ پیڑ پر چڑھے ہوئے شخص نے سوچا اگر میں پورے پیڑ ہی کو اوپر سے ہلا دوں تو بہت سے پھل زمین پر گریں گے جنھیں ہر شخص اپنی مرضی کے موافق کھا سکے گا۔ یہ سوچ کر اس نے پیڑ کو زور زور سے کئی بار ہلایا۔ درخت سے بہت سے پھل زمین پر گرے جنھیں سب لوگوں نے خوب چکھ چکھ کر کھائے۔

پونی کے لیے بچھیا ماری، گونا سنگھاتے پھریئے

ایک پونی (کپاس کا ایک چھوٹا ٹکڑا جو دھن کر کاتنے کے لیے بنایا جاتا ہے) کو بچانے کے لیے بچھیا کو مارا اور اب اس کو بچانے کے لیے گونا (سوت کا بڑا بنڈل) سنگھا رہے ہیں۔ جب کسی معمولی نقصان سے بچنے کے لیے بڑی مصیبت میں پھنسنا پڑے یا لینے کے دینے پڑ جائیں تو اس کہاوت کو کہتے ہیں۔

اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت:

ایک جلاہا کسی جگہ پر بیٹھا ہوا سوت کات رہا تھا۔ ایک بچھیا اس کے پیچھے سے آئی اور ایک پونی کو منہ میں داب کر چلنے لگی۔ جلاہا اپنے مال کا نقصان دیکھ کر طیش میں آ گیا۔ اس نے اپنے پاس پڑا ہوا ڈنڈا اٹھایا اور بچھیا کے سر پر زور سے مار دیا۔ بچھیا رچوٹ برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ یہ منظر دیکھ کر جلاہا گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ اگر کسی ہندو نے دیکھ لیا تو وہ میری جان ہی لے لے گا۔ بچھیا کو ہوش میں لانے اور اسے کھڑا کرنے کی اس نے جی توڑ کوشش کی مگر بچھیا جوں کی توں پڑی رہی۔ وہ ذرا ہلی تک

بھی نہیں۔ آخر میں وہ گھر کے اندر لے گیا اور وہاں سے سوت کا ایک بڑا بنڈل (جسے جُلاہوں کی اصطلاح میں گونا کہتے ہیں) یہ سوچ کر نکال لایا کہ بچھیا کو کپاس بہت پسند تھی اسی لیے منہ میں پونی داب کر وہ بھاگی تھی۔ اگر میں اسے کپاس کا بڑا بنڈل یعنی گونا ہی دے دوں تو وہ خوش ہو جائے گی اور ہوش میں آ کر کھڑی ہو جائے گی۔

اس نے اس بنڈل کو بچھیا کی ناک کے پاس لا کر رکھ دیا اور کہنے لگا:

"لے اسے سونگھ، یہ پونی نہیں گونا ہے۔ یہ پورا بنڈل تو کھا لے مگر جلدی ہوش میں آ کر کھڑی ہو جا۔"

اتفاقاً تھوڑی دیر کے بعد بچھیا ہوش میں آنے لگی اور اٹھ کر ایک طرف چل دی۔ جلاہے کی جان میں جان آئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے گھر آ کر کبھی ایسا نہ کرنے کے لیے اس نے قسم کھائی۔

پُوے تو پُوے ڈنڈا بھی کھا گئے

جب ایک ہی جگہ پر مشکل اور آسان کام ہونا ہو وہاں پر مشکل کام پہلے اور آسانی سے ہو جائے تو آسان کام ہونا لازمی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

واقعہ:

کوئی شخص ایک ڈنڈے میں کچھ پُوے باندھ کر کہیں کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں کسی کھیت کی مینڈ پر اس نے ڈنڈا رکھ دیا اور کسی ضرورت سے کہیں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ وہاں واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس ڈنڈے کا اچھا خاصہ حصہ چوہے کھا گئے ہیں وہ متعجب ہو کر سوچنے لگا کہ جب ڈنڈے جیسی سخت چیز کو چوہے تھوڑی دیر میں کھا گئے ہیں تو پوؤں کو کب چھوڑنے والے ہیں۔ ان کا صفایا تو چٹ پٹ کر دیں گے۔

پہلے آپ پہلے آپ

دیکھیے: تکلف میں ریل چل دی۔

پہلے رہتا یوں، تو لوٹا جاتا کیوں

صبر وضبط سے کام لیتے تو نقصان کیوں اٹھاتے۔ حد سے تجاوز کرنا تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ بے راہ روی اور بد چلنی آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ یہ کہاوت ایسے موقع ومحل پر استعمال کی جاتی ہے جب کوئی باکردار شخص بد چلنی اور بے راہ روی کے سبب ندامت کے ساتھ نقصان بھی اٹھائے۔

پیاز بھی کھائی، مکے بھی کھائے اور روپے بھی دینا پڑے

جب کوئی شخص لالچ میں پڑ کر بغیر سوچے سمجھے کوئی کام کرے اور اسے فائدے کے بجائے نقصان اٹھانا پڑے تو طنزاً یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک بار دو آدمیوں میں کسی کام کو کرنے کی شرط لگی۔ اس کام کو نہ کر سکنے پر تین میں سے ایک سزا بھگتنے کی تجویز منظور ہوئی۔ پہلی تجویز تھی کہ اگر ہم میں سے جو بھی اس کام کو نہیں کر سکے گا۔ اسے ایک سو پیاز کھانا ہوگی۔ دوسری تجویز تھی اگر پیاز کھانا نہ پسند ہو تو سو مکے کھانا ہوں گے۔ تیسری تجویز تھی کہ اگر پیاز یا مکے کھانا منظور نہ ہو تو شرط ہارنے والا جیتنے والے کو سو روپے دے گا۔ تجاویز منظور ہونے کے بعد ایک شخص نے تو اس کام کو کر لیا مگر دوسرا شخص نہیں کر سکا۔ پہلے شخص نے دوسرے شخص سے پوچھا:

"وہ تینوں سزاؤں میں سے کس کو پورا کرے گا۔"

ہارنے والا شخص بہت لالچی تھا۔ اس نے سوچا روپے دینا تو نادانی ہے۔ مکے کھانے سے سارا بدن چور چور ہو جائے گا۔ اس لیے اچھا یہی ہے کہ پیاز کھائی جائے۔ یہ سوچ کر وہ پیاز کھانے کیلئے تیار ہو گیا۔ سو پیاز گن کر منگوائی گئیں۔ اب کیا تھا لالچی صاحب ایک ایک کر کے کھانے لگے۔ کچھ پیاز کھانے کے بعد اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا لیکن وہ جی کڑا کر کے کھاتا رہا۔ دھیرے دھیرے کر کے نوے پیاز کھا گیا لیکن اب ایک بھی پیاز کھانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اب اگر کسی طرح اور بھی پیاز کھائی تو جان ہی سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا ہے۔ اس لیے مکے کھانا ہی بہتر ہے۔ روپے تو نہ دینا پڑیں گے اور ان پیازوں سے بھی پیچھا چھوٹے گا۔ لہٰذا اس نے کہا: "اب ایک بھی پیاز مجھ سے نہیں کھائی جائے گی۔ اس لیے اب تم سو مکے مار لو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

دوسرے آدمی نے اس سے کہا:

''اب بھی موقع ہے سوچ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سو مکے نہ کھا سکو اور بعد میں روپے بھی دینا پڑیں۔''

وہ بولا:

سو مکے کھانے میں کیا جاتا ہے؟ تم مارو، میں برداشت کرلوں گا۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

اب اس پر مکے پڑنا شروع ہو گئے۔ پچاس مکوں تک تو اس نے برداشت کیا۔ اس کے بعد اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ہائے توبہ کرتے کرتے کسی طرح اس نے نوے مکے برداشت کر لئے مگر اب اس میں ایک بھی مکے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پانی وغیرہ چھڑکنے کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو اس سے باقی دس مکے کھانے کے لیے کہا گیا لیکن اب اس میں اتنی ہمت اور سکت نہ تھی کہ وہ ایک بھی برداشت کر سکتا۔ اب اگر اس کے ایک بھی مکا پڑتا تو پھر بے ہوش ہو کر گر جانے کا ڈر تھا اور عجب نہیں کہ اسے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے۔ اس کا جسم بے کار ہو چکا تھا لہٰذا اس نے اس میں عافیت سمجھی کہ اب مزید مکے نہ کھا کر سو روپے دے کر پیچھا چھڑایا جائے۔ اس طرح لالچ میں پھنسے اس شخص کو پیاز بھی کھانی پڑی، مکے بھی کھائے اور روپے بھی دینا پڑے۔

پیر بھچڑی کی کڑھائی، ہو گیا ہیجڑا جس نے کھائی

اگر کوئی اچھا بھلا آدمی ہیجڑا ہو جائے یا پھر ہیجڑوں یا عورتوں کی سی حرکت کرے تو طنزاً کہتے ہیں۔

اس کہاوت کے وجود میں آنے کا تعلق ہیجڑوں کی ایک رسم سے ہے۔ جو یہ ہے:

رسم: پیر بھچڑی ایک نامعلوم یا فرضی سید کا نام ہے جسے ہیجڑے اپنا ولی، پیر و مرشد اور مورث اعلیٰ کہتے ہیں۔ اس کو پیرانِ بھچڑی، میر بھچڑی اور میر بھوجی بھی کہا جاتا ہے۔ ہیجڑوں کا خیال ہے کہ ان کا پیر زنانہ لباس پہنتا تھا اور چرخہ کات کر گزر اوقات کرتا تھا۔ سال کے پہلے چھ مہینوں تک وہ مرد رہتا تھا اور آخری چھ مہینوں کے لیے عورت بن جاتا تھا۔ یہی سلسلہ ایک مدت تک چلتا رہا۔ ایسی زندگی سے تنگ آ کر ایک بار اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ایسی حالت میں میرا نام کیسے چلے گا۔ نو مہینے پورے نہیں ہوتے ہیں کہ میں عورت سے مرد اور مرد سے عورت بن جاتا ہوں۔ اس طرح میں کبھی صاحب اولاد نہ ہو سکوں گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے حکم ہوا کہ تو مایوس نہ ہو۔ تیرا نام ایک نئے طریقے اور نئے فرقے سے چلے گا اور اسی فرقے کے لوگ تیری آل اولاد ہوں گے۔ اسی لیے تمام ہیجڑے خود کو اس کی نسل سمجھتے ہیں۔ جب کوئی نیا آدمی اس فرقہ میں داخل ہوتا ہے تو ایک خاص وقت پر پیر بھچڑی کی کڑھائی (حلوہ) چڑھائی جاتی ہے اور اس کا پکوان بطور تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص اس کڑھائی کا پکوان کھالیتا ہے وہ ہیجڑوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

پھاوڑے کا نام، گل صفا نہیں جانتا

نہایت احمق، نادان، جاہل اور اَن پڑھ شخص کے لیے کہا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے:

سبب: ایک شخص کسی اچھے استاد کی شاگردی اختیار کرنا چاہتا تھا مگر دھوکے میں ایک جاہل، اَن پڑھ مگر نہایت چالاک فقیر کا شاگرد ہو گیا۔ شاگردی اختیار کیے ہوئے بارہ برس کی مدت گزر گئی مگر شاہ صاحب نے اسے کوئی تعلیم نہیں دی۔ بس جھانسا دیتے رہے۔ آخر جب شاگرد سے رہا نہ گیا تو اس نے سوچا۔ اب میں خود ہی شاہ صاحب سے سوالات کر کے علم حاصل کروں گا۔ جن چیزوں کے بارے میں مجھے معلوم نہیں ہے۔ ان کے بارے میں شاہ صاحب سے پوچھوں گا۔ لہٰذا ایک روز چیلے نے ہمت کر کے ایک پھاوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''حضرت اس کا کیا نام ہے؟''

شاہ صاحب نہایت چالاک اور ہوشیار تو تھے ہی فوراً جواب دیا:

''پھاوڑے کا نام، گلِ صفا نہیں جانتا؟''

(واضح رہے کہ، گلِ صفا مٹی صاف کرنے والے کو کہتے ہیں)

پھر سیار تاڑ کے تلے نہیں جائیں گے، جائیں گے بھی تو چُن چُن کر کھائیں گے

اگر کوئی شخص غرور، گھمنڈ، شیخی یا نادانی کے سبب کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائے تو اس سے سبق حاصل کر کے آئندہ کے لیے ایسا نہ کرنے کی توبہ کر لے یا ہوشیار ہو جائے تو اس کے لیے یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی جنگل میں روزانہ ایک تاڑ کے نیچے کچھ سیار تاڑ کے پھل کے لالچ میں جمع ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے سر کو اوپر کی طرف اٹھا کر اور منہ کھول کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جوں ہی تاڑ کا پکا پھل زمین کی طرف گرتا، ان میں سے کوئی ایک سیار اسے اپنے منہ میں لے لیتا۔ یہی سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ معمول کے مطابق ایک روز تمام سیار تاڑ کے نیچے سر اٹھائے اور منہ کھولے ہوئے کھڑے تھے کہ تاڑ کا ایک پھل اس طرح گرا کہ ایک سیار اسے سنبھال نہ سکا۔ تاڑ کا پھل اس کے گلے میں پھنس گیا تھا۔ نہ وہ گلے سے اندر جاتا تھا اور نہ گلے سے باہر آتا تھا۔ سیار کی جان پر بن آئی تھی۔ جب کسی طرح اور بڑی مشکل سے تاڑ کا پھل گلے سے باہر نکلا تو اس نے چین کی سانس لی اور تمام سیاروں نے عہد کیا کہ ''پھر سیار تاڑ کے تلے نہیں جائیں گے، جائیں گے بھی تو چُن چُن کر کھائیں گے۔''

تام جھام لگے

بے مقصد، بے موقع نمائش کرنا۔ اگر کوئی شخص بے موقع احمقانہ انداز میں دکھاوا کرے یا شیخی بگھارے اور بڑھ چڑھ کر بات کرے تو اس کے لیے یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک احمق اور کم ظرف کو کہیں سے ایک تام جھام مل گئی۔ (تام جھام ایک قسم کی کھلی پالکی ہوتی ہے)۔ اب کیا تھا وہ پھولے نہ سمایا، اب اس کا معمول ہو گیا تھا کہ جب بھی اسے کہیں جانا ہوتا تو اپنے نوکروں سے کہتا تام جھام لگے۔ اگر اسے بازار جانا ہوتا تو تام جھام پر جاتا۔ پڑوس کے کسی گھر میں جانا ہوتا تو تام جھام میں بیٹھ کر جاتا۔ یہاں تک کہ اگر اسے پیشاب یا پاخانے کی بھی حاجت ہوتی تو نوکروں کو آواز دے کر بلاتا اور کہتا تام جھام لگے۔ نوکر فوراً تام جھام لاتے۔ وہ اس پر بیٹھ کر پیشاب یا پاخانے کے لیے جاتا۔ اس طرح وہ بازار جانے سے لے کر پیشاب پاخانے تک تام جھام پر ہی جاتا اور سمجھتا کہ اس سے لوگوں پر رعب قائم ہو رہا ہے اور اس کے رتبہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

تان نہ پڑوا، کوری گھر لٹّھم لٹّھا

بنا کسی بات یا بغیر کسی سبب کے لڑائی جھگڑا کرنے والوں کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے سبب جو واقعہ ہے وہ یہ ہے:

حکایت: ایک کوری (ہندوجُلاہا) نے کسی جگہ پر تانا بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو کوری کی بیوی نے اس سے کہا کہ:

''اس جگہ پر تم تانا نہیں بنا سکتے کیوں کہ میں یہاں پر اپنا پڑوا باندھوں گی۔''

کوری نے جواب دیا:

''میں تو اسی جگہ پر تانا بناؤں گا۔ تم اپنا پڑوا کسی اور جگہ پر باندھ لینا۔''

کوری بھی اپنی ضد پر اڑ گئی کہ کچھ بھی ہو وہ پڑوا یہیں باندھے گی۔ اپنی اپنی ضد پر اڑے رہنے کے سبب دونوں میں چپقلش بڑھتی رہی اور نوبت لاٹھی ڈنڈے تک پہنچ گئی۔ ان کے جھگڑے کو دیکھ کر وہاں کچھ لوگ اکٹھا ہو گئے۔ لڑائی کا سبب جاننے کے بعد جب ان لوگوں نے سوت اور پڑوا دیکھنا چاہا تو پتا چلا کہ کوری کے پاس تانا بنانے کیلئے نہ تو سوت تھا اور نہ کورن کے پاس باندھنے کے لیے پڑوا تھا۔ اس پر ان میں سے کسی نے کہا:

''تان نہ پڑوا، کوری گھر لٹھم لٹھا۔''

تِریا تیل ہمیر ہٹھ، چڑھے نہ دوجی بار

عزم مستحکم اور مضبوط ارادے کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں راجا ہمیر دیو کے عہد مستحکم کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو اس طرح ہے:

واقعہ: راجستھان میں جے پور کے پاس رَن تھمبھور نامی ایک قلعہ ہے۔ راجا ہمیر دیو وہاں کے حکمران تھے۔ علاء الدین خلجی کا ایک منگول ملزم جس کا نام محمد تھا۔ کسی طرح فرار ہو کر راجا ہمیر دیو کی پناہ میں آ گیا۔ علاء الدین نے راجا ہمیر دیو سے کہا کہ وہ اس ملزم کو اسے سونپ دیں۔ لاکھ کہنے کے باوجود بھی ہمیر دیو نے اس ملزم کو علاء الدین کے حوالے نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳۰۰ء میں راجا ہمیر دیو اور علاء الدین کی فوج کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی اور اپنی ہٹ یعنی ضد کے آگے لڑتے لڑتے ہمیر دیو مارے گئے۔

تَسلو اٹو رکہ مُور

مور۔ مور الفاظ بھوجپوری کے ہیں۔ اس لیے بھوج پوری کے لوگوں پر اس کہاوت کا استعمال طنزاً کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص زبردستی کسی کا مال ہڑپنا چاہے تو بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اگر کسی سے سچ

بات کہی جائے اور وہ ناراض ہو جائے تو بھی اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے پس منظر میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی زمانے میں ایک بار اس قدر قحط پڑا کہ لوگ اناج کے ایک ایک دانے کے لیے محتاج ہو گئے۔ ہر شخص فاقہ کشی کے لیے مجبور تھا۔ لوگ ایک دوسرے کا مال یا کھانا زبردستی چھین کر ہڑپ کرنے پر تیار ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی کسی طرح انتظام کر کے پتیلی میں چاول وغیرہ بنا کر تسلے (بڑا طباق) میں نکالتا تھا تو لوگ اس کے پاس چھیننے کے لیے پہنچ جاتے تھے اور اس سے پوچھتے تھے:

''تسلوا تُو رکہ مور؟''

اگر وہ شخص کہہ دیتا:

''مور''

تو وہ لوگ چھین جھپٹ کر سب کھا جاتے تھے۔ اس کے برعکس اگر اس نے کہہ دیا:

''تور''

تو اس کی رحم دلی کا خیال کر کے یا ترس کھا کر چھوڑ دیتے تھے۔

تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیے

کسی چیز یا بات کے دوسرے پہلو کو بھی دیکھیے۔ جب کوئی شخص کسی بات یا معاملہ کے ایک پہلو پر غور کرے اور اس کی حمایت یا مخالفت پر آمادہ ہو جائے مگر دوسرے پہلو پر قطعی توجہ نہ کرے یا کسی ایک فریق کی بات سن کر اس کی حمایت اور دوسرے فریق کی مخالفت کرے تو اس کہاوت کا استعمال کرتے ہیں۔ اِس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ جو اس طرح ہے

واقعہ: زمانہ قدیم میں ''نائٹ'(KNIGHT) اپنی بہادری کے لیے مشہور تھے۔ وہ بڑے جانباز ہوتے تھے۔ زندگی میں چیلنج قبول کرنا تو ان کا معمول تھا۔ وہ اپنی بات کے دھنی اور پکے ہوتے تھے۔ ذرا سی بات پر جان لڑا دیتے تھے اور کامیابی کے لیے مر جانا ان کی نظر میں ذلت کی زندگی سے بہتر تھا۔

ایک مرتبہ دو نائٹ یعنی بہادر جنگجو گھوڑوں پر سوار، ہتھیاروں کو جسم سے آراستہ کیے ہوئے، دو مختلف سمتوں سے چلے آ رہے تھے۔ شہر کے بازار میں چوراہے پر دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ چوراہے کے بیچ میں ایک چبوترہ تھا جس پر پرانے زمانے کے ایک مشہور نائٹ کا مجسمہ نصب تھا۔ اس کا ایک رخ

سنہرا تھا اور دوسرا رخ روپہلا۔ دونوں نائٹ اس مجسمے کے آگے پیچھے آ گئے اور وہیں پر اپنے اپنے گھوڑے روک لئے۔ ایک نائٹ نے دوسرے نائٹ سے کہا:

''یہ کیا بہادر انسان تھا کہ حکومت نے بھی اس کی اتنی قدر کی ہے۔ کیا خوب سونے کا مجسمہ تیار کرایا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کو دیکھتے رہیں۔''

دوسرے نائٹ نے کہا:

''یار اس کی بہادری میں شک ہے نہ قدر دانی میں مگر مجسمہ سونے کا نہیں بلکہ اصلی چاندی کا ہے اور نہایت چمکدار ہے۔''

پہلا نائٹ بولا:

''تمہیں سونے اور چاندی کی بھی پرکھ نہیں۔ چاندی اور سونے کے رنگ ہی میں فرق ہوتا ہے۔ یہ مجسمہ سونے کا ہے، ذرا غور سے دیکھو۔''

دوسرے نائٹ نے جواب دیا:

''میں تو غور سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ اپنی آنکھ کا علاج کرائیے۔ مجسمہ سونا کا نہیں چاندی کا ہے۔''

اس پر پہلے نائٹ نے قدرے تیز آواز میں کہا:

''مجھے تعجب ہے، تم اپنی بات کو سنوارنے کے لیے مجسمہ کی توہین کر رہے ہو۔ مجسمہ خالص سونے کا ہے۔''

بات سے بات نکلتی گئی۔ بحث و تکرار بڑھ گئی۔ دونوں طیش میں آ گئے اور ڈویل یعنی جنگ کا علان کر دیا۔ ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ دونوں میں خوب جنگ ہوئی یہاں تک کہ دونوں زخمی ہو کر گھوڑوں سے گر پڑے۔ چوراہے میں بھیڑ لگ گئی مگر کس کی مجال تھی کہ دخل دے سکے۔ سب دم بخود تھے۔ اتفاق سے تھوڑی دیر کے بعد وہاں ایک پادری آ گیا۔ اس نے جب یہ واقعہ سنا تو اسے نہایت افسوس ہوا۔ اس نے دونوں کی بہادری کی داد دی اور کہا:

''تم دونوں نے سچائی کے لیے ڈویل یعنی جنگ کی اس لیے تم دونوں ہی لائق تعریف و تحسین ہو۔''

دونوں نائٹ ایک زبان ہو کر بولے:

''فادر! ہم دونوں کس طرح سچے ہو سکتے ہیں؟ ہم میں سے ایک کہتا ہے کہ یہ مجسمہ سونے کا ہے اور دوسرا چاندی کا بتاتا ہے۔''

پادری نے کہا:

''تم دونوں سچے ہو مجھے یقین ہے کہ میں بھی سچ کہہ رہا ہوں۔ ذرا سمتیں بدل کر مجسے کو دیکھو، یہ مجسمہ ایک طرف سے سنہرا ہے اور دوسری طرف سے روپہلا ہے۔ اس لیے تم دونوں سچے ہو۔ مگر تم دونوں میں خامی یہ رہی کہ تم نے ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ تم دونوں نے اپنے اپنے مشاہدے کو ٹھیک سمجھا۔ دنیا میں معاملہ فہمی کی ضرورت ہے۔''

دونوں نائٹ اٹھے اور جب مجسے کو دونوں نے دونوں طرف سے دیکھا تو سچائی سامنے آئی۔ اپنے کیے پر پشیمان ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور پادری کا شکریہ ادا کر کے اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر چل دیئے۔

تکبر عزازیل را خوار کرد، بزندانِ لعنت گرفتار کرد

غرور نے شیطان کو ذلیل کیا اور لعنت کے قید خانے میں گرفتار کیا یعنی غرور بڑے سے بڑے آدمی کو ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ یہ شعری ضرب المثل اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص اپنے غرور اور گھمنڈ کے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھے۔ اس شعری مثل کے وجود میں آنے کا سبب آدم و ابلیس کی تلمیح ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: عزازیل یعنی شیطان یا ابلیس اصل میں فرشتہ نہیں بلکہ ایک جن تھا۔ پہلے اس زمین پر جن ہی قابض و متصرف تھے۔ جب اس قوم نے نافرمانی کی تو حکم الٰہی سے فرشتوں نے اس کو معدوم کر دیا تھا۔ اسی گروہ میں عزازیل بھی شامل تھا۔ اس نے خدا کی اتنی عبادت کی کہ اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی زیادہ ہو گیا اور معلم الملائکہ یعنی فرشتوں کا استاد لقب ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے جب اس کائناتِ ارضی پر اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہا تو اس نے کھنکناتی ہوئی مٹی سے سیّدنا آدم علیہ السلام کا پتلا تیار کیا۔ اس کے بعد تمام فرشتوں کو حکم ہوا کہ وہ اس مٹی کے پتلے کو سجدہ کریں۔ تمام فرشتے حکم کی تعمیل میں سر بسجود ہو گئے۔ عزازیل کا علم و فضل سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ معلم الملکوت بھی تھا۔ اس کے سر میں اپنے رتبے کا غرور سمایا ہوا تھا۔ اس نے سجدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا:

''میری تخلیق آگ سے ہوئی ہے اور اس مٹی کے پتلے کو سجدہ کرنا میری توہین ہے۔''

وہ اس قدر مغرور تھا کہ انکار پر اڑا رہا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا غرور و تکبر پسند نہ آیا۔ اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال دیا گیا اور ابلیس و شیطان کا لقب دے کر جنت سے نکال دیا گیا۔

تکلف میں ریل چل دی

حد سے زیادہ تکلف پر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جب کوئی شخص بہت زیادہ شائستگی اور انکساری کا مظاہرہ کرے یا تکلف کے سبب کوئی چیز خود نہ لے کر دوسرے کو پیش کرے تو یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا ایک دلچسپ چھوٹا سا واقعہ اس طرح مشہور ہے:

واقعہ: تکلف کے قائل دو دوست سفر کرنے کیلئے الگ الگ اپنے گھروں سے نکلے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ان کی ملاقات ہوئی۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی آداب بجالانے کے لیے دونوں ہی تقریباً ایک ساتھ جھکے اور اپنے اپنے ہاتھ پیشانی تک لے گئے۔ خیر و عافیت کے بعد ابھی یہ خلوص و شائستگی کا مظاہرہ کر ہی رہے تھے کہ پلیٹ فارم پر ریل آ پہنچی۔ جن کا سفر ختم ہو گیا تھا وہ ٹرین سے اتر رہے تھے اور سفر کرنے والے ٹرین پر چڑھ رہے تھے۔ مگر ان میں ایک دوست نے دوسرے سے کہا:

''قبلہ تشریف لے چلئے۔''

دوسرے نے کہا: ''اجی حضرت پہلے آپ۔''

پہلے دوست نے جواب میں کہا:

''حضور کیسی بات کرتے ہیں پہلے آپ قدم رنجہ فرمائیں۔''

دوسرے دوست نے کہا:

''حضور والا! پہلے آپ، بندۂ کمترین اُس لائق کہاں کہ آپ سے آگے قدم بڑھائے۔''

غرض کہ دونوں اسی طرح پہلے آپ، پہلے آپ کرتے رہے اور ریل اسٹیشن سے بے تکلف روانہ ہو گئی۔ وہ دونوں تکلف کے پلیٹ فارم پر تکلف کا مظاہرہ کرتے رہ گئے۔

تِل گُڑ، تِل گُڑ تیس روپے

دیکھیے: چٹوری زبان، دولت کا زیان۔

تلوؤں سے تو آگ لگی ہے

جب کوئی شخص کسی آدمی یا حاکم کو رشوت دے کر یا کھلا پلا کر اپنے حق میں کر لے تو طنزاً یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ اراضی سے متعلق دو آدمیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ جب معاملہ آپس میں نہ سلجھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ دھیرے دھیرے وہ دن بھی آ گیا جب گواہوں کو عدالت میں پیش ہوتا تھا۔ اس مقدمہ کا خاص اور اہم گواہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ دونوں فریقین چاہتے تھے کہ مکھیا اس کے حق میں گواہی دے۔ اس لیے دونوں لوگ مکھیا کو خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مکھیا جس وقت عدالت میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسی وقت ایک فریق اس کے گھر آیا اور اس نے مکھیا کی پگڑی میں ایک مہر (سونے کا سکہ) باندھ دی تاکہ مکھیا خوش ہو جائے اور اس کے حق میں بیان دے دے۔ دوسرا فریق کسی طرح تاڑ گیا۔ اس نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تاؤ میں آ کر مکھیا کے جوتے میں ایک ساتھ دس مہریں رکھ دیں۔ عدالت میں پہنچ کر فریق اوّل نے مکھیا کو یاد دلانے کی غرض سے کہا:

''مکھیا جی! آپ کی پگڑی میں کیا ہے ذرا جھاڑ کر تو دیکھ لو۔''

مگر مکھیا نے سنی ان سنی کر دی کیوں اسے پتا تھا کہ دوسرے فریق نے ان کے جوتے میں دس مہریں ڈال رکھی ہیں۔ جب مکھیا کچھ نہ بولے تو فریق ثانی نے جواب دیا:

''مکھیا جی تمہاری کیا سنیں، تلوؤں سے تو آگ لگی ہے۔''

تلوؤں کی سی کہوں یا جیبھ کی سی؟

دونوں طرف سے رشوت لینے والے کے لیے یہ کہاوت طنزاً کہی جاتی ہے۔ اپنی حمایت کے لیے اگر دو اشخاص کسی پر برابر سے دباؤ ڈالیں اور وہ کشمکش میں پڑ جائے کہ کس کی حمایت کرے تو بھی اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کی نسبت ایک حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: دو فریقوں کے درمیان کسی بات کو لے کر جھگڑا ہو گیا۔ محلے والوں کے سمجھانے پر بھی جب دونوں اپنی اپنی ضد پر اڑے رہے تو مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا۔ قاضی کی رشوت خوری سے دونوں فریقین واقف تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے قاضی کو رشوت پیش کی۔ فریق اول نے

بہترین مٹھائی پیش کی۔ جسے قاضی اوران کے گھر والوں نے خوب مزے لے لے کر کھائی۔ فریق ثانی نے قاضی کے جوتے کے اندر ایک اشرفی رکھ دی۔ اب اپنے اپنے طور پر دونوں فریق مطمئن تھے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا۔ بیانات اور گواہی کے بعد جب قاضی نے فیصلہ سنانا چاہا تو وہ کشمکش میں پڑ گیا کہ فیصلہ کس کے حق میں سنائے یعنی مٹھائی پیش کرنے والے کے حق میں فیصلہ دے یا جوتے کے اندر اشرفی رکھنے والے کے حق میں۔ وہ اسی پس وپیش میں پڑا رہا کہ تلووں کی سی کہیں یا جیبھ کی سی۔

تن لگے دھوپڑی، تو بلائے چھائے جھونپڑی

جب کسی چیز کی ضرورت ہو تو انسان دوڑ دھوپ اور کوشش سے اس چیز کو حاصل کرتا ہے اور جب ضرورت باقی نہیں رہتی تو اس چیز کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص کو اپنے مستقبل کی ذرا بھی فکر نہ ہو اور وہ عیش ونشاط میں ڈوبا ہوا ہو تو بھی یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک کہانی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا۔ گرمی اور برسات کے موسم تو اس نے کسی طرح برداشت کر کے گزار دیئے۔ مگر جب سردی کا موسم شروع ہوا اور دھیرے دھیرے کپکپا دینے والی سردی پڑنے لگی تو بڑھیا کی راتیں کتنا دشوار ہو گئیں۔ رات کو وہ ایسا محسوس کرتی کہ جیسے دنیا بھر کی سردی اس کے بدن میں گھسی جا رہی ہو۔ اسی سردی کے عالم میں وہ سوچتی کہ صبح ہوتے ہی کسی طرح اپنی جھونپڑی چھا لوں گی تا کہ سردی سے نجات تو مل سکے۔ مگر جب کسی طرح رات کٹتی اور سویرا ہوتا، سورج نکلتا اور اسے دھوپ لگتی تو رات کی سردی کا احساس جاتا رہتا۔ وہ جھونپڑی چھانا بھول جاتی۔ دوسری رات کو جب اسے پھر سردی لگتی تو عہد کرتی کہ اب تو سویرے ہوتے ہی جھونپڑی چھاؤں گی مگر صبح ہوتے ہی جہاں پھر دھوپ لگتی، سردی جاتی رہتی تو وہ پھر جھونپڑی چھانا بھول جاتی۔

تو کو نہ بھناؤں، تیرا بھیا اور بندھاؤں

تجھ کو نہ بھناؤں گا بلکہ تیرے جیسے اوروں کو بھی تیرے ساتھ اپنی گانٹھ میں باندھ لوں گا۔ یہ کہاوت نہایت کنجوس اور لالچی شخص کے لیے کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک حکایت اس طرح ہے:

حکایت: کوئی نہایت کنجوس اور لالچی شخص بازار سے کوئی چیز خریدنے گیا۔ اس کے پاس ایک

روپیہ تھا۔ وہ مطلوبہ چیز بھی خریدنا چاہتا تھا اور روپیہ بھی خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا پہلے اس روپے کو بھنالوں تاکہ دوکان دار مطلوبہ چیز کی جتنی قیمت بتائے اس سے کم بھنائی ہوئی ریزگاری دے کر اس سے وہ چیز حاصل کرلے۔ یہ سوچ کر وہ ایک دوکاندار کے پاس گیا اور اسے روپیہ دے کر بھنانے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ روپے کو بھنانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر روپیہ کی ریزگاری مل گئی تو جلد خرچ ہوجائے گی۔ جب کہ بندھا روپیہ دیر میں خرچ ہوتا ہے۔ دوکاندار نے گن کر اسے ایک روپیہ کی ریزگاری دے دی۔ ریزگاری لے کر اس نے ایک چونّی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کھوٹی ہونے کے بہانہ کر کے ریزگاری واپس کردی۔ اپنا روپیہ واپس لے کر دوسرے دوکاندار کے پاس بھنانے کے لیے پہنچا مگر اس بار بھی کسی بہانے سے اپنا روپیہ واپس لے کر ریزگاری دوکاندار کو لوٹا دی۔ غرض وہ کئی کئی دوکانداروں کے پاس گیا اور اسی عمل کو دہراتا رہا۔ روپے کو مُٹھی میں دابے رہنے کی وجہ سے اس کی ہتھیلی میں پسینہ آگیا تھا۔ پسینہ دیکھ کر وہ سوچنے لگا:

"اس روپے سے جتنا لگاؤ مجھے ہے اس سے کہیں زیادہ اس روپے کو مجھ سے ہے۔ اسی لیے تو یہ مجھ سے جدا ہونے کے غم میں رورہا ہے۔ میری ہتھیلی اس کے آنسوؤں سے تر ہو گئی ہے۔"

اس نے روپے سے مخاطب ہو کر کہا:

"مجھ سے بچھڑنے کے غم میں آنسو نہ بہا۔ میں تو کو نہ بھناؤں، تیرا بھیا اور بندھاؤں۔"

تو کو نہ موکو، چولہے میں جھونکو

دیکھیے: تو کو نہ موکو، کنویں میں جھونکو۔

تو کو نہ موکو، کنویں میں جھونکو

نہ تیری نہ میری، نہ اس کی نہ اُس کی، یہ چیز کسی کی نہیں۔ جب کسی چیز کو لے کر دو فریقین کے درمیان تنازع ہو اور دونوں اس چیز کے دعویدار ہوں اور معاملہ کسی طرح بھی سلجھنا مشکل ہو تو بغیر کسی ثبوت وصفائی کے معاملہ کو ختم کردینے کے لیے یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں دو فریقوں کے درمیان کسی چیز یا بات کو لے کر تنازع پیدا ہو گیا۔ دونوں اس چیز پر اپنا حق جتا رہے تھے اور برابر کے دعویدار تھے۔ جب معاملہ آپس میں نمٹتا ہوا نظر نہ آیا تو گاؤں کے چند حضرات اکٹھے ہوئے۔ معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی مگر معاملہ طول پکڑتا گیا۔ دونوں کے حمایتی بھی اپنے اپنے فریق کی طرف ہو گئے۔ قرب و جوار کے کئی گاؤں کے مکھیا اور چودھری انصاف کرنے کے لیے بلائے گئے۔ مہا پنچایت ہوئی۔ تین دن اور تین راتوں تک تمام پنچ معاملہ پر غور کرتے رہے۔ دونوں فریقین اور ان کے حمایتی اپنے اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے ثبوت، صفائی اور بیانات دیتے رہے۔ روزانہ کئی دیگیں پنچوں کے لیے کھانا بھی پکوایا جاتا تھا۔ کھا پی کر پھر پنچائت بیٹھ جاتی تھی اور غور و فکر، صفائی، ثبوت، بیانات کا وہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو روزانہ ہو رہا تھا۔ چوتھے روز ایک ضعیف اور تجربہ کار شخص کا وہاں سے گزر ہوا جہاں تین روز سے پنچائت چل رہی تھی۔ اس نے پنچوں کے پاس جا کر کہا: ''کیا میں بھی اس معاملہ کو سمجھ سکتا ہوں؟''

مکھیا نے کہا:

''کیوں نہیں! آپ بھی غور کریں۔ ہم لوگ تو تین روز سے پریشان ہیں مگر فیصلہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ فلاں چیز کے دونوں دعوے دار ہیں اور ان میں سے ایک بھی اپنے دعوے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔''

ضعیف آدمی نے کہا:

''بس اتنی سی بات، ارے یہ تو کوئی معاملہ ہی نہیں۔ رہی چیز کی بات تو ''تو کو نہ مو کو کنویں میں جھونکو''

بس کیا تھا اس چیز کو اٹھا کر کنویں میں ڈال دیا گیا۔ اس طرح معاملہ آسانی سے نمٹ گیا۔ دونوں فریقوں اور ان کے حمایتیوں نے آپس میں ایک دوسرے کو گلے سے لگا لیا اور ضعیف آدمی کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ لوگ کنویں کے بجائے چولہا کہتے ہیں۔ اس طرح نزاعی چیز چولہے میں ڈال دی گئی جو جل کر خاک ہو گئی۔

تو پہلے بھی بکری تھی، تو اب بھی بکری ہے

تو پہلے بھی جائز تھی، تو اب بھی جائز ہے۔ تو پہلے بھی یہی تھی تو اب بھی یہی ہے۔ جب کوئی شخص کسی

حرام چیز کو علی الاعلان اپنے اُوپر حلال کر لے یا کسی ایسی چیز کو یا معاملہ کو جھٹلائے جس پر اکثریت کا اتفاق ہو۔اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک شخص بہت زیادہ گوشت خور تھا۔ اتفاق سے اسے کئی روز تک گوشت نہیں ملا اور کئی روز تک اس نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔ایک روز وہ گوشت کی فکر میں غلطاں اپنے چبوترے پر بیٹھا تھا کہ اس کی نظر گھر کی پالتو کتیا پر پڑی۔ دفعتاً اس کے دماغ میں خیال آیا کہ کتیا کے گوشت سے اپنی خواہش کو پورا کیا جا سکتا ہے۔فوراً اُٹھا، گھر کے اندر سے تیز چھری لایا اور کتیا کے پاس آکر کہنے لگا:

''تو پہلے بھی بکری تھی، تو اب بھی بکری ہے''۔

کتیا جیسی منہ بنائے کیوں پڑی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اس کو تیز چھری سے ذبح کر دیا۔

تو کہے تو سچ بڑھیا، تو کہے تو سچ

کسی جھوٹی بات کو جھوٹی نہ کہہ کر طنزاً سچی کہنے پر یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے۔ جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک مال دار بڑھیا رہتی تھی۔ کچھ چور بڑھیا کی دولت کو لوٹ کر اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے اور مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ جب ہولی کا تہوار آیا اور ہر طرف ہولی کے سوانگ اور تماشے ہونے لگے تو چوروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ وہ رات کے وقت بڑھیا کے مکان میں گھس گئے۔انہوں نے مال و دولت اور زیورات وغیرہ لوٹ کر اپنے قبضے میں کیے۔ بڑھیا شور مچانے لگی تو انہوں نے مل کر بڑھیا کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور گاؤں سے باہر چھوڑنے کے لیے چل پڑے۔راستے میں ہولی کے متوالے سوانگ، تماشے بنائے، گھوم گھوم کر ہولی منا رہے تھے۔ بڑھیا چوروں کے کاندھوں پر سوار چیخ رہی تھی: ''میرے مال کو چوروں نے لوٹ لیا اور مجھے گاؤں کے باہر چھوڑنے کے لیے جا رہے ہیں۔خدارا میری مدد کرو، مجھے ان سے بچاؤ''۔

اس کے جواب میں چور چلا چلا کر کہتے جاتے تھے:

''تو کہے تو سچ بڑھیا تو کہے تو سچ''۔

بڑھیا کو کاندھوں پر سوار چیختے چلاتے اور چوروں کو اس طرح کہتے دیکھ اور سن کر لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ہولی کا سوانگ یا تماشہ ہے۔ بڑھیا کی مدد کیلئے کوئی نہیں آیا اور چور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

تھوڑی آس مدار کی، بہت آس گلگلوں کی

بہانہ ملاقات کا، مقصد فائدہ حاصل کرنا۔ لوگ کسی کے پاس ملاقات کرنے کی غرض سے کم جاتے ہیں بلکہ اس سے فائدہ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ حضرت بدیع الدین زندہ شاہ مدار کا مزار مبارک مکن پور ضلع کانپور میں ہے۔ جہاں ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس میلے میں گلگلے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ یوں تو میلے میں ہر وقت لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے مگر جب گلگلوں کا تبرک تقسیم کیا جاتا ہے اس وقت مجمع کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ لوگ مدار صاحب کی درگاہ کی زیارت کے لیے کم جاتے ہیں گلگلوں کی لالچ میں زیادہ

تیتر کی سی بولی ہے

ایسی بولی جس کا کچھ بھی یا من چاہا مطلب نکالا جا سکے۔ جب کوئی شخص صاف یا واضح بات نہ کرے اور ہر سننے والا یہ سمجھے کہ وہ اس کی جیسی ہی کہہ رہا ہے تو یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کا تعلق ایک حکایت سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: ایک تیتر ایک درخت پر بیٹھا ہوا اپنی بولی بول رہا تھا۔ دھوپ سے بچنے اور کچھ دیر دم لینے کے لیے ایک مسافر اسی درخت کی چھاؤں میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک تیتر کی بولی کو سنتا رہا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ کوئی ادھر سے گزرے تو اس سے دریافت کروں کہ تیتر کیا کہہ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُدھر سے ایک پہلوان کا گزر ہوا تو مسافر نے اس سے پوچھا:

''یہ تیتر کیا بول رہا ہے؟''

پہلوان نے جواب دیا:

''تیتر، ڈنڈ، مگدر، کثرت کہہ رہا ہے۔''

اس کے کچھ دیر کے بعد وہاں ایک درویش آ گیا۔ مسافر نے اب اس سے دریافت کیا:

''شاہ صاحب! یہ تیتر کیا بول رہا ہے؟''

شاہ صاحب نے کہا:

''بیٹا! تیتر کہہ رہا ہے سبحان تیری قدرت''

اب اس پیڑ کے نیچے آنے والا تیسرا شخص سادھو تھا۔ مسافر نے سادھو سے کہا:

''مہاراج! پیڑ پر بیٹھا ہوا تیتر کیا کہہ رہا ہے؟ بتانے کا کشٹ کریں۔''

سادھو نے کہا:

''کہہ تیتر کہہ رہا ہے۔ ''رام، لچھمن، دشرتھ''

اتفاق سے ایک کنجڑا بھی وہاں آ پہنچا تو مسافر نے سوچا کہ اس کنجڑے سے بھی پوچھ لیا جائے۔

پوچھنے پر کنجڑے نے کہا:

''تیتر کہہ رہا ہے: ''گاجر، مولی، ادرک''

آخر میں ایک جُلاہا اُدھر سے نکلا تو مسافر نے اس سے کہا:

''ذرا تیتر کی بولی سن کر بتاؤ کہ تیتر کیا بول رہا ہے۔''

جلاہے نے فوراً جواب دیا کہ تیتر کہہ رہا ہے:

''چرخہ، پونی، چرکھ۔''

مسافر یہ سوچ کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا کہ تیتر کی بولی کا مطلب ہر شخص اپنی طبیعت کے مطابق نکال کر چلتا بنا۔

تیتر کے منہ لچھمی

فیصلے کا اختیار منصف کو حاصل ہے۔ منصف جسے چاہے اسے جتا دے، جسے چاہے ہرا دے۔ جب کوئی شخص اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے عدالت جاتا ہے اور لوگ اس سے مقدمہ کا حال دریافت کرتے ہیں تو یہ کہاوت کہہ کر جواب دیتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک عقیدہ ہے:

حکایت: بعض ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ زچہّ خانے میں نوزائیدہ بچے کو کبھی کبھی یم یعنی قضا کا دیوتا گھیر لیتا ہے اور اس کی روح قبض کیے بغیر نہیں ٹلتا۔ اس درمیان اگر تیتر بول دے تو وہ تیتر کی آواز سن کر بھاگ جاتا ہے اور بچے کی جان بچ جاتی ہے۔ کوئی شخص اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے عدالت کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں اس کا ایک ساتھی ملا۔ ساتھی نے اس سے مقدمہ کے حالات دریافت کیے تو اس نے جواب دیا: ''تیتر کے منہ لچھمی یعنی فیصلہ حاکم کے منہ میں ہے۔ وہ جسے چاہے جتائے جسے چاہے ہرائے۔''

تیرے بڑوں کی ایسی تیسی

جب کوئی شخص اپنے فائدے کے لیے نہایت چالاکی سے کام لے اور دوسرے کو بدھو اور احمق سمجھے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ یہ کہاوت اس موقع پر بھی بولی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی بہانے سے دوسرے کے بزرگوں کی توہین کرے یا ان کی شان کے خلاف کچھ کہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی شہر میں دو دوست رہتے تھے اور دونوں ہی بے روزگار تھے۔ دونوں نے آپس میں صلاح کی کہ اگر ہم لوگ ساجھے میں کسی کام کو کریں تو کام بھی اچھا ہوگا اور نفع بھی خوب کمائیں گے۔

چالاک دوست نے کہا:

''ہم لوگوں کے پاس اتنے پیسے تو ہیں نہیں کہ کوئی روزگار کرسکیں۔ البتہ ایک کام ایسا ہے جسے ہم لوگ بغیر پیسے کے بھی کرسکتے ہیں۔ وہ کام یہ ہے کہ ہم لوگ ساجھے میں دہی بڑے بیچ سکتے ہیں۔ اس کام میں پونجی بھی نہیں لگانا پڑے گی۔ میں اپنے گھر سے دہی لے آؤں گا۔ تم اپنی ماں سے بڑے بنوا کر لے آؤ۔ بس دہی بڑے بیچنے کے لیے تیار۔''

دوسرے دوست کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ وہ اپنی ماں سے بڑے بنوا کر لے آیا۔ چالاک دوست دہی لے آیا۔ دہی میں بڑے ڈال کر دونوں لوگ بیچنے کے لیے شہر کے ایک نکڑ پر بیٹھ گئے۔ چالاک دوست نے ایک بڑا اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا:

''یار چکھ کر تو دیکھیں کیسے بنے ہیں؟''

تھوڑی دیر تک جب کوئی گاہک نہیں آیا تو چالاک دوست نے نکال کر ایک بڑا اور کھالیا۔ دونوں خریدار کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ جب کافی دیر ہوگئی تو چالاک دوست بولا:

''یار! بڑے تو بہت اچھے بنے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اور کھالوں۔''

یہ کہہ کر اس نے دو بڑے اور کھالیے۔ دوسرا دوست اس کے بار بار کھانے سے کڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد چالاک دوست نے کہا:

''یار تمہاری ماں بھی غضب کی ہے۔ کتنے اچھے بڑے بنائی ہیں۔ انہیں کھا کر تو میری بھوک بڑھ گئی ہے۔''

یہ کہتے کہتے دو بڑے اور اٹھا کر کھا گیا۔اب برتن میں دو یا تین بڑے باقی رہ گئے تھے۔دوسرے دوست نے کہا:

''یوں ہی سب کھا جاؤ گے تو ہم بیچیں گے کیا؟''

چالاک دوست نے جواب دیا:

''بکیں یا نہ بکیں، پیٹ تو بھر جائے گا۔کوئی پونجی لگی ہے جو گھاٹا ہوگا۔''

دوسرے دوست نے کہا:

''یار اب میں تم کو کھانے نہیں دوں گا۔میری ماں نے پوچھا کہ بیچ کر پیسے کیا کیے تو انہیں کیا جواب دوں گا۔''

چالاک دوست نے کہا:

''ابھی کچھ نہیں بگڑا، اگر تم کو ساجھا پسند نہیں تو اپنی اپنی چیزیں بانٹ لو اور ساجھا ختم کرو۔ میں ایسی ویسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہو۔ مجھے میرا دہی مبارک، تیرے بڑوں کی ایسی تیسی۔''

تمیس مار خاں بنے پھرتے ہیں

بڑے بہادر ہیں، بہت اکڑفوں کرتے ہیں۔نہایت عقل مند ہیں (کسی کے لیے طنزاً کہتے ہیں)۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو بلاوجہ بہادر، عقل مند یا اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھے اور اس کا مظاہرہ کرے تو اس کہاوت کو طنزاً کہتے ہیں۔اس کہاوت کے وجود میں آنے کے سلسلے میں حسب ذیل حکایت مشہور ہے:

حکایت: ایک بوڑھا سپاہی مدت سے بیکار تھا۔بیٹھے بیٹھے گھر کا سارا سامان بیچ بیچ کر کھا گیا۔اس کی بیوی اکثر اس سے کہا کرتی تھی کہ تم کمانے کیوں نہیں جاتے ہو۔کب تک یوں ہی سامان بیچ بیچ کر کھاتے رہیں۔جب سارا سامان بک گیا اور پاس کچھ نہ بچا تو اس نے مجبوراً اپنی بیوی سے کہا:

''میرا ارادہ ہے کہ تلاشِ روزگار کے لیے کل کسی طرف کو جاؤں۔تم کہیں سے کچھ انتظام کر کے میرے لیے ناشتہ تیار کر دینا۔''

بیوی رات کو منہ اندھیرے اٹھی، چورے کے لڈو تیار کرنے کیلئے اس نے چورے کو اوکھلی میں کوٹنا شروع کیا۔جس اوکھلی میں وہ چورا کوٹ رہی تھی۔اس کے اندر ایک کالا سانپ کنڈلی مارے پہلے سے بیٹھا

تھا۔ چورا ڈال کر کوٹنے سے وہ بھی کٹ کر چورے میں مل گیا۔ بیوی نے تیس لڈو بنا کر تیس دن ناشتہ کرنے کے لیے ایک کپڑے میں باندھ کر میاں کے حوالے کر دیئے۔ وہ صبح ہی روانہ ہو گیا۔ جب چلتے چلتے دوپہر ڈھلی اور اسے بھوک معلوم ہوئی تو وہ ایک کنویں کے پاس درخت کے سائے تلے ٹھہر گیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے وہ کنویں سے پانی بھر رہا تھا کہ ناگاہ وہاں تیس راہزن آ پہنچے۔ انہوں نے سپاہی کو بہت ڈرایا دھمکایا کہ اس کے پاس جتنا مال ہو سب نکال کر اس کے حوالے کر دے۔ سپاہی نے گڑ گڑا کر اپنی ناداری کا حال بیان کیا مگر لٹیروں نے اس پر ترس نہ کھایا۔ آخر کار سپاہی نے دیکھا کہ یہ کچھ لیے بغیر ٹلنے والے نہیں ہیں تو اس نے نہایت عاجزی سے کہا:

''میرے پاس صرف تیس لڈو ہیں جو میری بیوی نے ناشتے کے لیے دیے تھے۔ یہ حاضر ہیں، یہ میرا ایک مہینے کا ناشتہ ہے اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

راہزنوں نے اس سے سارے لڈو چھین لیے اور ایک ایک لڈو چٹ کر گئے۔ سپاہی نے کچھ دیر کے بعد دیکھا کہ ہر ایک رہزن کا حال خراب ہونے لگا ہے۔ کوئی وہیں گر پڑا۔ کوئی اونگھ رہا ہے اور کوئی پنک میں ہے۔ سپاہی نے سوچا۔ ابھی تو یہ سب اچھے خاصے تھے۔ اچانک ان کو لڈو کھاتے ہی کیا ہو گیا؟ وہ ان کے پاس آیا تو اس نے سب کو بے ہوش پایا۔ ان میں سے کچھ تو مر چکے تھے باقی سِسک رہے تھے۔ اس وقت اس نے سپاہیانہ داؤں کھیلا۔ سب کے ناک اور کان کاٹ کر اسی کپڑے میں باندھ لیے جس میں لڈو بندھے تھے اور وہاں سے اپنا رستہ لیا۔ وہاں سے چل کر وہ ایک شہر میں پہنچا۔ اس شہر کا یہ دستور تھا کہ ہر نیا مسافر بادشاہ کے سامنے حاضر کیا جاتا تھا۔ جب یہ سپاہی بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا تو دربار میں اس کا کل حال پوچھا گیا۔ اس وقت اس نے خوب شیخی بگھاری۔ اپنے باپ دادا کی جواں مردی کا حال بیان کیا، بادشاہ نے کہا: ''اب تم اپنا حال بیان کرو۔''

اس وقت اس نے ان تیس رہزنوں کے ناک کان بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیے جو اس نے کاٹ کر کپڑے میں باندھ لیے تھے۔ دراصل یہ وہ راہزن تھے جنہوں نے ساری سلطنت میں فساد برپا کر رکھا تھا۔ ہزاروں قافلے لوٹ لیے تھے۔ سینکڑوں آدمیوں کو مار ڈالا تھا اور اب تک یہ راہزن کسی کے ہاتھ نہ آئے تھے۔ بادشاہ ان کے ناک کان دیکھ کر اور یہ سن کر تمام رہزنوں کو اس نے مار ڈالا ہے، بہت خوش ہوا۔ بادشاہ نے بوڑھے سپاہی کی بہت عزت کی، خلعت و انعام سے نوازا۔ جاگیر عطا کی اور تیس مار خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔

تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو

اگر کسی بات کا نتیجہ موافق مقصود ظاہر نہ ہو رہا ہو تو کہتے ہیں یعنی صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ ہر کام کو سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد کرنا چاہیے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب دو حکایتیں تقریباً ایک جیسی ہیں۔ پہلی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۱: ایک راجا نے اپنے دربار میں چار مشیروں کی تقرری کی۔ ان میں سے ایک سپاہی تھا، دوسرا برہمن تھا، تیسرا اونٹ والا اور چوتھا تیلی تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دوسرے راجا نے اس پر چڑھائی کردی۔ راجا فکر مند ہو گیا۔ اس نے اپنے چاروں مشیروں کو دربار میں بلوایا اور سب سے الگ الگ رائے مانگی کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ سپاہی نے فوراً جواب دیا:

''حضور سوچتے کیوں ہیں۔ اس کے خلاف ہمیں لڑنا کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔''

اس کے بعد راجا نے برہمن سے دریافت کیا تو اس نے کہا:

''مہاراج جس طرح بھی ممکن ہو معاہدہ کر لینا چاہیے ورنہ خونِ ناحق ہوگا۔ تمام املاک تباہ و برباد ہوگی۔''

جب راجا نے اونٹ والے سے پوچھا تو اس نے کہا:

''اس کے بارے میں مَیں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟''

آخر میں بادشاہ نے تیلی سے پوچھا:

''اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔''

تیلی نے کہا:

''حضور پریشان نہ ہوں۔ قطعی گھبرائیں نہیں۔ تیل دیکھیے تیل کی دھار دیکھیے یعنی جلدی نہ کیجیے خوب سنجیدگی سے غور و فکر کر لیجیے اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیے۔ تیل لینا ہو تو برتن میں تیل دیکھ کر ہی پہچان نہیں ہو سکتی۔ اس کی دھار دیکھنے پر ہی اس کو ٹھیک سے پرکھا جا سکتا ہے۔''

حکایت ۲: دوسری حکایت معمولی فرق کے ساتھ اس طرح مشہور ہے کہ ایک شہزادے کے چار دوست آپس میں ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ ان میں سے ایک سپاہی تھا، دوسرا مولوی، تیسرا ساربان اور چوتھا

تیلی، شہزادہ جب خود بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے ان چاروں دوستوں کو منصبِ وزارت عطا کیا۔ یہ چاروں وزیر ایسے نااہل تھے کہ نظامِ سلطنت میں خلل پڑنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو کمزور پا کر قرب و جوار کے بادشاہوں نے چڑھائی کر دی۔ اس وقت بادشاہ بہت گھبرایا۔ اس نے چاروں وزیروں کو بلا کر دریافت کیا کہ ایسے حالات میں ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہئے۔ سپاہی نے عرض کیا:

''جہاں پناہ یہ موقع چوکنے کا نہیں ہے۔ فوراً فوج کشی کیجئے اور دشمن سے معرکہ آرا ہو جانا چاہیے۔''

اب مولوی صاحب کی باری تھی۔ مولوی صاحب نے فتویٰ دیا:

''حضور! ناحق بندگانِ خدا کا خون اپنی گردن پر نہ لیجئے اگر بالفرض آپ کا ملک آپ کے ہاتھ سے گیا تو سمجھئے دشمن کا ایمان گیا اور آپ ثواب کے حق دار ہوئے۔ کیوں کہ آپ خونِ ناحق سے بچے۔''

اس کے بعد بادشاہ نے ساربان سے پوچھا تو اس نے کہا:

''حضور گھبرایئے نہیں۔ ابھی دیکھیے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے یعنی کیا ہوتا ہے۔ اس کا انتظار کیجئے اور اس پر نظر رکھیئے۔''

آخر میں بادشاہ نے تیلی سے مشورہ طلب کیا تو اس نے کہا:

''خداوند ساربان سچ کہتا ہے۔ مجھے بھی اس کا قول پسند آیا۔ میں بھی ہم رائے ہوں حضور ابھی تیل دیکھیے، تیل کی دھار دیکھیے یعنی ابھی توقف اور انتظار کیجئے۔ جلد بازی میں بغیر سمجھے بوجھے کوئی قدم نہ اٹھایئے۔''

تین میں نہ تیرہ میں، باون میں نہ بہتر میں، نہ سیر بھر سُتلی میں، نہ کروا بھر رائی میں

ایسا شخص جس کی کوئی اہمیت نہ ہو، جو کسی شمار و قطار میں نہ ہو۔ یہ کہاوت ایسے شخص کے لیے کہی جاتی ہے جو اپنے آپ کو تو بہت کچھ سمجھے مگر دوسرے کی نظر میں اس کی کوئی گنتی نہ ہو یا دوسرا اسے کسی لائق نہ سمجھے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت ہے۔ جو اس طرح کہی جاتی ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک طوائف تھی جس کے چاہنے والوں کی تعداد بہت تھی۔ اس نے معیار کے مطابق اپنے چاہنے والوں کو کئی حصوں یا درجات میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلے درجہ میں تین چاہنے والے تھے۔ درجہ دوم میں تیرہ تھے، تیسرے درجہ میں باون اور چوتھے درجہ میں بہتر تھے۔ پانچویں اور چھٹے درجات میں جن چاہنے والوں کو رکھا گیا تھا ان کی تعداد بہت تھی۔ اس لیے پانچویں درجے کے چاہنے والوں کی گنتی کرنے کے لیے ایک سیر تلی میں ہر ایک کے نام کی ایک ایک گرہ لگائی تھی۔ چھٹے درجے میں تو بے شمار تھے۔ اس لیے اس نے ایک کروے (مٹی کا چھوٹا گھڑا) میں ہر ایک کے نام کا ایک ایک رائی کا دانہ ڈال رکھا تھا جس سے کروا بھر گیا تھا۔

ایک مرتبہ اس طوائف کا ایک پرانا عاشق اس کے گھر آیا۔ طوائف نے اپنے بھڑوے کو بلا کر پوچھا:

''ذرا دیکھ کر بتایئے یہ کس درجہ کے عاشق ہیں؟''

بھڑوے نے تھوڑی دیر کے بعد آ کر کہا:

''بائی جی! تین میں، نہ تیرہ میں، باون میں نہ بہتر میں، نہ سیر بھر تلی میں، نہ کروا بھرائی میں۔ غرض یہ کسی گنتی میں نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ چھٹے درجہ میں بھی نہیں۔''

تین میں نہ تیرہ میں، مردنگ بجائے ڈیرے میں

ایسا شخص جو کمتر ہو یا جس کی حیثیت دوسروں کے سامنے کچھ نہ ہو۔ یہ کہاوت ایسے شخص کے لیے کہی جاتی ہے جو اپنے آپ کو دوسرے کے برابر سمجھے۔ ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے مگر لوگ اسے اپنے سے کمتر ہی خیال کریں۔ اس مثل کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک بار بان پور (بندیل کھنڈ) کے راجا مردن سنگھ نے یگیہ کیا۔ انہوں نے سبھی ٹھاکروں کو نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ مدعو کیا۔ ٹھاکروں میں اعلیٰ درجہ کے ٹھاکروں کے تین قبیلے بندیلے، پنوار اور گھگھنرے تھے۔ ان کے علاوہ ٹھاکروں کے تیرہ گھرانے اور تھے جن کا شمار بھی اعلیٰ ٹھاکروں میں کیا جاتا تھا مگر اول تین قبیلوں کو ان پر فوقیت حاصل تھی۔ بھوج یعنی دعوت میں شامل ہونے کیلئے سبھی تیرہ گھرانوں کے ٹھاکر تشریف لائے مگر ایک ٹھاکر وہاں بن بلائے ہی پہنچ گئے۔ اس ٹھاکر کے گھرانے کا شمار کمتر گھرانوں میں ہوتا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے ٹھاکر کمتر درجہ کے ٹھاکروں کے ساتھ نہ تو کھاتے پیتے تھے اور نہ ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ بھوج کے وقت یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ ان حضرت کو کس طرح کھانا کھلایا جائے

کیوں کہ اعلیٰ درجہ کے ٹھاکر ادنیٰ درجہ کے ٹھاکروں کے ساتھ قطعی کھانا نہیں کھا سکتے۔ تمام سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا کھانا ان کے مکان ہی پر بھجوا دیا جائے۔ یہ وہیں کھانا کھائیں اور وہیں مردنگ بجائیں کیوں کہ یہ تین میں نہ تیرہ میں، مردنگ بجائے ڈیرے میں۔

ٹپکے کا ڈر ہے

آفت اور مصیبت آنے کا خوف ہے۔ جس کا ڈر ہے وہی مصیبت آنے والی ہے۔ اگر کسی کے من میں کسی سے یا کسی کے لیے خوف پیدا ہو جائے اور وہ اس کی وجہ سے کوئی کام نہ کرے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی طرح سے مشہور ہے۔ ان میں سے دو حکایتیں اہم ہیں۔ پہلی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۱: ایک سپاہی تلاشِ معاش میں اپنے ٹٹو پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ راستہ میں رات ہو گئی۔ سنسان مقام اور رات بھی اندھیری۔ کبھی کبھی بجلی کے چمکنے سے یہ خوف بھی تھا کہ بارش آنے والی ہے۔ اسے کچھ دور ایک چراغ کی روشنی نظر آئی۔ وہ وہاں پہنچا تو دیکھا ایک چھوٹی سی پرانی جھونپڑی ہے جس کے اندر ایک بڑھیا ہے۔ اس نے اس بڑھیا کی جھونپڑی میں پناہ لی اور اس سے پوچھا:

''مائی! یہاں شیر تو نہیں آتا۔ میں نے اپنا ٹٹو باہر ہی باندھ دیا ہے۔''

بڑھیا نے جواب دیا:

''بیٹا شیر ویر کی تو مجھے خبر نہیں کہ آتا ہے کہ نہیں اور نہ مجھے اس کا خوف ہے میں تو ٹپکے سے ڈر رہی ہوں کیوں کہ اس سے بچنا محال ہے۔''

اتفاق سے ایک شیر بھی ٹٹو کی تاک میں جھونپڑی کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس نے جو سنا تو وہ بھی چکر میں آگیا اور سوچنے لگا: ''یہ ٹپکا کیا وبال ہے جو مجھ سے بھی زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ بڑھیا مجھ سے بھی زیادہ اس سے ڈرتی ہے۔''

اسی اثنا میں سپاہی کا ٹٹو شیر کی بو پا کر ہنہنانے لگا۔ سپاہی سونٹا لے کر باہر نکلا اور اندھیرے میں شیر کو ٹٹو سمجھ کر مارنا شروع کر دیا۔ جب مارتے مارتے تھک گیا تو کان پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ شیر سمجھا کہ یہی وہ ٹپکا ہے جس سے بڑھیا ڈر رہی تھی۔ اس لیے اپنے کان دبائے ہوئے پٹتا رہا اور بغیر چوں چرا کے ساتھ چلا آیا۔ جب دو گھڑی رات رہ گئی تو سپاہی ٹٹو سمجھ کر اس پر سوار ہوا اور رات ہی میں ایک شہر میں جا پہنچا۔ یکا یک

بارش ہونے لگی۔ سپاہی نے اپنے ٹٹو (جو حقیقت میں شیر تھا) کو ایک پیڑ سے باندھ دیا اور خود ایک عمارت کے برآمدے میں جا کر پناہ گزیں ہوا۔ وہ عمارت اصل میں اس شہر کے بادشاہ کا محل تھا۔ جب سورج طلوع ہوا۔ لوگ اُدھر سے گزرے تو دیکھتے کیا ہیں کہ بادشاہ کے بائیں باغ میں ایک پیڑ میں شیر بندھا ہے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں دوڑ کر بادشاہ کے پاس گئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے سپاہی کو بلایا۔ اس کی ہمت، جواں مردی اور بہادری سے خوش ہو کر خلعت وانعام دیا۔ جاگیر عطا کیا اور اسے اپنی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور کر لیا۔

حکایت۲: دوسری حکایت معمولی فرق کے ساتھ اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ کسی ملک میں ایک آدم خور شیر نے سب کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ اس کو مارنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ بادشاہ نے ملک کے کونے کونے میں اعلان کرا دیا تھا کہ جو شخص اس شیر کو مار گرائے گا۔ اسے شایان شان انعام واکرام سے نوازا جائے گا اور جاگیر بھی عطا کی جائے گی۔ اس اعلان کے بعد بڑے بڑے سورما اور بہادر، شیر کو مارنے کیلئے نکل کھڑے ہوئے مگر سبھی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسی ملک کے کسی شہر کے کنارے ایک لاوارث بڑھیا اپنی جھونپڑی میں رہتی تھی۔

برسات کا موسم تھا۔ بڑھیا ہی کی طرح اس کی جھونپڑی کی حالت بھی خستہ تھی۔ ذرا پانی برسا کہ جھونپڑی ٹپکنا شروع ہو گئی۔ پانی آدھے گھنٹے برستا تو جھونپڑی دو گھنٹے ٹپکتی۔ ایک روز شام ہوتے ہی بادل گھر آئے۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ دور دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں تیز بارش ہونے لگی۔ جھونپڑی ٹپ ٹپ کر ٹپکنے لگی۔ بڑھیا پریشان اور بے بس ہو کر خود سے بڑبڑانے لگی۔ ایسی زندگی سے تو اچھا ہے کہ مجھے آدم خور شیر ہی کھا جائے۔ اس ٹپکے سے تو پیچھا چھوٹے گا۔ اتفاق سے وہ آدم خور شیر بارش سے بچنے کے لیے جھونپڑی کے پیچھے اوٹ میں کھڑا تھا۔ بڑھیا کی باتیں سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے سوچا کہ یہ ٹپکا کیا بلا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اسی لیے تو بڑھیا میرے بجائے اس سے ڈر رہی ہے۔ شیر ابھی کھڑے یہی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک دھوبی جس کا گدھا کھو گیا تھا، اپنے گدھے کو کھوجتا ہوا ادھر آنکلا۔ اندھیرے میں جھونپڑی کی اوٹ میں کھڑے شیر کو اپنا گدھا سمجھ کر رسی سے باندھ دیا اور کان پکڑ کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ شیر یہ سوچ کر مار کھاتا رہا کہ یہی وہ ٹپکا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اسی سے بڑھیا ڈر رہی تھی۔ دھوبی اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اپنے گھر آیا اور اسے اسی کھونٹے سے باندھ دیا جس سے گدھے کو باندھتا تھا۔ ابھی رات کا ایک پہر باقی تھا۔ دھوبی اپنے گھر کے اندر گیا اور

سو گیا۔ جب لوگوں نے صبح کو دھوبی کے دروازہ پر کھونٹے سے بندھے شیر کو دیکھا، حیرت میں پڑ گئے۔ دھیرے دھیرے وہاں بھیڑ لگ گئی اور ہر طرف شور ہو گیا کہ دھوبی بہت بہادر نکلا۔ آدم خور شیر کو زندہ پکڑ کر اپنے کھونٹے سے باندھ دیا ہے۔ جب اس ملک کے راجا کو خبر ہوئی تو اس نے دھوبی کی جواں مردی، جرأت و ہمت اور بہادری کی داد دی اور منہ مانگے انعام و اکرام سے نوازا۔

ٹیٹری سے آسمان نہیں تھمتا

دیکھیے: ٹیٹری سے کہیں آسمان تھما ہے۔

ٹیٹری سے کہیں آسمان تھما ہے

جب کوئی شخص اپنی طاقت، حیثیت یا بساط سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرے یا زمین آسمان کے قلابے ملانے کی ڈینگ مارے تو اس کیلئے یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ٹیٹری کی عادات و اطوار ہیں۔

ٹیٹری کی عادات واطوار

مشہور ہے کہ ٹیٹری نام کی چڑیا جب بھی سوتی ہے تو چت سوتی ہے اور اپنی دونوں ٹانگوں کو آسمان کی طرف اٹھائے رہتی ہے کیوں کہ اسے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں آسمان اس کے اوپر نہ گر پڑے۔ آسمان کو روکنے کیلئے ہی وہ اپنے دونوں پیروں کو اوپر کیے رہتی ہے۔

(اس چڑیا کا سر لال، گردن سفید، پَر چت کبرے، بیٹھ کھیرے رنگ کی، دم ملے جلے رنگوں کی اور چونچ کالی ہوتی ہے۔ یہ پانی کے کنارے رہتی ہے۔ یہ "ٹیں ٹیں" کر کے بولتی ہے۔ اسے ٹیٹری کہا جاتا ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ یہ مینہ کی دعا مانگا کرتی ہے۔ زمین پر پانی نہیں پیتی جب مینہ برستا ہے تو اوپر ہی منہ کھول کر برستا ہوا پانی پیتی ہے)۔

ٹیڑھی کھیر ہے

مشکل اور دشوار کام ہے۔ جب کوئی شخص ایسے کام کے لیے تیار ہو جو اس کے بس کا نہ ہو تو یہ مثل

کہتے ہیں۔ یہ مثل اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کام کو اپنی استطاعت سے زیادہ خیال کرے اور کام کرنے سے انکار کردے۔ اس مثل کا قصہ اس طرح مشہور ہے:

حکایت: ایک نابینا حافظ کی ایک شخص سے دوستی تھی۔ جہاں کہیں دعوت ہوتی وہ شخص نابینا کو چھڑی پکڑ کر راستہ بتاتا چلتا تھا۔ جب کھانے کے لیے بیٹھتے تو وہ شخص دستر خوان پر لگی ہوئی چیزوں کے بارے میں نابینا کو بتاتا جاتا تھا اور کھانے کے بعد ان کو ان کے گھر تک پہنچا دیتا تھا۔

ایک دن بڑے سرکار کی درگاہ میں لنگر تھا۔ اس شخص نے اپنے نابینا ساتھی سے کہا:

''آج شام کو بڑے سرکار کی درگاہ پر چلنا ہے۔ میں آپ کے گھر آپ کو لینے کے لیے آجاؤں گا۔ میرا انتظار کیجیے گا۔''

وقت پر نابینا کا دوست ان کے گھر پہنچ گیا۔ دونوں لوگ گھر سے روانہ ہوئے بڑے سرکار کی درگاہ پہنچے۔ وہاں دستر خوان لگے ہوئے تھے۔ لوگ کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ یہ دونوں بھی ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ نابینا نے دیوار کے سہارے اپنی کمر ٹکا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد برتنوں کی کھنکھناہٹ شروع ہوئی۔ چمچوں کی آواز آئی۔ نابینا نے اپنے دوست سے کہا:

''بڑا اچھا انتظام معلوم ہوتا ہے''

دوست نے جواب دیا:

''بڑے سرکار کا لنگر ہے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

نابینا بولے:

''جزاک اللہ!''۔ ذرا دیر کے بعد قابوں میں کھیر اتاری گئی۔

دوست نے اپنی اور نابینا کی قاب بھروا کر رکھ لی اور کہنے لگا:

''لیجیے۔ حافظ جی! بسم اللہ کیجیے۔''

نابینا حافظ نے پوچھا:

''بھلے آدمی یہ تو بتاؤ، دستر خوان پر کیا ہے؟''

دوست نے کہا:

''بھائی اس وقت کچھ نہ پوچھیے۔ بڑے مزے کی کھیر ہے، ہونٹ چپک جائیں گے، زبان چٹخارے لے گی۔''

نابینا نے کہا:

''اچھا یہ بات ہے، مگر یار یہ تو بتاؤ! کھیر ہوتی کیسی ہے؟''

دوست: سفید سفید ہوتی ہے۔

نابینا: سفید کس کو کہتے ہیں۔

دوست: بس یوں سمجھ لیجئے، جیسا بگلا ہوتا ہے۔

نابینا: میاں بگلا کیسا ہوتا ہے؟

دوست نے اپنا ہاتھ کہنی تک موڑ کر نابینا کے منہ کے سامنے کر دیا اور کہا:

''ایسا ہوتا ہے۔''

نابینا نے اس کے ہاتھ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ انگلیوں سے کہنی تک اپنا ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا:

''بھائی یہ بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم سے نہیں کھائی جائے گی۔''

جاٹ رے جاٹ! تیرے سر پر کھاٹ، تیلی رے تیلی! تیرے سر پر کولہو

دیکھیے: قافیہ نہ ملے گا بوجھ سے تو مرے گا۔

جاٹ مرا تب جانیئے، جب تیجہ ہو جائے

جاٹ کو مرا ہوا اس وقت سمجھنا چاہئے۔ جب اس کا تیجہ (یعنی مرنے کے بعد تیسرے دن ہونے والی رسم) نہ ہو جائے۔ کسی مشتبہ بات یا چیز پر اس وقت تک یقین نہیں کرنا چاہئے جب تک اس سے متعلق تمام شک وشبہات دُور ہو جائیں اور اس کی اصلیت کا پتا نہ چل جائے۔ جب کوئی شخص کسی بات پر فوراً یقین کر لے یا مشتبہ بات کو بھی سچ مان لے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک جاٹ نے کسی بنیے سے سود پر ایک موٹی رقم قرض لی۔ کئی سال گزر گئے مگر جاٹ نے اصل رقم تو کیا سود کا بھی ایک پیسہ بنیے کو واپس نہیں کیا۔ بنیا پریشان ہو گیا۔ اس کو اپنی رقم کی فکر ہوئی۔ اس

طرح کئی سال کے عرصہ میں سود ملا کر رقم بڑھتے بڑھتے دوگنی سے زائد ہوگئی تھی۔ اب بنیا تقاضے پر تقاضہ کرنے لگا۔ جاٹ کے پاس اتنا روپیہ بھی نہیں تھا کہ وہ قرض ادا کر سکتا۔ بنیے سے اپنی جان کا پیچھا چھڑانے کیلئے اس نے ایک دن بنیے کے پاس اپنے مر جانے کی خبر پہنچا دی۔ بنیے کو اس کے مرنے کا افسوس کم اپنی رقم ڈوبنے کا ملال زیادہ ہوا۔ بنیا کچھ شک وشبہ میں مبتلا، بھاری من سے اس کے گھر پہنچا۔ اس نے اس کی بیوی اور رشتہ داروں سے رنج وغم کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جنازہ تیار ہوا۔ لوگوں نے ارتھی کو کاندھے پر اٹھایا اور تدفین کے لیے لے چلے۔ بنیا بھی جنازے میں شریک قبرستان تک پہنچا۔ جنازے کو دفن کر دیا گیا۔ قبرستان سے تھوڑی دور ایک گاؤں تھا۔ بنیے نے سوچا جب یہاں تک آ گئے ہیں تو اس گاؤں میں بھی ہو آؤں۔ اس گاؤں میں بھی بنیے کا ایک قرض دار تھا۔ اس نے سوچا شاید کچھ رقم ہاتھ آ جائے۔ وہ اس گاؤں کی طرف قدم بڑھاتا ہوا چلا گیا۔ جاٹ کے رشتہ داروں نے جب یہ سمجھ لیا کہ اب بنیا بہت دور نکل گیا ہے تو انہوں نے جلدی جلدی قبر کھودنا شروع کی۔ قبر کی مٹی ہٹتے ہی جاٹ قبر سے باہر زندہ نکل آیا اور رشتے داروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا آپ لوگوں کی مدد ہی سے بنیے سے میری جان چھوٹی ہے۔ اب کچھ دن روپوش رہوں گا۔ ادھر بنیا جس سے قرض لینے گیا تھا۔ وہ شخص اپنے گھر میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا الٹے پاؤں ہی لوٹ پڑا اور قبر پر اسی وقت پہنچ گیا جس وقت جاٹ اور اس کے رشتہ دار آپس میں خوشی کے مارے گلے مل رہے تھے۔ بنیے نے جاٹ کو زندہ دیکھ کر حیرت سے کہا:

''جاٹ مرا تب جانئے، جب تیجہ ہو جائے۔''

(بعض لوگ جاٹ کی جگہ میو کا استعمال کرتے ہیں اور کہاوت اس طرح کہتے ہیں ''میو موا تب جانئے، جب تیجہ ہو جائے'')

جاگتے کی کٹیا، سوتے کا کٹڑا

جو جاگتا ہے اس کی بھینس کٹیا یعنی پڑیا جنتی ہے اور جو سوتا ہے اس کی بھینس کٹڑا یعنی پڑوا جنتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہوشیار اور چالاک شخص فائدہ اٹھاتا ہے، غافل اور بے خبر شخص کو ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک کہانی اس طرح مشہور ہے۔

کسی گاؤں میں دو گوالے آپس میں گہرے دوست تھے۔ ان کے پاس کچھ بھینسیں تھیں۔ اتفاق سے دونوں کی ایک ایک بھینس کا بچہ جننے کا وقت آ گیا تھا۔ ان میں سے ایک گوالا بہت چالاک تھا۔ وہ ہمیشہ

ہوشیار رہتا تھا۔ دوسرے گوالے کی عادت غافل اور بے خبر رہنے کی تھی۔ ایک رات جب دونوں کی بھینس بچے جن رہی تھیں تو چالاک دوست جاگ رہا تھا اور ان کے پاس موجود تھا۔ دوسرا گوالا گھر کے اندر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ جاگنے والے گوالے کی بھینس نے کٹرا یعنی نر بچہ جنا اور جو سورہا تھا اس کی بھینس نے کٹیا یعنی مادین بچہ کو جنم دیا۔ چالاک گوالا جو وہاں موجود تھا اس نے فوراً اپنی بھینس کے نر بچے کو اپنے دوست کی بھینس کے آگے ڈال دیا اور اس کی بھینس کے مادین بچہ کو اٹھا کر اپنی بھینس کے پاس رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے غافل دوست کو جا کر جگایا اور بھینسوں کے بچہ جننے کی اطلاع دی۔ دوست نے پوچھا:

''کہو یار کس کی بھینس نے کیا جنا؟''

چالاک دوست نے جواب دیا:

''تمہاری بھینس نے کٹرا دیا ہے اور میری بھینس نے کٹیا جنی ہے۔''

یہ سن کر اس دوست نے جواب دیا:

''یوں کیوں نہیں کہتے کہ جاگتے کی کٹیا، سوتے کا کٹرا۔''

جانور ہی تو ہے

معصوم ہے، کچھ شعور نہیں ہے۔ جب کوئی شخص ہر حال میں اپنی بات منوائے یا اپنی کہی ہوئی بات کی تردید اپنے بچاؤ کے لیے بے جھجک کرے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح مشہور ہے:

کہانی: ایک قاضی نے اپنے بیل کو کسی تیلی کی سپردگی میں اس شرط پر دے دیا تھا کہ وہ اس بیل سے کولہو وغیرہ چلانے کا کام لے اور اس کے عوض میں روزانہ ایک سیر تیل قاضی کے گھر بھجوا دیا کرے۔ بیل کو کھلانے پلانے کی ساری ذمہ داری تیلی کی ہوگی۔ تیلی نے قاضی صاحب کے بیل کو کھلی اور گھاس وغیرہ کھلا کھلا کر خوب موٹا تازہ کر دیا۔ اتفاق سے ایک دن قاضی کے بیل نے تیلی کے بیل کو سینگ مار مار کر ہلاک کر دیا۔ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا تو انہیں یہ اطلاع دی گئی کہ تیلی کے بیل نے قاضی صاحب کے بیل کو مار ڈالا ہے۔ قاضی جی نے اپنی لال کتاب کھولی اور اس میں دیکھ کر کہا:

لال کتاب میں نکلا یوں — تیلی بیل لڑایا کیوں
کھلی کھلا کے کیا مسٹنڈ — بیل کا بیل اور ڈنڈ کا ڈنڈ

یعنی تیلی بیل کے بدلے بیل بھی دے اور جرمانہ بھی ادا کرے۔ تیلی یہ فیصلہ سن کر گھبرا گیا اور متعجب ہو کر نہایت ادب سے دبی زبان میں قاضی صاحب سے عرض کیا:

''حضور میرے بیل نے آپ کے بیل کی جان نہیں بلکہ آپ کے بیل نے میرے بیل کو سینگ مار مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

یہ سن کر قاضی جی فوراً بولے:

''جانور ہی تو ہے۔''

جب تک نبھے گی کھائیں گے، نہیں تو اپنے گھر کو جائیں گے

جب تک فریب اور دوسروں کو بے وقوف بنا کر کام چلے گا، موج کریں گے۔ جو شخص چکنی چپڑی باتوں کے ذریعہ یا خود کو باکمال ظاہر کر کے دوسرے کو فریب اور جُل دے، اس کے لیے یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں ایک غریب، ان پڑھ اور جاہل برہمن رہتا تھا۔ روزی روٹی کی فکر میں ایک روز وہ راج دربار میں پہنچا۔ اس نے راجا سے کہا:

''مہاراج! میں بہت بڑا گیانی ہوں۔ اس ملک میں مجھ سے بڑا کوئی دوسرا پنڈت نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے دیوالیہ میں جاپ کرنے کی اجازت دے دیں تو آپ کا کلیان ہوگا، پرجا سکھی رہے گی۔''

بادشاہ نے اسے جاپ کرنے کی اجازت دے دی۔ اسے جاپ کرنا تو آتا نہیں تھا مگر دیوالیہ میں جا کر آنکھ بند کر کے ''جاپ جپی بھئی جاپ جپی'' کہہ کر جاپ کرنے لگا۔ بادشاہ سمجھا یہ بہت پہنچا ہوا پنڈت ہے۔ اتفاق سے ایک دوسرا پنڈت بھی وہاں آپہنچا۔ اس نے پہلے پنڈت کو ''جاپ جپی بھئی جاپ جپی'' کہہ کر جاپ کرتے سنا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ پنڈت نہیں بلکہ کوئی جاہل برہمن ہے جو راجا کو ٹھگنے کی غرض سے ایسا کر رہا ہے۔ دوسرا برہمن بھی جاہل تھا۔ وہ بھی جاپ کرنے بیٹھ گیا اور جاپ کے انداز میں کہنے لگا ''تم بھی جپو، ہم بھی جپیں، تم بھی جپو، ہم بھی جپیں'' اتنے میں ایک تیسرا جاہل پنڈت بھی وہاں آگیا۔ دونوں پنڈتوں کو اس طرح جاپ کا ڈھونگ کرتے دیکھ کر دونوں کے قریب آنکھ بند کر کے بیٹھ گیا اور اس طرح کہنے لگا:

''یہ اندھیر کب تک چلی، یہ اندھیر کب تک چلی''

راجا اور اس کے درباری سمجھ رہے تھے کہ تینوں پنڈت جاپ کر رہے ہیں۔ اتنے میں ایک چوتھا برہمن بھی آ گیا اور جاپ پر بیٹھتے ہی کہنے لگا: "جے دن چلی تے دن کھائی، جے دن چلی تے دن کھائی"

آخر میں پانچواں برہمن آیا اور برجستہ کہنے لگا: "نہیں تو اپنے گھر کو جائیں گے۔"

جب خدا ہو مہربان تو اَرہَر کے کھیت میں گدھا ہلاوے کان

خدا جب دیتا ہے تو بے توقع، بے گمان اور بے مانگے دولت دیتا ہے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی کو کہیں سے اچانک خزانہ مل جائے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح مشہور ہے:

کہانی: کسی بادشاہ نے اپنے خزانے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا چاہا۔ اس نے تمام خزانے کو کئی گدھوں پر لدوا دیا اور اپنے عملے کی نگرانی میں گدھوں کو روانہ کروا دیا۔ جس راستے سے خزانہ جا رہا تھا آس پاس بہت سے کھیت تھے۔ اتفاق سے ایک گدھا اَرہَر کے کھیت میں گُھس گیا۔ بادشاہ کا کوئی آدمی اس گدھے کو کھیت میں گھستے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔ دوسرے دن جب کھیت کا مالک کھیت کے اندر گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک گدھا، جس پر کچھ سامان لدا ہوا ہے، کھڑا ہوا اپنے کان ہلا رہا ہے۔ اس نے پاس جا کر دیکھا تو اس پر خزانہ لدا ہوا تھا۔ خزانہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سارا خزانہ اپنے قبضے میں کر لیا اور گدھے کو مار کر بھگا دیا۔ کسان جب خزانہ لے کر اپنے گھر پہنچا اور اپنی بیوی کو کل حال بتایا تو اس کی بیوی نے کہا:

"جب خدا ہو مہربان تو ارہر کے کھیت میں گدھا ہلاوے کان۔"

جتنی چادر دیکھیے، اتنے پاؤں پسارئیے

دیکھیے: جتنی چادر دیکھیے، اتنے پاؤں پھیلائیے۔

جتنی چادر دیکھیے، اتنے پاؤں پھیلائیے

حوصلہ، بساط اپنی حیثیت سے باہر کوئی قدم نہیں رکھنا چاہئے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ اکبر بادشاہ نے جاڑے کے موسم میں غریبوں کو بانٹنے کیلئے کچھ لحاف تیار کرائے۔ اس کا سارا انتظام بیربل کے سپرد تھا۔ اکبر نے بیربل کو حکم دیا تھا کہ جب لحاف تیار ہو جائیں تو ان کے سامنے ضرور پیش کیے جائیں۔ جب لحاف تیار ہو گئے تو بیربل نے بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے پیش کیے۔ بادشاہ نے ایک لحاف کو خود اوڑھ کر دیکھا تو ان کے پاؤں لحاف کے باہر نکل گئے کیوں کہ لحاف کی لمبائی کم تھی اور اکبر کی لمبائی زیادہ تھی۔ اکبر نے بیربل سے کہا:

''لحاف تو چھوٹا ہے اور میرے پیر باہر نکلے ہیں۔''

بیربل نے برجستہ جواب دیا:

''جتنی چادر دیکھیے، اتنے پاؤں پھیلایئے۔''

جتنی سوڑھ دیکھیے، اتنے پاؤں پسارئیے

دیکھیے: جتنی چادر دیکھیے، اتنے پاؤں پھیلایئے۔

جدھر مولا، ادھر آصف الدولہ

کوئی چاہے جتنی کوشش اور تدبیر کرے مگر جو اس کے مقدر میں ہوتا ہے اس کو وہی ملتا ہے۔ اس مثل کے تعلق سے یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے:

حکایت: ایک بار نواب آصف الدولہ کے یہاں ایک فقیر آیا اور عرض کیا:

''حضور! میں آپ کی سخاوت کے چرچے سن کر حاضر ہوا ہوں۔ ایک ایک دانے کے لیے محتاج ہوں۔ کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ اگر آپ کی نظر عنایت ہو جائے تو بندے کے دن پھر جائیں۔''

نواب نے کہا:

''مرضی مولا میں کون دخل دے سکتا ہے۔ جو تمہارے مقدر میں ہے وہ تم کو ضرور ملے گا۔''

نواب نے اپنے وزیر کو بلا کر کہا:

''ان کے سامنے ایک روپیوں سے اور دوسری پیسوں سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھ دو۔ ان

میں سے ایک تھیلی ان کی ہوگی۔"

وزیر نے دونوں تھیلیاں فقیر کے سامنے لاکر رکھ دیں۔ فقیر سے کہا گیا جس تھیلی کو تم اٹھالو گے وہ تمہاری ہوگی۔ فقیر نے ایک تھیلی اٹھالی اور اسے کھول کر دیکھا تو اس میں پیسے تھے۔ نواب نے کہا:

"جو تمہارے مقدر میں تھا وہ تم کو مل گیا۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں؟ جدھر مولا، ادھر آصف الدولہ"

جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی کھسوٹے

دیکھیے: جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی کھونٹے۔

جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی کھونٹے

احسان فراموش اور محسن کش کے متعلق کہتے ہیں یعنی محسن کو تکلیف دینے والا شخص۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص اسی کو نقصان پہنچائے جس سے اس نے فائدہ حاصل کیا ہو یا جو اس کا محسن ہو۔ یہ تلمیحی کہاوت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

واقعہ: فرعون قدیم مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ اپنے بادشاہ کو سورج کا دیوتا "آمن رع" کا اوتار سمجھتے تھے جو وہاں کے تمام دیوتاؤں میں بلند و برتر تھا۔ مصر کے ان بادشاہوں نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ یہ نہایت متکبر، سرکش اور مغرور تھے۔ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جانی دشمن تھا۔ اس نے ہزاروں معصوم بچے قتل کرا دیے تھے۔ کسی کا جانی دشمن اس کا محسن نہیں ہوسکتا۔ فرعون نے سیّدنا موسیٰ علیہ السلام پر کوئی احسان نہیں کیا مگر اردو میں اس کہاوت کے معانی و مطالب محسن کش، احسان فراموش وغیرہ کے ہیں جو قطعی غلط اور نا سمجھی کی دلیل ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل فرعون نے ایک خوفناک خواب دیکھا تھا۔ جس کی تعبیر منجموں اور کاہنوں نے یہ بتائی تھا کہ حکومت فرعونی کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھوں ہوگا۔ اس کو سن کر فرعون نے اپنے قلمرو میں ایک جماعت مقرر کردی کہ ہر اسرائیلی لڑکے کو پیدا ہوتے ہی قتل کردیا جائے۔ اس طرح فرعون کے حکم سے ہزاروں معصوم بچے پیدا ہوتے ہی قتل کردیے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب پیدا ہوئے تو ان کے گھر والوں نے تین مہینے تک تو لوگوں کی نگاہوں سے بچائے رکھا لیکن جاسوسوں

کی دیکھ بھال کڑی تھی اور بہت دنوں تک انہیں پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے خوف کی وجہ سے ان کی والدہ نے تابوت کی مانند ایک صندوق میں بند کر کے اس صندوق کو دریائے نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت پہلے ہی سنادی تھی کہ ہم اس بچے کو تیری جانب واپس کر دیں گے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا۔ یہ صندوق بہتا ہوا جب محل شاہی کے سامنے سے گزرا تو فرعون کی بیوی آسیہ نے اسے نکلوا لیا۔ جب صندوق کو کھول کر دیکھا گیا تو اس میں ایک خوب رو اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ فرعون نے اس کو قتل کروانا چاہا مگر اس کی بیوی نے کسی بھی قیمت پر بچہ کو قتل نہ ہونے دیا اور اسے اپنا بیٹا بنا کر اس کی بڑے لاڈ اور پیار سے پرورش کرنے لگی۔ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام اس طرح عرصۂ دراز تک شاہی تربیت میں پلتے اور بڑھتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ زمانۂ طفولیت میں ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرعون کی ڈاڑھی موتیوں اور جواہرات سے مرصع تھی۔ بچوں کی عادت کے مطابق انہوں نے فرعون کی ڈاڑھی کو نوچ لیا۔ اس حرکت پر فرعون کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی وقت قتل کر دینے کا حکم دے دیا مگر اس کی بیوی آسیہ نے ان کی سفارش کی اور کہا:

''بچہ معصوم ہوتا ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ بچے کے نزدیک تو تمرہ یعنی کھجور اور جمرہ یعنی چنگاری دونوں ہی برابر ہیں۔''

فرعون نے کہا:

''میں ابھی اس کا امتحان لیتا ہوں۔ اگر اس نے آگ یعنی چنگاری کو دیکھ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ معصوم نہیں ہے اور میں اسے قتل کرادوں گا۔''

فرعون نے اسی وقت ایک طشت میں دہکتی ہوئی آگ کے انگارے منگائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کر دیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ انگارا اٹھا لیا اور اس کو اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اس آگ سے جلنے کا نشان ان کی ہتھیلی پر پڑ گیا اور زبان جلنے سے لکنت پیدا ہوگئی۔

جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی نوچے

دیکھیے: جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی کھونٹے۔

جس کی لاٹھی اس کی بھینس

طاقتور ہی کا سب کچھ ہے۔ جب کوئی طاقتور اپنے بل بوتے پر زبردستی کسی کمزور کا مال اپنے قبضے میں کر لے تو یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک بار کوئی شخص بازار سے ایک بھینس خرید کر اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں سنسان جنگل پڑتا تھا۔ جس وقت وہ سنسان راستے سے گزر رہا تھا کہ راستے میں ایک چور ملا۔ چور نے اس کا راستہ روک لیا اور ڈرا دھمکا کر کہا کہ "بھینس میرے حوالے کر دو"۔ جب بھینس والے نے آنا کانی کی تو چور نے لاٹھی تان کر کہا:

"اگر تم بھینس نہیں دو گے تو اسی لاٹھی سے تمہارے سر کو چکنا چور کر دوں گا۔ پھر تم کو بھینس کے ساتھ ساتھ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اچھائی اسی میں ہے کہ بے چوں و چرا بھینس میرے حوالے کر دو اور اپنے گھر کا راستہ لو۔"

بھینس والے نے سوچا کہ معاملہ گڑبڑ ہے کہیں جان پر نہ بن آئے۔ بھینس دینے ہی میں عافیت ہے۔ اس نے بھینس کو چور کے حوالے کر دی اور اور نہایت عاجزی و انکساری سے کہا:

"اب یہ بھینس آپ کی ہے۔ راستہ سنسان ہے، اگر تم مجھے اپنی یہ لاٹھی دے دو تو میں اس کے سہارے اپنے گھر تک پہنچ جاؤں گا۔"

چور نے سوچا: "قیمتی بھینس تو مجھے مل گئی ہے، اب لاٹھی دینے میں کیا مضائقہ ہے۔"

اس نے بھینس والے کو اپنی لاٹھی دے دی۔ چور جوں ہی بھینس کو لے کر چلنے لگا۔ اس شخص نے لاٹھی تان کر کہا:

"اب کہاں جاتا ہے؟ تیری عافیت اسی میں ہے کہ بھینس کو چھوڑ کر بھاگ جا ورنہ تیرے سر کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔"

چور گھبرا گیا، معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس نے بھینس چھوڑ دی اور اپنی لاٹھی واپس مانگی۔ اس شخص نے جواب دیا:

"اب یہ لاٹھی تیرے ہاتھ آنے والی نہیں ہے کیوں کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔"

جس کی والدہ بولے گی، اس کا قبلہ گاہ کیوں نہ بولے گا

جو تھوڑا پڑھ کر غیر ملکی زبان بولنے لگتے ہیں اور اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے طنزاً یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

حکایت: کسی احمق کو فارسی سیکھنے کا شوق چرایا۔ وہ ایک فارسی کے استاد کے پاس گیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ استاد نے پہلے دن کچھ فارسی الفاظ کے معانی بتائے۔ استاد نے والدہ کا مطلب ماں اور قبلہ گاہ کا مطلب باپ بتایا مگر غلطی سے اس نے والدہ کے معنی بیوی اور قبلہ گاہ کے معنی شوہر رٹ لیے اور خود کو فارسی دان سمجھنے لگا۔ اتفاق سے ایک دن کسی بات کو لے کر اس کی بیوی کی ایک پڑوسن سے لڑائی ہوگئی۔ یہ شخص بھی اپنی بیوی کی حمایت میں بولنے لگا۔ اس پر پڑوسن نے اس شخص سے کہا:

"مستورات کی لڑائی میں مردوں کا کیا کام؟"

اس شخص نے پڑوسن کو جواب دیا:

"کیا کہتی ہو؟ مردوں کا کیا کام؟ تمہیں اتنا بھی شعور نہیں کہ "جس کی والدہ بولے گی، اس کا قبلہ گاہ کیوں نہ بولے گا؟"

اس پر وہاں موجود سبھی لوگ ہنس پڑے۔

جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم

دیکھیے: جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم، جس نے کی بے حیائی، اس نے کھائی دودھ ملائی۔

جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم، جس نے کی بے حیائی، اس نے کھائی دودھ ملائی

غیرت منداور تکلف والے ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں جب کہ بے شرم اور تکلف نہ کرنے والے موج کرتے ہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک زمیندار کے دو بیٹے تھے۔اس نے اپنے بیٹے کی شادی ایک مہذب گھرانے کی لڑکی کے ساتھ کردی۔ گونا کر کے اپنی بہو کو اپنے ساتھ لے آیا۔ زمیندار کی بیوی بہت چالاک تھی۔ وہ بہو کو بہت کم کھانا دیتی اور اس پر اپنا حکم چلاتی۔ دلہن شرم ولحاظ کی وجہ سے کچھ نہ کہتی۔ وہ ساس کی دست نگر بنی رہی۔ مسلسل تکلیف اٹھاتی رہی۔ کچھ عرصہ کے بعد زمیندار کے چھوٹے بیٹے کا بیاہ ہوا۔ ساس نے اپنی چھوٹی بہو کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کیا جیسا وہ بڑی بہو کے ساتھ کرتی تھی۔ چھوٹی بہو نہایت شوخ اور بے باک تھی۔ اس نے ساس کی چالاکی کو بھانپ لیا اور مناسب موقع کے انتظار میں رہی۔ کچھ عرصہ کے بعد چھوٹی بہو کے ایک بچہ ہوا۔ وہ اسی موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ رسوئی میں بچے کو دودھ دینے کے بہانے سے جاتی، دودھ کے برتن سے دودھ نکال کر پی لیتی اور جلدی جلدی ساری ملائی چٹ کر جاتی۔ جب اس طرح کئی روز گزر گئے تو ساس کو فکر ہوئی کہ دودھ اتنا کم کیسے ہو جاتا ہے اور ملائی کہاں چلی جاتی ہے؟ اس کو اپنی چھوٹی بہو پر شبہ ہوا۔ فوراً چھوٹی بہو کو بلایا اور اور پوچھا تو اس نے کہا:

''ہاں میں دودھ پیتی ہوں اور بالائی بھی کھاتی ہوں۔
جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔''

بڑی بہو بھی ساس اور دیورانی کی باتیں سن رہی تھی۔ سرد آہ بھر کر بولی:

''واقعی تم سچ کہہ رہی ہو۔ جس نے کی شرم، اس کے پھوٹے کرم۔ جس نے کی بے حیائی، اس نے کھائی دودھ ملائی۔ میں نہ شرم کرتی اور نہ بھوکی مرتی۔''

جسے نہ دے مولا، اسے دے آصف الدولہ

اس کہاوت سے لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کی سخاوت اور غرباء پروری کا پتا چلتا ہے۔ یہ کہاوت اس وقت بھی بولی جاتی ہے جب کوئی بڑا آدمی کسی ایسے شخص کی امداد کرے جس کا کوئی حامی و مددگار نہ ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

حکایت: نواب آصف الدولہ نہایت سخی اور رعایا پرور انسان تھے۔ ان کے دور حکومت میں زبردست قحط پڑا لوگ بے روزگار ہو گئے۔ ایک ایک دانے کے لیے لوگ تڑپنے لگے۔ نواب آصف الدولہ نے سوچا اگر یوں ہی رعایا کی امداد کردی جائے تو لوگ کاہل اور ناکارہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے آصفی امام باڑے کی تعمیر شروع کروادی۔ امام باڑہ بظاہر ایک لیکن در حقیقت تین منزلہ عمارت ہے۔ جس کے تین

درجے ہیں۔ امام باڑہ کی عمارت پانچ حصوں پر مشتمل ہے، جن میں تین دالان، ایک ہشت پہلو ہال اور ایک مربع ہال ہے۔ امام باڑے کے سامنے ملحق ایک وسیع وعریض چبوترہ ہے۔ دالانوں میں سے درمیانی دالان ۱۶۳ فٹ لمبا، ۵۳ فٹ چوڑا اور ۴۹.۵ فٹ اونچا ہے۔ دیواروں کی چوڑائی ۱۶ فٹ ہے۔ امام باڑے کے سامنے ایک مربع سبزہ زار ہے جس کے مغربی حصے میں بلند چبوترے پر مسجد ہے اور مشرق کی جانب باؤلی ہے جو بذاتِ خود کئی منزلہ عمارت ہے۔ اس کے علاوہ جلوخانہ، نوبت خانہ اور ایک باغ بھی موجود ہے۔ امام باڑے میں پہلی منزل سے لے کر تیسری منزل تک بھول بھلیاں ہے جس کے راستے اور در یکساں ہیں۔ دروں کی اونچائی اور چوڑائی اتنی ہے کہ بہ یک وقت ایک تندرست انسان گزر سکتا ہے۔ دروں کی تعداد ۴۸۹ اور راستے ہزار بیان کیے جاتے ہیں۔ مرکزی دالان کے وسط میں نواب آصف الدولہ کی قبر ہے اور ان کے پہلو میں ان کی زوجہ شمس النساء بیگم دفن ہیں امام باڑے کی تعمیر کی لاگت کا اندازہ اس زمانے کے ڈیڑھ کروڑ روپے سے کیا جاتا ہے۔ کام کرنے والوں کی تعداد بائیس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ اس امام باڑے کی تعمیر کا آغاز ۱۷۸۴ء میں دوران قحط رعایا پروری کے لیے ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ قلعے جیسی یہ عمارت برسوں میں تیار ہوئی ہوگی۔ بے روزگار، دانے دانے کیلئے محتاج قحط زدہ لوگ امام باڑے کی تعمیر میں حصہ لیتے تھے اور اپنی اُجرت سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ اسی لیے اس وقت بچہ بچہ کی زبان پر تھا کہ:

"جسے نہ دے مولا، اسے دے آصف الدولہ۔"

جگ جیتا موری کانی، بَرٹھاڑھ ہووے تب جانی

جب دونوں ہی طرف گڑبڑ ہو یا دونوں ہی طرف نقص ہو یا دونوں فریق ایک دوسرے سے چالاک ہوں تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی شخص کی ایک جوان مگر کانی لڑکی تھی۔ کانی ہونے کے سبب کوئی بھی لڑکا اس کے ساتھ بیاہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس کے والدین کب تک جوان لڑکی کو اپنے گھر بٹھائے رکھتے۔ ایک روز لڑکی کا والد پریشان ہو کر ایک پروہت کے پاس گیا۔ پروہت نے دھوکا دے کر اس کانی لڑکی کی شادی ایک نوجوان کے ساتھ طے کر دی۔ کسی طرح لڑکے والوں کو اس کی بھنک لگ گئی کہ لڑکی والوں نے پروہت کو روپے دے کر اپنی کانی لڑکی کا بیاہ ان کے لڑکے کے ساتھ طے کرا دیا ہے تو ان لوگوں نے ایک لنگڑے

لڑکے کو دولہا بنایا اور مقررہ تاریخ پر بارات لے کر لڑکی والوں کے یہاں پہنچ گئے۔ جب بیاہ کی تمام رسوم ادا ہو گئیں یعنی جب بیاہ مکمل ہو گیا تو پروہت نے کہا:

''جگ جیتا موری کانی۔''

اس کے جواب میں لڑکے والوں میں سے کسی نے کہا:

''بَر ٹھاڑھ ہووئے تب جانی۔''

یعنی جب دولہا کھڑا ہو گا تب سمجھ میں آئے گا۔

جُلاہا جانے جو کاٹ

جلاہے کو کیا پتا کہ جو کی فصل کیسے کاٹی جاتی ہے؟ جب کوئی شخص کسی ایسے کام کو کرنا چاہے یا کرے جس کا اسے قطعی تجربہ نہ ہو تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی جلاہے نے ایک مہاجن سے کچھ روپے سود پر قرض لیے مگر ایک عرصہ تک اس نے نہ تو اصل رقم ہی واپس کی اور نہ اس کا سود۔ جب کئی بار تقاضہ کرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تو مہاجن نے جلاہے سے محنت لے کر اپنی رقم وصول کرنی چاہی۔ جلاہا مرتا کیا نہ کرتا، راضی ہو گیا۔ مہاجن نے پہلے دن اس سے جو کی فصل کاٹنے کیلئے کہا:

''لہٰذا وہ کھیت پر پہنچ گیا اور جو کی فصل کاٹنے کے بجائے جو کے جھکے ہوئے خوشوں کو سوت کی طرح سلجھانے لگا۔''

جماعت سے کرامت

دیکھیے: اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔

جماہی موت کا بلاوا

جماہی آنی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جب کسی کو جماہی آتی ہے تو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق ایک حکایت سے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک نواب نے اپنے درباریوں کو حکم دیا تھا کہ جب ان کو جماہی آئے تو وہ اپنی اپنی چٹکی بجادیا کریں۔ نواب اوران کے درباری سمجھتے تھے کہ جماہی آنا اچھا نہیں ہوتا۔ جس کو جماہی آتی ہے۔ اس کی موت قریب ہوتی ہے مگر اس کا تدارک چٹکی بجانا ہے۔ چٹکی بجانے سے موت کا فرشتہ بھاگ جاتا ہے۔ ایک روز ایک چوبے جی نواب کے درباریوں میں شامل کر لئے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ جب نواب کو جماہی آتی ہے تو تمام درباری چٹکیاں بجانے لگتے ہیں اور اس وقت تک بجاتے رہتے ہیں جب تک جماہی ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک روز اس نے درباریوں سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ"

"جماہی آنا مبارک ہے۔ یہ موت کا بلاوا ہے۔ جب فرشتہ قضا قریب آتا ہے تو جماہی آنے لگتی ہے۔ ہم لوگ اسی کو ڈرانے کیلئے چٹکیاں بجاتے ہیں، وہ ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔ جماہی ختم ہو جاتی ہے اور نواب صاحب کی جان محفوظ ہو جاتی ہے۔"

دوسرے دن چوبے جی دربار میں ایک سونٹا لے کر پہنچے اور کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جیسے ہی نواب صاحب کو جماہی آئی اور دوسرے درباریوں نے چٹکیاں بجانا شروع کیں۔ یہ سونٹا لے کر اٹھے اور نواب صاحب کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور کہنے لگے:

"موت کا فرشتہ چٹکی بجانے سے جانے والا نہیں ہے، میں آج اس کی خبر سونٹے سے لوں گا۔ اس کے بعد یہ کبھی نہیں آئے گا۔"

جمع کے ڈبّو آنکھیں کھولو

یہ کہاوت ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی چالاک شخص کسی سادہ لوح کو ٹھگ لے اور وہ بے چارہ ہاتھ ملتا رہ جائے۔ اس کہاوت کے تعلق سے یہ کہانی بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی قصبہ میں ایک نہایت ہوشیار اور چالاک آدمی رہتا تھا مگر بہت کام چور بھی تھا۔ محنت سے جی چراتا تھا۔ وہ کسی طرح سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی نوکری مستقل ہو گئی۔ گزر بسر کے لیے اس کی تنخواہ کافی تھی۔ اب اس نے اپنی زندگی ٹھاٹ سے بسر کرنا شروع کر دی۔ ہر مہینے اس کا خرچ بڑھتا جاتا تھا۔ ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ شاہانہ خرچ کا عادی ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد تنخواہ میں پورا نہیں پڑتا تھا۔ اس نے دستِ غیب کی کارروائی شروع کر دی۔ لوگوں سے خوب رشوت لینے لگا۔ آخر کار ایک مرتبہ رشوت لینے کے الزام میں پکڑا گیا۔ مقدمہ چلا اور اس پر جرم ثابت ہو گیا۔ نوکری سے بھی برخاست

کر دیا گیا۔ اب اس کے گھر میں ابتری پھیل گئی۔ بیوی بچے دانے دانے کیلئے محتاج ہو گئے۔ جب تک سپاہی تھا، شاہانہ ٹھاٹ باٹ تھا۔ رشوت کی رقم سے عیش و آرام کا اور بھی عادی ہو گیا تھا۔ کام چور، کاہل اور پھر سپاہی رہنے کی وجہ سے اس کے لیے دوسرا کام کرنا بھی مشکل تھا۔ اس کی بیوی روز طعنے دیتی کہ:

''ساری دنیا تو سپاہی بن کر زندگی نہیں گزارتی۔ کام کرنے والوں کے لیے ہزاروں کام ہیں۔ تم سے تو کچھ ہوتا ہی نہیں۔''

بیوی کے روز روز کے طعنوں اور تنگ دستی سے تنگ آ کر وہ ایک دن کسی ویرانے میں جا پہنچا۔ وہاں ایک الو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر اپنے گھر لے آیا۔ بیوی الو کو دیکھتے ہی جل بھُن گئی۔ اس نے بے نقط سُنانا شروع کیں:

''بس اسی منحوس کے سایہ کی کمی تھی۔ اب جو کچھ گھر میں ہے وہ بھی تباہ و برباد ہو جائے گا۔ سارا گھر اجڑ جائے گا۔ اس کی آواز سے تو بستیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ موا جس درخت پر بیٹھ جاتا ہے اس کی ہریالی غائب ہو جاتی ہے۔ بس ٹھونٹ ہی ٹھونٹ رہ جاتا ہے۔ آخر تمہاری عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے ہیں؟ اس سے تو بٹیر لڑوانے، بندر اور بھالو نچانے ہی کا کام اچھا۔ بھلا اپنے ہاتھوں کوئی اپنی قبر کھودتا ہے۔''

سپاہی نے اپنی بیوی سے کہا:

''کچھ نہیں کرتا تو بڑبڑاتی ہو۔ کچھ کرتا ہوں تو بگڑتی ہو تمہیں کسی طرح بھی چین نہیں۔ آخر کیا چاہتی ہو؟ اگر تم ایسی دانا بینا ہو تو خود ہی کچھ کر کے دکھاؤ۔ ذرا صبر و تحمل سے میرے کام کا انجام تو دیکھ لو۔ کس نے کہا ہے کہ الّو منحوس ہوتا ہے۔ بس بات یہ ہے کہ کسی نے اپنے گھر میں اس پرندے کو کبھی رکھا نہیں ہے۔ طوطا، مینا، مرغ، بٹیر، بطخ، کبوتر وغیرہ سب ہی پالتے رہے تو وہ پرندے مبارک و متبرک ہو گئے۔ اس بے چارے کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا تو وہ کس کے گھر میں زبردستی گھُستا۔ آخر ویرانے میں رہنے لگا تو منحوس قرار پایا۔ ہمارا سماج بھی کیا ہے جسے چاہے مبارک کہے جسے چاہے منحوس کہے۔''

بیوی تنک کر بولی:

''اے ہے تم بڑے پیر پیغمبر ہو۔ تمہاری شریعت نرالی ہے۔ اس منحوس الّو کو مبارک بنا کر دکھا دو تو جانوں۔''

سپاہی نے جواب دیا:

''دیکھ لینا، تھوڑی دیر میں یہی وہ رقم دلوائے گا کہ ہم مالا مال ہو جائیں گے۔ سارے گھر میں رونق ہی رونق ہو گی۔''

سپاہی نے الو کو باز کی طرح خوب سجایا، اسے اڈے پر بٹھایا، اس پر قند چڑھائی اور اوپر سے دھنک لپیٹی، پاؤں میں شاہی پنجیاں پہنائیں، زنجیر ڈالی، سر پر رنگین ٹوپی چڑھادی اور اڈہ لے کر شہر کے ایک مشہور اور مالدار بنیے کی دوکان پر پہنچا اور بنیے سے نمسکار کے بعد کہا:

''لالہ جی اس شاہی باز کو گروی رکھ لو۔ مجھے ایک ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔ حالاں کہ اسے ایک پل بھی الگ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ مجھے دنیا میں سب سے پیارا ہے مگر مجبوری کے سبب ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔''

لالہ جی نے پوچھا:

''یہ کون سا پرندہ ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا:

''لالہ جی! یہ شاہی باز ہے، شاہی باز۔''

لالہ نے پھر تعجب سے پوچھا:

''یہ شاہی باز کیا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے؟''

سپاہی نے کہا:

''لالہ جی یہ بڑا شاندار پرندہ ہے۔ یہ بہت مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ بادشاہ، نواب اور امیر لوگ اس سے شکار کھیلتے ہیں۔''

لالہ جی فریب میں آگئے اور کہنے لگے:

''کھری بات میں کیا سوچ بچار۔ چلو میں نے گروی رکھ لیا۔''

سپاہی ایک ہزار کی رقم لے کر چمپت ہو گیا۔ سپاہی خوشی خوشی اپنے گھر پہنچا۔ بیوی کو تمام ماجرا بتایا اور رقم اس کے سامنے رکھ دی۔ بیوی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے شوہر سے کہا:

''میں آج تم کو مان گئی۔''

ادھر لالہ جی نے باز نما الو کو اپنی دوکان میں کواڑ کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اب جو بھی گاہک لالہ جی

کے یہاں آتا وہ اس پرندے کو دیکھ کر لالہ جی سے پوچھتا:

''یہ کون سا پرندہ ہے؟''

لالہ جی بڑے فخر سے جواب دیتے:

''یہ ساہی باج ہے ساہی باج!''

جب لوگ اسے قریب سے دیکھتے اور ٹھیک سے معائنہ کرتے تو لالہ جی سے کہتے:

''یہ تو الو ہے۔ سجانے سنوارنے سے اُلو شاہی باز کبھی نہیں بن سکتا۔ دیکھیے یہ آنکھیں بند کیے ہوئے چپ چاپ بیٹھا ہے۔''

آخر کار ایک دن لالہ جی کی سمجھ میں آگیا کہ وہ ٹھگ گئے ہیں۔ سپاہی نے ان کو بیوقوف بنایا ہے۔ اُلو دے کر ایک ہزار روپے اینٹھ لے گیا ہے۔ اب نیم دیوانگی کے عالم میں لالہ جی کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ الو کی طرف منہ کر کے بار بار کہتے تھے:

''جمع کے ڈبو آنکھیں کھولو۔''

جمعہ جماعت کی خیر

دیکھیے: اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔

جن کارن موونڈ منڈایا، سوُدکھ سامنے آیا

جب کوئی شخص کسی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کرے اور وہی تدبیر دُکھ اور مصیبت کی باعث ہو جائے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک کاہل اور کام سے جی چرانے والا شخص رہتا تھا۔ جب پیٹ بھرنے کے لیے کچھ میسر نہ ہوتا تو وہ محنت مزدوری کرتا۔ اس سے جو اجرت ملتی اس سے گزر بسر کرتا۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرنا اسے قطعی ناپسند تھا۔ ایک روز اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنا سر منڈا دے اور سادھو جیسے کپڑے پہن لے تو محنت مزدوری سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ سر منڈا کر سادھو بن گیا۔ جب اسے دروازے دروازے بھیک مانگنے کے لیے جانا پڑا تو اسے پتا چلا کہ گھر گھر جا کر بھیک مانگنا بھی

محنت مزدوری کرنے سے کسی طرح بھی کم نہیں بلکہ بھیک مانگنا زیادہ مشکل کام ہے کیوں کہ اس میں محنت ومشقت کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر سے بھی سودا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا:

''جس کارن موںڈ منڈایا،، سو دکھ سامنے آیا۔''

جن کے پاؤں پنہی نہیں، انہیں دیتے گج راج
وِش دیتے وِشیا ملے، صاحب گریب نواج

خدا رحمن ورحیم ہے۔ جن کے پاس پیروں میں پہننے کے لیے جوتے نہیں۔ ان کو سواری کے لیے ہاتھی دیتا ہے اور جس کو زہر دے کر مار ڈالنے کیلئے لوگ آمادہ ہوں اس کی شادی انہیں کی بیٹی سے کرادیتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خدا کی مہربانی سے مفلس ونادار پل بھر میں مالا مال ہوجاتا ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: ایک سیٹھ بہت مالدار تھا۔ اس کے پاس بے شمار دولت تھی مگر تھا بہت کنجوس۔ اس کے یہاں ایک بھکاری روزانہ بھیک مانگنے کے لیے آتا تھا۔ ایک روز سیٹھ اپنی کوٹھی میں بیٹھا ہوا اپنا حساب ملا رہا تھا کہ وہی بھکاری بھیک مانگنے کے لیے آگیا۔ سیٹھ نے بھکاری سے کہا:

''تم روز روز بھیک مانگنے کے لیے آجاتے ہو۔ اس سے تمہارا کیا بھلا ہوتا ہوگا۔ آج میں تم کو ایک موٹی رقم دینا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم روز روز بھیک مانگنے نہیں آؤ گے۔''

بھکاری نے خوش ہو کر سیٹھ کو دعائیں دیں۔ سیٹھ نے اپنے آڑھتیے کو ایک خط لکھا کہ حامل رقعہ کو وِش دے دیا جائے۔ آڑھتیے کی ایک جوان لڑکی تھی جس کا نام وِشیا تھا۔ گھر کے لوگ اسے پیار سے وِش بمعنی زہر نہ سمجھا بلکہ وِشیا سمجھا۔ اس نے بھکاری کی نہایت عزت وتعظیم کی اور یہ سمجھ کر کہ اپنی لڑکی وشیا کو اس کے حوالے کرنے کے لیے سیٹھ نے یہ پرچہ لکھا ہے۔ فوراً اپنی بیٹی وِشیا کو اس کے حوالے کردیا۔ ایک ہاتھی منگا کر دونوں کو اس پر سوار کر کے رخصت کیا۔

دوسرے روز جب سیٹھ کو تمام باتوں کا علم ہوا تو اس نے کہا:

''جن کے پاؤں پہنی نہیں، انہیں دیتے گج راج، وِش دیتے وشیا ملے، صاحب گریب نواج۔''

جو آپ سے آئے، آنے دو

دیکھیے: آپ سے آئے تو آنے دو۔

جو بولے سو گھی کو جائے

جو صلاح دے وہی اس کام کو کرے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کو نیک مشورہ دے اور اس کام کو مجبوراً اسی کو انجام تک پہنچانا پڑے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے دو حکایتیں مشہور ہیں۔ جن میں سے پہلی اس طرح ہے:

حکایت ۱: ایک مرتبہ چار دوست جنگل کی سیر کے لیے نکلے۔ وہ اپنے ساتھ ضرورت کا سامان بھی لیتے گئے۔ صبح سے دوپہر تک جنگل کی سیر اور مناظر قدرت کا لطف حاصل کرتے رہے۔ جب انہیں بھوک کا احساس ہوا تو اپنے سامان سے دال اور چاول وغیرہ نکال کر کھچڑی بنانے کی تیاری کرنے لگے۔ ایک دوست نے کہا:

"یار ہم لوگ گھی لانا بھول گئے۔ بغیر گھی کے کھچڑی اچھی نہیں لگے گی۔ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی چلتے وقت یاد دلا دیتا تو میں اپنے گھر سے گھی لے لیتا، کیوں کہ میرے گھر میں کئی بھینسیں ہیں، گھر ہی میں گھی ہوتا ہے۔ کس لطف سے ہم لوگ گھی کے ساتھ کھچڑی کھاتے۔"

اس پر تینوں دوست بول اٹھے:

"نیک کام میں دیر کیسی؟ کھچڑی تیار ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ تم گھر جاؤ اور جتنی جلدی ممکن ہو، گھی لے کر واپس آجاؤ۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً اسے گھی لینے کیلئے گھر جانا پڑا۔ بس چلتے وقت اس نے اپنے دوستوں سے اتنا ضرور کہا:

"جو بولے سو گھی کو جائے۔"

اس کہاوت سے متعلق دوسری حکایت اس طرح ہے:

حکایت ۲: دہلی کے ایک رئیس اپنی بیٹی کی شادی نہایت دھوم دھام سے کرنا چاہتے تھے۔ دہلی

والے کھانے پینے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ وہ شادی بیاہ میں مہمانوں کو بہت اچھا کھانا کھلاتے ہیں اور افراط کے ساتھ تیاری کراتے ہیں۔

ایک شام کو رئیس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کی موجودگی میں کھانے کا مینو تیار کیا۔ حساب لگایا تو گھی کی اچھی خاصی مقدار درکار تھی۔ اس وقت دہلی میں گھی کا بھاؤ چڑھا ہوا تھا۔ سب ہی لوگ غور وفکر کرنے لگے کہ مناسب قیمت پر گھی کہاں اور کیسے دستیاب ہوسکتا ہے۔ آن بان کا موقع تھا۔ بیٹی کی شادی نہایت دھوم دھام سے کرنا تھی۔ بہترین کھانوں سے مہمانوں کی خاطر مدارت کرنا تھی۔ اس صحبت میں کافی دیر تک گھی کی فراہمی کا مسئلہ زیر بحث رہا مگر کوئی کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ اتفاق سے ایک دوست پنجاب کے بھی موجود تھے۔ ابھی بات چل ہی رہی تھی کہ انہوں نے کہا:

"ہمارے پنجاب میں تو گھی اس وقت بھی بہت سستا ہے۔ ایک روپے کا پانچ سیر بک رہا ہے۔"

سب لوگ ان کی اس بات سے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ کام انہیں کے سپرد کیا جائے۔ رئیس نے کہا:

"آپ کو گھی کی پرکھ ہے، پنجاب میں لوگوں سے جان پہچان بھی ہے۔ آپ آج ہی رات ٹرین سے روانہ ہوجایئے اور سوا سو من گھی خرید کر کل تک لوٹ آیئے، بڑا کام ہوگا۔"

مجبوراً بے چارے کو گھی لینے کے لیے پنجاب جانا پڑا۔ پنجاب والے جب رئیس کے یہاں سے اٹھے تو اپنے ایک ساتھی سے مسکرا کر کہنے لگے:

"جو بولے سو گھی کو جائے۔"

جوتیوں کا صدقہ ہے

دیکھیے: آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

جو میرے سو تیرے، کاہے دانت نپوڑے؟

جب کوئی شخص کسی کی بات یا برائی پر ہنسے اور وہی بات یا عیب اس شخص میں بھی ہو تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک روز کوئی ایک ہندوستانی عورت کسی ندی میں برہنہ ہوکر نہارہی تھی۔ کوئی یورپین سیاح گھومتا پھرتا ہوا اُدھر آنکلا۔ نہاتی ہوئی عورت کو دیکھ کر ندی کے کنارے پر کھڑا ہوکر ہنسنے لگا۔ عورت نے جب اسے اس طرح اپنے اوپر ہنستے ہوئے دیکھا تو نہایت بے باکی سے کہا:

''جو میرے سو تیرے، کاہے دانت نپوڑے؟''

یعنی تُو میری جن چیزوں کو دیکھ کر ہنس رہا ہے وہی تمام چیزیں تیری ماں اور بہنوں کی بھی ہیں۔

جون پور کے قاضی ہیں

جون پور کا قاضی کنایتاً بے وقوف، احمق اور نادان آدمی کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کا تعلق ایک مشہور حکایت سے ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کسی مدرسہ میں ایک استاد اپنے شاگرد پر خفا ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''او نالائق تو نِرا گاؤدی ہی رہا۔ میں نے تجھے زیورِ علم سے آراستہ کیا اور تجھ جیسے گدھے کو انسان بنادیا لیکن تجھ میں اب تک عقل نہ آئی، تمیز چھو تک نہ گئی۔''

اسی وقت مدرسہ کے قریب سے ایک کمہار اپنا گدھا لے کر گزر رہا تھا اس نے جو یہ بات سنی تو بہت خوش ہوا۔ فوراً مدرسہ کے اندر آیا اور استاد سے بولا:

''مولوی صاحب! آپ نے اپنے شاگرد کو گدھے سے انسان بنادیا ہے۔ میرے پاس بھی ایک گدھا ہے۔ اگر آپ اسے بھی انسان بنادیں تو بڑی مہربانی ہوگی، کیوں کہ میں لاولد ہوں۔ اولاد کی چاہ میں ایک مدت سے بھٹکتا پھر رہا ہوں مگر قسمت میں کوئی اولاد نہ تھی۔ اب آپ سے امید بندھی ہے۔ خدا کے واسطے انکار نہ کیجئے گا۔''

یہ کہہ کر مدرسہ سے باہر گیا اور اپنے گدھے کو پکڑ کر لے آیا۔ گدھے کو مولوی صاحب کے سامنے کھڑا کیا اور خود بھی ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ مولوی صاحب عقل مند تھے وہ سمجھ گئے کہ کمہار میں شئے لطیف کی کمی ہے۔ کمہار سے گویا ہوئے:

''ٹھیک ہے، میں اس کو بھی گدھے سے انسان بنادوں گا مگر اس کام کے لیے سو روپے نذر کرنا ہوں گے۔ تم اپنا گدھا میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ گدھے سے انسان بنانے کیلئے

ایک سال کا وقت لگے گا۔ ایک سال کے بعد تم اپنا آدمی لے جانا۔"

کمہار اس شرط پر راضی ہو گیا۔ اس نے مولوی صاحب کو سو روپے دے دیئے اور اپنا گدھا ان کے حوالے کر کے اپنے گھر چلا گیا۔ ایک سال کے بعد جب کمہار مولوی صاحب کے پاس واپس آیا تو اس وقت تک مولوی صاحب نذرانے کے سو روپے اور گدھے کو بیچ کر ملنے والی رقم کھا پی کر برابر کر چکے تھے۔ کمہار نے مولوی صاحب سے اپنا آدمی طلب کیا تو مولوی صاحب نے کمہار سے کہا:

"بھئی تمہارا گدھا بہت عقل مند تھا اس لیے اس نے بڑی تیزی سے علم حاصل کرنا شروع کیا اور ایک ہی ہفتے میں گدھے سے انسان بن گیا۔ باقی عرصہ میں میں نے اسے مزید لکھا پڑھا کر عالم بھی بنا دیا۔ اب وہ جون پور روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ عدالت میں پہنچا تو اس وقت قاضی کسی مقدمہ کی سماعت کر رہے تھے۔"

کمہار ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور رسی پلان دکھا کر اپنی طرف آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ قاضی کو اس کی حرکت پر بہت غصہ آیا مگر انہوں نے صبر وضبط سے کام لیا۔ مقدمہ کے بعد قاضی صاحب نے کمہار کو اپنے پاس بلایا اور اس سے اس حرکت کا سبب پوچھا۔ کمہار نے کہا:

"ابے ایک ہی سال میں بھول گیا۔ تیری گدھی تجھے بہت یاد کرتی ہے میں نے ہی تجھے لکھا پڑھا کر گدھے سے آدمی بنوایا اور اس کام کے لیے مولوی صاحب کو سو روپے بھی دیئے تھے۔"

قاضی جی یہ سن کر چکرا گئے۔ انہوں نے بہلا پھسلا کر باتوں باتوں میں کمہار سے سارا ماجرا سنا اور پھر اس خیال سے کہ کہیں یہ جھوٹا واقعہ مشہور نہ ہو جائے کمہار کو معقول رقم دے کر رخصت کیا۔ قاضی جی کمہار سے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ یہ واقعہ غلط ہے۔

جیسا دیوے ویسا پاوے، پوت بھتار کے آگے آوے

جو شخص جیسا کرتا ہے اس کا نتیجہ اس کو یا اس کے خاندان والوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے یعنی اگر کوئی کسی کا برا چاہتا ہے تو اس کا بھی برا ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سے حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک سادھو کسی کے دروازے پر روز بھیک مانگنے آیا کرتا تھا۔ اسے جو کچھ وہاں سے مل

جاتا اپنی کٹیا میں لے کر کھالیا کرتا۔ گھر کی مالکن نہایت کنجوس اور بے رحم تھی۔ سادھو کا روز روز بھیک مانگنے کے لیے آنا اسے ناگوار خاطر ہوتا تھا مگر وہ اپنے بیٹے اور خاوند سے مجبور تھی جو اس سادھو کو کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے دے دیتے تھے۔ اتفاق سے ایک روز گھر پر مالکن اکیلی تھی۔ سادھو نے بھیک مانگنے کے لیے آواز لگائی۔ مالکن گھر کے اندر سے دو روٹیاں لے کر آئی جن میں پہلے ہی سے زہر ملا دیا گیا تھا۔ اس نے وہ روٹیاں سادھو کو دے دیں۔ سادھو دعا دیتا ہوا چلا گیا اور ان روٹیوں کو اپنی کٹیا میں لے جا کر رکھا۔ منہ ہاتھ دھو کر سادھو روٹی کھانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اتفاق سے اسی وقت اس مالکن کا خاوند اور پسر وہاں آ پہنچے۔ وہ دونوں کہیں دور سے آ رہے تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ پیاس کے مارے ان کے گلے خشک ہو گئے تھے۔ ان دونوں نے سادھو سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ سادھو نے کہا:

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ لوگ میری کٹیا میں تشریف لائے۔ خالی پانی کیسے پلاؤں، کٹیا میں کھانے کے لیے اور کچھ تو نہیں ہے صرف دو روٹیاں ہیں انہیں ہی کھا کر پانی پی لیجئے تو میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے وہی دو روٹیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ دونوں باپ بیٹے بھوکے پیاسے تو تھے ہی لہٰذا انہوں نے ایک ایک روٹی کھا کر پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر میں ان کو چکر آنے لگا اور کٹیا کے اندر ہی چٹ چٹ مر گئے۔ جب مالکن کو اپنے خاوند اور پسر کے مرنے کا سبب معلوم ہوا تو وہ بہت پچھتائی اور غم کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گر گئی۔ لوگوں کو جب اس واقعہ کا پتا چلا تو کسی نے کہا:

''جیسا دیوے ویسا پاوے، پوت بھتار کے سامنے آوے۔''

جیسے کو تیسا

جو شخص جیسا سلوک کرے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہئے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ہاتھی اور درزی کے بیٹے کی مشہور حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک رئیس کے پاس ایک ہاتھی تھا۔ وہ روزانہ صبح تالاب پر نہانے اور پانی پینے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس کے راستے میں ایک درزی کی دوکان تھی۔ درزی ہاتھی کو بہت چاہتا تھا۔ ہاتھی جب درزی کی دوکان پر پہنچتا تو درزی اسے کھانے کیلئے کبھی کیلے اور کبھی دوسری چیزیں دے دیا کرتا۔ اس طرح کے سلوک سے ہاتھی بھی درزی کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھنے لگا۔ اب ہاتھی اور درزی ایک دوسرے

کے پکے دوست ہو گئے تھے۔ ایک روز درزی کسی کام سے شہر گیا تھا۔ اس کا لڑکا دوکان پر بیٹھا تھا، لڑکا بہت شرارتی تھی۔ تالاب کی طرف جاتے وقت روزانہ کی طرح ہاتھی درزی کی دوکان کے سامنے رک گیا اور جوں ہی اس نے اپنی سونڈ کو دوکان کے اندر داخل کیا درزی کے لڑکے نے کچھ کھلانے کے بجائے اس کی سونڈ میں سوئی چبھودی۔ ہاتھی کو اس پر بہت غصہ آیا۔ لیکن وہ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ تالاب سے نہانے اور پانی پینے کے بعد لوٹتے وقت ہاتھی نے بہت سا گندہ پانی اپنی سونڈ میں بھرلیا۔ وہ سیدھا درزی کی دوکان پر پہنچا۔ اس نے سارا گندہ پانی درزی کے لڑکے پر انڈیل دیا۔ دوکان کے تمام کپڑے بھی خراب ہو گئے لڑکے کو اپنے کیے پر بہت افسوس ہوا۔ جب درزی شہر سے دوکان پر واپس آیا اور پورے واقعہ کا پتا چلا تو اس نے کہا:

''اس میں ہاتھی کا کیا قصور، ٹھیک ہے ''جیسے کو تیسا'' اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔

جیسے کو تیسا ملے

جو شخص جس خصلت کا ہوتا ہے، اس کو اسی خصلت کے لوگ مل جاتے ہیں۔ جب کسی بداخلاق یا چالاک شخص کو اس سے بھی زیادہ بداخلاق اور چالاک شخص مل جائے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک مشہور کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی جنگل میں ایک سارس اور چالاک لومڑی میں بہت دوستی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ایک دن لومڑی نے سارس کو اپنے یہاں دعوت دی۔ لومڑی نے نہایت لذیز کھیر بنائی۔ جب سارس لومڑی کے گھر دعوت میں آیا تو اس نے ایک چوڑی طشتری میں کھیر نکالی اور سارس سے کہنے لگی:

''آؤ سارس بھائی، لذیز کھیر کھانا شروع کریں۔''

دونوں ایک ہی طشتری میں ساتھ ساتھ کھانے لگے۔ لومڑی لپ لپ کر کے ساری کھیر کھا گئی لمبی چونچ کی وجہ سے سارس کچھ بھی نہ کھا سکا۔ وہ بے چارہ بھوکا ہی رہ گیا۔ چلتے وقت اس نے لومڑی سے کہا:

''بہن آپ نے آج بہت ہی اچھی کھیر کھلائی۔ اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ اگر کل شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں تو میں اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھوں گا۔''

لومڑی نے سارس کی دعوت کو منظور کرلیا۔ سارس من ہی من میں لومڑی سے بدلا لینے کی سوچ رہا تھا۔ اس نے بہترین شوربا تیار کروایا۔ دوسرے روز شام کو جب لومڑی وہاں پہنچی تو شوربے کی مہک سے

اس کی بھوک بڑھ گئی اور منہ میں پانی آنے لگا۔ سارس نے ایک تنگ منہ کے لمبے برتن میں شوربا نکالا اور لومڑی سے بولا:

''آؤ بہن ہم اور آپ مل کر اس کا مزہ لیں۔''

برتن کا منہ تنگ تھا اس لیے لومڑی اس کے سامنے بیٹھی ہی رہی۔ سارس نے برتن کے اندر اپنی لمبی چونچ ڈال دی اور مزے لے لے کر شوربے کو پیتا رہا۔ لومڑی منہ تکتی رہی۔ وہ بھوکی ہی لوٹ آئی۔ اب لومڑی اپنی چالاکی پر پچھتا رہی تھی۔

جیسے کو تیسا ملے سُن تو راجا بھیل، لوہا چوہا کھا گیا، لڑکا لے گئی چیل

جو جیسا ہوتا ہے اسے ویسے لوگ مل جاتے ہیں۔ جس کسی ہوشیار شخص کو اس سے بھی زیادہ چالاک شخص مل جائے اور اپنا بدلا لے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک شخص کو کسی کام سے کچھ عرصہ کے لیے باہر جانا پڑا۔ اس کے پاس کچھ لوہا تھا، اس نے اس لوہے کو اس شرط پر اپنے ایک دوست کے سپرد کیا کہ جب وہ واپس آئے گا تو اسے واپس لے لے گا۔ کئی سال کے بعد جب وہ لوٹ کر آیا اور اپنے دوست سے اپنی امانت واپس مانگی تو دوست نے کہا:

''تمہارا سارا لوہا چوہے کھا گئے ہیں۔''

یہ سن کر وہ سکتہ میں آ گیا اور بدلہ لینے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ اتفاق سے ایک روز دوست کا چھوٹا لڑکا بھٹکتا ہوا اس کے گھر آ گیا۔ اس نے لڑکے کو گھر کے اندر چھپا دیا۔ جب اس کا دوست لڑکے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے پاس پہنچا اور اس سے کہا:

''میرا چھوٹا لڑکا صبح سے غائب ہے۔ آپ کے علم میں تو نہیں ہے۔''

دوست نے جواب دیا:

''اسے تو صبح کے وقت میرے سامنے چیل اٹھا لے گئی ہے۔''

اس پر اس نے کہا:

''یہ کیا کہتے ہو۔ چیل کا لڑکے کو اٹھا لے جانا ناممکن ہے۔''

دوست نے جواب دیا:

''اگر چوہے لوہا کھا سکتے ہیں تو چیل لڑکے کو اٹھا کر لے جا سکتی ہے۔''

یہ سن کر دوست بہت شرمندہ ہوا اور اس نے لوہا لوٹانے کا وعدہ کیا اور اپنے لڑکے کو لے کر گھر چلا گیا۔

جیسے کو تیسا ملے، ملے کھیر میں کھانڈ، تو ہے ذات کی بیڑن، میں ذات کا بھانڈ

جیسے کو تیسا ملے پر کہتے ہیں۔ جس کسی فریبی کو اس سے بھی زیادہ عیار شخص ملے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک پر لطف حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک بیڑن (دیہاتی طوائف) نے برہمن کو بھوجن کرانا چاہا لیکن اس کے طوائف ہونے کی وجہ سے کسی برہمن نے بھوجن کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ طوائف کسی برہمن کی تلاش میں تھی کہ سامنے سے ایک انجان برہمن آتا ہوا نظر آیا۔ وہ نہایت خوش ہوئی اس کے پاس گئی اور ہاتھ جوڑ کر برہمن سے عرض کرنے لگی:

''مہاراج! آج آپ میرے یہاں بھوجن کرلیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے اپنے بزرگوں کی ارواح کے ثواب کے لیے کھانا تیار کروایا ہے۔ آپ کھالیں گے تو ان کی روح کو ثواب پہنچے گا۔''

لیکن طوائف نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے۔ برہمن کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس نے دعوت منظور کرلی اور طوائف کے ساتھ چل دیا۔ طوائف نے اسے خوب کھلایا، کھانے کے بعد طوائف نے برہمن سے معافی مانگتے ہوئے کہا:

''مہاراج میں طوائف ہوں۔ چونکہ کسی برہمن نے میری دعوت کو منظور نہیں کیا۔ آپ مجھ سے انجان تھے اس لیے میں نے یہ بتائے بغیر کہ میں کون ہوں، اپنے بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے بھوجن کرادیا ہے۔ آپ میری خطا معاف کریں، بڑی دیا ہوگی۔''

اس کے جواب میں اس انجان برہمن نے کہا:

''میں خود بھی برہمن نہیں ہوں۔ برہمن کا روپ اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ کوئی برہمن سمجھ کر لذیز کھانے کھلادے۔ اب اس میں دونوں طرف سے معافی تلافی کی بات نہیں۔''

جیسے کو تیسا ملے، ملے کھیر میں کھانڈ، تو ہے ذات کی بیڑن، میں ذات کا بھانڈ۔

چٹوری زبان، دولت کا زیان

جسے زبان کا چسکا ہو وہ دولت مند نہیں ہوسکتا۔ غریبی دور کرنے کے لیے محنت کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی چاہئے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک شخص لمبے سفر پر گیا تو محلے کے دوکاندار بنیے سے کہہ گیا:

''میری بیوی کو جس چیز کی ضرورت ہو ادھار دے دیا کرنا۔ میں سفر سے واپس آکر سارا حساب بے باق کردوں گا۔''

بیوی کو تل اور گڑ کھانے کی عادت تھی وہ دوکاندار سے دوسری جنس کے ساتھ ساتھ تل اور گڑ لے کر خوب کھاتی رہی۔ جب ایک سال کے بعد بنیے کو معلوم ہوا کہ عورت کا خاوند واپس آگیا ہے تو اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا:

''تِل گُڑ تِل گُڑ تیس روپے۔''

اس کے شوہر نے مکان کے اندر سے پوچھا:

''کیا کہتا ہے؟''

بنیے نے پھر وہی جملہ دہرایا:

''تِل گُڑ تِل گُڑ تیس روپے۔''

شوہر نے کہا:

''صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟''

بنیے نے کہا:

''دیگر جنس کے علاوہ صرف تِل گُڑ کا حساب تیس روپے ہوا۔''

یہ سن کر وہ غریب شوہر حیرت زدہ ہوگیا۔ اس نے مجبوراً قرض کی رقم ادا کی اور اپنے آپ

بڑبڑانے لگا:

''چٹوری زبان، دولت کا زیان۔''

اس کہاوت کو یوں بھی کہا جاتا ہے کہ ''تِل گُڑ تِل گُڑ تیس روپے۔''

چِٹّے میں پتوا میرا اور بیٹا جیوے تیرا

جب کسی نہایت چالاک شخص کو اس سے بھی زیادہ چالاک شخص سے واسطہ پڑ جائے اور وہ اسے بڑی ہوشیاری سے جھانسہ دے دے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک پر لطف حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: چٹّا روپے کو کہتے ہیں، پتوا، پتی کی تصغیر ہے جس کے معانی ہیں حصہ، بخرہ یا چوتھائی حصہ)

کہا جاتا ہے کہ ایک شخص بنارس میں کپڑا خریدنے کے لیے آیا۔ ایک دلال اس کے ساتھ لگ گیا اور کسی طرح اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جس دوکان پر خریدار جاتا یہ بھی سائے کی طرح وہاں پہنچ جاتا۔ بنارس کے دلال بڑے ہوشیار اور چالاک ہوتے ہیں۔ خریدار بھی نہایت چالاک اور دلالوں سے ہوشیار رہنے والا تھا۔ اس نے اس روز ایک پیسے کا بھی سودا نہ خریدا۔ دوسرے دن خریدار پھر بازار میں آیا۔ وہی دلال پھر اس کے ساتھ ہولیا۔ اس روز بھی اس نے کچھ نہیں خریدا۔ غرض اسی طرح آٹھ دس دن گزر گئے۔ آخر تنگ آ کر اس شخص نے دلال سے کہا:

> ''جب تک تو میرے ساتھ لگا رہے گا میں ایک پیسے کا بھی مال نہیں خریدوں گا۔ کچھ بھی ہو جائے تجھے دلالی لینے نہیں دوں گا۔''

دلال بھی جلا بھنا تھا۔ خریدار کی یہ بات سن کر بولا:

> ''تم جیسے بہت سے آئے اور اسی طرح کہہ کہہ کر چلے گئے مگر ہم ڈنکے کی چوٹ پر دلالی لیتے ہیں۔ ہماری دلالی کو کوئی روک نہیں سکتا۔''

اس گفتگو کے بعد اگلے دن دلال نے ستھرا شاہی فقیر کا لباس بدلا (سُتھرا شاہی، ستھرا شاہ فقیر کا پیرو وہ گروہ ہے جو ڈنڈے بجا کر ایک خاص طرز پر تک بندی کر کے بھیک مانگتا پھرتا ہے) اور کالے ڈنڈے لے کر بازار میں آ بیٹھا۔ جس وقت وہ شخص خریداری کے لیے بازار میں آیا۔ اس نے دلال کو وہاں نہ پایا۔ خوش ہو کر اطمینان سے کئی ہزار روپے کا بنارسی کپڑا خریدا۔ دلال بھی بھیس بدلے ہوئے اپنی چال

میں مشغول تھا جس دوکان پر خریدار جاتا۔ وہی دلال فقیری لباس میں ڈنڈے بجاتا اور یہ صدا لگاتا ہوا کہ:

''چٹے میں پتوا میرا اور بیٹا جیوے تیرا''

ہر دوکان پر ساتھ جاتا۔ اس کی صدا کا مطلب یہ تھا کہ دلالی کا چوتھائی حصہ میرا ہے۔ چوں کہ دوکاندار اور دلال ملے جلے اور ایک دوسرے کے راز دار ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے سوا کوئی اس مڑک یا گر کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہ شخص بھی اس دلال کے جھانسے میں آ گیا اور بالکل پہچان نہ سکا۔ آخر کار اپنی گرہ کٹوا آیا۔ خریدار جب کپڑا خرید کر اپنے مقام پر آیا تو ادھر دلال اپنی دلالی لے کر اس کے پاس پہنچا اور جھک کر سلام کیا۔ طنزیہ لہجے میں خریدار سے بولا:

''اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ کی بدولت پانچ سو روپے کمائے اور اپنی چالاکی سے روپے میں بارہ آنے کا مال آپ کو بھڑایا اور یہ چوتّی یاروں نے سنگوائی۔''

اس بات کو سن کر خریدار بہت شرمندہ ہوا اور اپنے نقصان پر صبر کر بیٹھا۔

چراغ تلے اندھیرا

منصف حاکم کے قرب میں ظلم ہونا۔ غیروں کو فائدہ پہنچانا اور اپنوں کو محروم رکھنا۔ جب کوئی اپنے غریب عزیزوں کو فائدہ نہ پہنچائے اور غیر لوگ مستفید ہوں تو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک سوداگر اپنا مال لے کر فروخت کرنے کے لیے کسی شہر کی طرف جا رہا تھا۔ بادشاہ کے قلعے کے پاس پہنچتے پہنچتے اسے رات ہو گئی۔ وہ قلعہ کی دیوار کے کنارے ٹھہر گیا۔ اس کے خیال میں قلعہ سب سے محفوظ مقام تھا۔ رات گزار کر صبح کو شہر کی طرف اسے روانہ ہونا تھا۔ جس وقت وہ قلعہ کی دیوار کے کنارے سو رہا تھا اسی وقت قزاقوں نے اس کا سارا مال لوٹ لیا۔ صبح ہونے پر وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور فریاد کرنے لگا:

''قزاقوں نے حضور کے قلعہ کے دیوار کے نیچے میرا تمام مال واسباب لوٹ لیا ہے۔''

بادشاہ نے سوداگر سے کہا:

''تو اپنے مال کے لیے ہوشیار کیوں نہ رہا۔''

اس نے کہا:

''بندے کو معلوم نہ تھا کہ جہاں پناہ کے زیر سایہ بھی مسافروں کا مال لوٹا جاتا ہے۔''

بادشاہ نے کہا:

''کیا تو نے جلتا ہوا چراغ نہیں دیکھا کہ چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے۔''

چراغ کے نیچے اندھیرا

دیکھیے: چراغ تلے اندھیرا

چل سونٹے اب تیری باری

ہر طرح سے ناکام ہونے کے بعد کسی آخری اور ہر حال میں کامیاب ہونے والی ترکیب کو استعمال کرنے پر اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک بار ایک شیخ چلی اپنی ماں سے اجازت لے کر کمانے کے لیے کسی دوسرے شہر کی طرف چلا۔ اس کی ماں نے راستے میں کھانے کے لیے چار روٹیاں کسی کپڑے میں باندھ دی تھیں۔ جنگل کا راستہ تھا، دوپہر ہو چکی تھی، کچھ دیر ستانے کے لیے وہ ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لگا۔ اس درخت پر چار پریاں رہتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے بھوک کا احساس ہوا تو وہ خود سے بڑبڑا کر کہنے لگا:

''ایک کھاؤں کہ دو کھاؤں، تین کھاؤں یا چاروں کو کھا جاؤں؟''

یہ سن کر پریوں نے سمجھا کہ یہ کوئی عجیب الخلقت ہے جو ہم چاروں کو کھا جانا چاہتا ہے۔ پریوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا اور پیڑ سے اتر کر اس کے پاس آئیں۔ چاروں نے دست بستہ ہو کر اس سے کہا: ''اگر تم ہم میں سے کسی کو نہ کھاؤ تو ہم تمھیں ایک کراماتی کڑھائی نذر کریں گے۔''

کڑھائی میں یہ کرامت تھی کہ اس سے جتنی روٹیاں طلب کرو، فوراً میسر کرا دیتی تھی۔ کراماتی کڑھائی پا کر شیخ چلی بہت خوش ہوا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ ایک سرائے پر ٹھہرا۔ سرائے کے بھٹیارے کو کسی طرح اس کڑھائی کی خوبی کا پتا چلا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اس کڑھائی کو اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی جگہ پر اپنی معمولی کڑھائی رکھ دی۔ شیخ چلی وہی معمولی کڑھائی لے کر گھر پہنچا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ نقلی کڑھائی ہے تو پھر چار روٹیاں لے کر اسی درخت کے نیچے پہنچا جس پر چاروں

پریاں رہتی تھیں۔اس نے اسی طرح پھر کہا:

''ایک کھاؤں کہ دو کھاؤں، تین کھاؤں یا چاروں کو کھا جاؤں؟''

پریاں پھر سہم گئیں۔اس بار پریوں نے اپنی جان کے بدلے اسے ایک رسی اور سونٹا یعنی ڈنڈا دیا۔ رسی اور ڈنڈا دونوں کراماتی تھے۔رسی میں یہ صفت تھی کہ حکم پاتے ہی اس شخص کو باندھ لیتی تھی جس کا باندھنا مقصود ہوتا تھا اور ڈنڈا اشارہ پاتے ہی مارنا شروع کر دیتا تھا۔ڈنڈا اور رسی لے کر شیخ چلی سرائے میں بھٹیارے کے پاس پہنچا۔وہاں پہنچ کر شیخ چلی نے رسی کو حکم دیا کہ بھٹیارے کو باندھ لے۔اتنا کہتے ہی رسی بھٹیارے سے لپٹ گئی اور بھٹیارا اس میں بندھ گیا۔اب شیخ چلی نے ڈنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''چل سونٹے اب تیری باری۔''

اتنا کہنا تھا کہ بھٹیارے کو ڈنڈے پڑنے لگے۔رسی سے بندھے ہونے اور سونٹے کی پٹائی کے سبب بھٹیارا بے بس ہو گیا۔اس نے شیخ چلی سے منت وسماجت کی اور اپنی جان کی بھیک مانگی۔کراماتی کڑھائی شیخ چلی کے حوالے کرتے ہوئے اس نے پھر کسی کے ساتھ فریب نہ کرنے کی قسم کھائی۔شیخ چلی کراماتی کڑھائی، رسی اور سونٹا لے کر خوش خوش اپنے گھر واپس آ گیا۔

چل مرے چرخے چرخ چوں، کہاں کی بڑھیا کہاں کا توں

اپنے ہی من کی کہی جانا دوسروں کی نہ سننا۔یہ کہاوت اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب عقل مند کے آگے طاقت ور کی مات ہو جائے۔اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی گاؤں کی ایک بڑھیا اپنی بیٹی کے گھر دوسرے گاؤں جا رہی تھی۔راستے میں جنگل پڑتا تھا۔وہ شیر، بھالو، چیتے وغیرہ خونخوار جانوروں سے گھر گئی۔ہر جانور بڑھیا کو کھا جانا چاہتا تھا۔جو بھی جانور بڑھیا کی طرف اس کو کھانے کے لیے آیا۔اس سے بڑھیا نے کہا:

''ابھی تو میں بہت دبلی، پتلی اور کمزور ہوں۔میرے بدن پر گوشت نام کو بھی نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کے یہاں جا رہی ہوں۔تم لوگ کچھ دنوں تک میرا انتظار کرو۔جب میں وہاں سے خوب کھا پی کر لوٹوں گی تو خوب موٹی ہو جاؤں گی۔میرے بدن پر خوب گوشت ہوگا۔تم لوگ خوب چھک کر میرا گوشت کھانا۔''

سب نے بڑھیا کی بات مان لی اور اسے چھوڑ دیا۔ بڑھیا خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی بیٹی کے گھر پہنچی۔ کچھ دنوں کے بعد جب بڑھیا واپس لوٹی تو اپنے ساتھ ایک چرخا لیتی آئی اور اسی کے اندر بیٹھ گئی۔ جنگل میں پہنچتے ہی درندوں نے اسے گھیر لیا۔ اب جو بھی جانور بڑھیا سے کہتا:

''اے بڑھیا اپنا وعدہ پورا کر''

تو وہ چرخے کے اندر سے جواب دیتی:

''چل مرے چرخے چرخ چوں، کہاں کی بڑھیا کہاں کا توں۔''

یہ سن کر جانور سمجھتے کہ یہ بڑھیا نہیں بلکہ کوئی اور بلا ہے اور ڈر کے مارے دور بھاگ جاتے۔ اس طرح بڑھیا نے خونخوار جانوروں سے اپنی جان بچالی۔

چلے جاؤ

کسی کو تنگ کرنے، نامناسب کام کرنے اور اپنی سی کرنے کے موقع پر کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک بھکاری کسی کے دروازے پر بھیک مانگنے کے لیے آیا۔ گھر کی بہو جونہی بھکاری کو بھیک دینے کے لیے اندر سے باہر کی طرف چلی تو ساس نے بہو سے کہا:

''بھکاری کو بھیک نہ دے اور اسے واپس کر دے۔''

بہو نے ایسا ہی کیا۔ جب بھکاری کچھ دور واپس چلا گیا تو ساس نے بھکاری کو بلایا۔ بھکاری اس امید پر واپس لوٹ آیا کہ اب بھیک مل جائے گی۔ ساس نے بھکاری سے کہا:

''یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ تم کو قطعی بھیک نہیں ملے گی۔''

بے چارہ بھکاری پھر واپس چل دیا۔ خواہ مخواہ کسی کو پریشان کرنے اور بیہودہ حرکت کرنے والے کے لیے بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔

چندیں سال خدائی کردی، گاؤ خر رانہ شناختی

تو نے اتنے سال خدائی کی مگر گائے اور گدھے کو نہ پہچانا۔ اگر کوئی شخص مدت تک ایک کام کرتا رہے اور اسی کام میں کوئی سخت غلطی کرے تو وہ اس قول کا مصداق ہوگا۔ اس کہاوت کے متعلق ایک حکایت

مشہور ہے۔ جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی آغا کے پڑوس میں ایک دھوبی رہتا تھا۔ دھوبی کا گدھا بے وقت ڈھینچوں ڈھینچوں کیا کرتا تھا۔ آغا کو گدھے کی آواز ناگوار خاطر ہوتی تھی۔ جب گدھا رینکنا شروع کرتا تو آغا خدا سے اس کے مرنے کی دعا کرتا۔ خود آغا کے یہاں ایک گائے پلی ہوئی تھی۔ اتفاق سے وہ انہیں دنوں مر گئی۔ آغا تھے نہایت ظریف، رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور وہ کہہ اٹھے:

''چندیں سال خدائی کردی، گاؤ خر را نہ شناختی۔''

چودہ برس بن باس بھوگا، تب رام کا نام امر ہوا

راجا رام چندر جی بھگوان وِشنو کے مظہر مانے جاتے ہیں۔ ان کے والد راجا دشرتھ اجودھیا کے راجا تھے۔ راجا وشرتھ کی تین رانیاں کوشلیا، کیکئی اور شمترا تھیں۔ رام چندر جی رانی کوشلیا کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے وششٹھ مُنی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جب یہ بچے تھے تب ہی وِشوامتر منی کے یگیہ کی حفاظت کے لیے ان کو اپنے ساتھ جنگل لے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے بہت سے راکھشوں (شیاطین) کو قتل کیا تھا۔ جب یگیہ ختم ہو گیا تب یہ اپنے چھوٹے بھائی لکچھمن (جو رانی سمترا کے بطن سے پیدا ہوئے تھے) اور گرو وِشوامتر کے ساتھ راجا جنک کے یہاں ان کی بیٹی سیتا کے سویم ور (وہ تقریب جس میں لڑکی خود اپنا شوہر آپ منتخب کرتی ہے) میں گئے۔ راجا جنک کے پاس شیو جی کا ایک دھنش تھا جو بہت وزنی تھا۔ راجا جنک کی شرط تھی کہ جو اس دھنش کو اٹھا لے گا سیتا کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے گی۔ بہت سے راج کمار اور سورما اس تقریب میں مقابلے کے لیے آئے مگر دھنش کو نہ اٹھا سکے۔ رام چندر جی نے نہ صرف دھنش کو اٹھا لیا بلکہ ایک جھٹکے میں توڑ بھی دیا۔ مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے پر سیتا جی کی شادی رام چندر جی کے ساتھ کر دی گئی۔ وہاں سے لوٹ کر جب رام چندر جی اجودھیا آئے، تب راجا وشرتھ نے ان کو اجودھیا کا راجا بنانا چاہا۔ بھرت کی ماں رانی کیکئی کو جیسے ہی اس بات کا پتا چلا وہ غم خانہ میں چلی گئی۔ راجا وشرتھ نے جب رانی کیکئی سے وجہ دریافت کی تو رانی نے ان کو اپنے وعدے کی یاد دلائی۔ راجا وشرتھ نے کہا:

''ٹھیک ہے جو چاہو مانگ لو۔''

رانی کیکئی نے کہا: ''رام چندر کو چودہ سال کے لیے بن باس یعنی جنگل میں رہنے کے لیے بھیج دیا جائے اور میرے بیٹے بھرت کو اجودھیا کا راجا بنا دیا جائے۔''

راجا وشرتھ قول کے پکے تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ رام چندر جی جب بن باس کے لیے جانے لگے تب ان کی بیوی سیتا اور بھائی لکچھمن بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ رام کے بن جانے کے بعد راجا وشرتھ فوت ہو گئے۔ کیکئی تو اپنے بیٹے بھرت کو راجا بنانا چاہتی تھی مگر بھرت اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا:

''اس راج گدی کے حق دار میرے بڑے بھائی رام چندر جی ہی ہیں۔ میں اسے کبھی قبول نہیں کروں گا''۔

بھرت رام چندر جی کے پاس جنگل میں گئے اور ان کو بہت سمجھایا بجھایا کہ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب آپ سلطنت کو سنبھال لیں مگر رام چندر جی اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا:

''میں والد کے حکم سے جنگل میں رہنے کے لیے آیا ہوں اب تو چودہ سال کی مدت پوری ہونے پر ہی لوٹوں گا''۔

آخر کار بھرت رام چندر جی کی کھڑاؤں یعنی چپل اپنے ساتھ لے کر اجودھیا واپس آئے۔ کھڑاؤں کو تختِ شاہی پر رکھ کر رام چندر جی کے نام سے عنان حکومت سنبھال لی۔ بن باس کی مدت میں رام چندر متعدد جنگلوں، پہاڑوں اور رشی منیوں کے آشرموں میں گھوما کرتے تھے۔ ایک بار لنکا کا راجا راون جنگل میں آیا اور سادھو کا بھیس بنا کر چھل سے سیتا جی کو اٹھا کر لنکا لے گیا۔ جب رام چندر جی کو معلوم ہوا تو انہوں نے بہت سے بندروں کو اکٹھا کر کے ہنومان نامی بندر کی اگوائی میں لنکا پر چڑھائی کر دی۔ گھمسان کی لڑائی میں راون اور اس کے ساتھیوں کو مار کر لنکا کی سلطنت کو اس کے چھوٹے بھائی وِبھیشن کے حوالے کی اور سیتا جی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ بن باس کی مدت پوری ہونے پر یہ اجودھیا واپس آئے اور سکھ چین سے حکومت کرنے لگے۔

چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا

دیکھیے: چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔

چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے

دیکھیے: چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔

چور چوری سے گیا، تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا

عادت چھوٹنے پر بھی کچھ نہ کچھ اثر رہ جاتا ہے۔ بری عادت آسانی سے نہیں جاتی۔ بری عادت کے چھوٹنے پر بھی کچھ نہ کچھ اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک چور کئی بار چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھ پکڑا گیا۔ کئی بار اس کو سزا بھی بھگتنا پڑی۔ بار بار چوری کرنے، گرفتار ہونے اور بار بار سزا بھگتنے کی زندگی سے جب وہ تنگ ہو گیا تو اس نے چوری کرنے سے توبہ کر لی اور باقی زندگی شرافت سے گزارنے کا عہد کیا۔ وہ سادھوؤں کی ٹولی میں شامل ہو گیا اور شرافت کی زندگی گزارنے لگا۔ سادھوؤں کے پاس ایسی تو کوئی چیز نہ تھی جسے چرایا جا سکے۔ اپنی عادت سے مجبور ہونے کے سبب وہ سادھوؤں کی چیزوں کو ادھر اُدھر کیا کرتا۔ جب سادھو سو جاتے تو وہ ایک سادھو کی گھٹری کو دوسرے سادھو کے پاس اور دوسرے کی گٹھری کو پہلے سادھو کے سر کے نیچے رکھ دیتا۔ سادھوؤں کی جب آنکھ کھلتی تو وہ اپنی اپنی گٹھریوں کو ڈھونڈتے اور پریشان ہوتے۔ اس کا روزانہ کا یہی معمول تھا۔ ایک دن جب سادھوؤں کو اس کی اس حرکت کا پتا چل گیا تو انہوں نے اس کا سبب پوچھا کہ تُو ایسا کیوں کرتا ہے اس نے جواب دیا:

"سادھو ہونے سے پہلے میں چور تھا۔ اگرچہ میں نے چوری کرنا چھوڑ دی ہے مگر اپنی پرانی عادت سے مجبور ہوں من نہیں مانتا اسی لیے ہیرا پھیری کر لیتا ہوں۔"

اس کا یہ جواب سن کر ایک سادھو نے کہا:

"چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔"

چور چوری سے گیا، ہیرا پھیری سے نہیں گیا

دیکھیے: چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا؟

چور کا شاہد چراغ

جب کوئی رازدار کسی کا بھید کھول دے تو اس موقع پر یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کا تعلق ایک

چھوٹی سی حکایت سے ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی شخص کی کوئی چیز چوری ہوگئی۔ بہت تلاش کرنے کے بعد بھی جب چور کا پتا نہیں چلا تو اس نے دیوانِ حافظ سے فال دیکھنے کا ارادہ کیا۔ رات کا وقت تھا۔ اس نے ہاتھ میں دیوانِ حافظ لیا اور اس کو پڑھنے کے لیے لونڈی سے چراغ دکھانے کے لیے کہا۔ لونڈی اپنے ہاتھ میں چراغ لے کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے دیوانِ حافظ کھول کر اور آنکھ بند کر کے ایک شعر پر اپنی انگلی رکھ دی اور جب اس شعر کو پڑھا تو وہ دنگ رہ گیا۔ شعر یہ تھا:

بفروغِ چہرہ زلفش رہِ دیں زند ہمیشہ
چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

یعنی چور کتنا دلاور ہے کہ ہتھیلی پر چراغ رکھ کر چوری کرتا ہے۔ اب کیا تھا مالک نے اس لونڈی کو پکڑ لیا کیوں کہ فال صاف تھی۔ اس نے لونڈی سے کہا:

"اب صاف صاف بتادو کہ تم نے چوری کر کے چیز کہاں چھپائی ہے؟"

لونڈی بھی اب کیا کرتی آخر کار اس نے قبول کرلیا اور چوری کی ہوئی چیز مالک کے حوالے کردی۔

چور کا مال چنڈال کھائے

ناجائز طریقہ سے جمع کی گئی دولت دوسروں کے کام آتی ہے۔ حرام کی کمائی کا صحیح استعمال نہیں ہوتا۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: کسی شہر کے چار چوروں میں آپس میں بہت دوستی تھی۔ وہ جہاں بھی چوری کرتے، ساتھ چوری کرتے اور چوری کے مال کو آپس میں تقسیم کر لیتے۔ ایک بار انہوں نے ایک بڑے مالدار شخص کے یہاں چوری کی۔ بہت سارو پیہ اور مال واسباب ان کے ہاتھ آیا۔ چوری کے روپے اور مال اسباب آپس میں تقسیم کرنے کی غرض سے وہ ایک ویران اور بستی سے دور مقام پر گئے۔ ایک چور نے کہا:

"پہلے کچھ کھالیا جائے پھر مال تقسیم کیا جائے کیونکہ اب تو بھوک بھی لگ آئی ہے۔"

دوسرے چور نے کہا:

"آج تو بہت مال ہاتھ لگا ہے کیوں نہ اس خوشی میں مٹھائی کھائی جائے۔"

انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ دو لوگ مٹھائی لینے کے لیے بازار میں جائیں اور دو لوگ یہیں

رک کر روپے پیسے اور مال واسباب کی حفاظت کریں۔ دو چور کچھ پیسے لے کر مٹھائی لینے کے لیے بازار چلے گئے۔ انہوں نے راستہ میں صلاح کی کہ اگر ہم لوگ ان دونوں چوروں کو مار ڈالیں جو سامان کی حفاظت کر رہے ہیں تو ان دونوں کا حصہ بھی ہم لوگوں کو مل جائے گا۔ لہٰذا اُنہوں نے مٹھائی خرید کر اس میں زہر ملا دیا تا کہ مٹھائی کھا کر وہ دونوں چور مر جائیں۔ اُدھر جو دونوں چور مال واسباب کی حفاظت کر رہے تھے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر ہم لوگ ان دونوں چوروں کو مار ڈالیں تو تمام مال کے صرف ہم دونوں حقدار ہوں گے۔ مٹھائی لے کر جیسے ہی دونوں چور وہاں پہنچے، ان دونوں چوروں نے ان کو مار ڈالا۔ ابھی دونوں کی لاشیں ٹھنڈی بھی نہ ہو پائی تھیں کہ باقی دونوں چوروں نے مٹھائی کھانا شروع کر دی۔ مٹھائی کھاتے کھاتے دونوں بے ہوش ہو گئے اور تھوڑی دیر میں مر گئے۔ اس طرح چاروں چور تھوڑی ہی دیر میں چٹ پٹ ہو گئے۔ جب گاؤں کے چنڈالوں کو اس حادثے کی خبر ہوئی تو وہ وہاں پہنچے۔ انہوں نے تمام مال و دولت اپنے قبضے میں کیا اور چاروں چوروں کو نذرِ آتش کر کے اپنے گاؤں لوٹ آئے۔

چور کا مال سب کوئی کھائے، چور کی جان اکارت جائے

برے کو ضرر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بدمعاش ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ اس کو آخر میں نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: ایک شخص نے کسی کے گھر میں چوری کی اور مالک مکان کو قتل بھی کر دیا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر کے حاکم کے سامنے پیش کیا۔ جرم ثابت ہونے پر حاکم نے پھانسی کا حکم دیا۔ پھانسی کے وقت مجرم کی آخری خواہش کو پورا کیا جاتا ہے۔ وہ جس سے ملنا چاہتا ہے اس سے ملایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس مجرم سے بھی اس کی آخری خواہش کے بارے میں پوچھا گیا۔ اس نے اپنی ماں سے آخری ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ حاکم نے ملنے کی اجازت دے دی۔ جب اس کی ماں اس سے ملنے کے لیے آئی تو اس نے اس کو نہایت قریب بلا کر کہا:

''میں تیرے کان میں ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔''

اس کی ماں نے بات سننے کے لیے جب اپنے کان کو اپنے مجرم بیٹے کے منہ کے پاس کیا تو ماں کا کان دانت سے کتر دیا جس کی تکلیف سے وہ بلبلا اٹھی۔ لوگوں نے چور بیٹے پر لعنت وملامت کی اور کہا:

''کس قدر کمینہ اور ہے اور نالائق ہے کہ ایسے وقت بھی اپنی شرارت سے باز نہ آیا۔''

بیٹے نے جب لوگوں کو باتیں سنیں تو ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''اے لوگو میں بچپن سے چوری کرنے کا عادی ہوں۔ پہلے گھر کی چھوٹی موٹی چیزوں کو چرایا کرتا تھا مگر میری اس ماں نے گھر کی چیزیں چرا لے جانے پر کبھی باز پرس نہ کی۔ دھیرے دھیرے پاس پڑوس کے لوگوں کی چیزیں چرانے لگا۔ بڑا ہو کر اس کام میں مشاق ہو گیا اور پھر بڑی بڑی چوریاں کرنے لگا مگر میری ماں نے مجھ کو کبھی اس نازیبا فعل پر سرزنش نہ کی بلکہ خوشی خوشی گھر کے سب لوگ میرے چوری کیے ہوئے مال کو اڑاتے رہے۔ اگر شروع ہی میں مجھ کو اس کام سے روکا جاتا، تنبیہہ کی جاتی تو آج یہ روزِ بد مجھ کو دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ سب مزے میں رہے اور میری جان پر بن آئی۔''

یہ سن کر ایک شخص چیخ اٹھا:

''چور کا مال سب کوئی کھائے، چور کی جان اکارت جائے۔''

چور کی ڈاڑھی میں تنکا

چور خود اپنے چوکنا پن سے پہچانا جاتا ہے۔ عام طعنے اور کنایے کو اگر کوئی اپنی طرف گمان کرے تو بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ عیب دار اپنی حرکت سے پہچانا جاتا ہے۔ جہاں گڑھا ہوتا ہے وہاں پانی بھرتا ہے۔ چور چوری کی بات کو اپنے اوپر لے جاتا ہے۔ اصل میں یہ ایک قاضی کے فیصلے کی تلمیح ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی طرح سے مشہور ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

حکایت ۱: ایک شخص کی کوئی چیز چوری ہو گئی۔ اس نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ قاضی نے ان لوگوں کے نام پوچھے جن پر چوری کرنے کا شک تھا۔ قاضی نے مشتبہ آدمیوں کو بلا کر ایک صف میں کھڑا کیا اور اپنے پیادے سے کہا:

''میں جس کی طرف اشارہ کروں اسے فوراً گرفتار کر لینا۔''

پس یہ کہتے ہی قاضی نے کہا:

''دیکھ چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔''

چور کے دل میں چونکہ ڈر تھا۔ اس نے فوراً اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈالا۔ اس کی اس حرکت سے قاضی سمجھ گیا کہ یہی چور ہے۔ اس نے پیادے کی طرف اشارہ کیا اور پیادے نے اسے گرفتار کر لیا۔ بعد میں

چرائی ہوئی چیز بھی اس کے پاس سے برآمد ہوئی۔

حکایت ۲: ایک قافلے میں کسی کا مال چوری ہوگیا۔ صاحب مال نے قافلے کے تمام لوگوں کو جمع کر کے کہا:

''میرا مال چوری ہوگیا ہے۔ جس شخص نے لیا ہے، میں اس کو تاڑ گیا ہوں۔ اس کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔''

چور بھی اس مجمع میں موجود تھا اس کے دل میں خطرہ گذرا کہ شاید میری ڈاڑھی میں تنکا ہو اور مجھ پر چوری ثابت ہو جائے۔ اس خیال سے اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا تا کہ تنکا ڈاڑھی سے نکل کر گر جائے۔ اس کی اس حرکت سے وہ شناخت میں آگیا۔ غرض اس طرح چور کا پتا چل گیا اور مال بھی مل گیا۔

حکایت ۳: کسی شخص کا کچھ روپیہ جو بھوسے کی کوٹھری میں چھپا رکھا تھا، چوری ہوگیا۔ اس نے کوتوال سے فریاد کی۔ کوتوال بہت عقل مند تھا۔ وہ موقع واردات پر پہنچا، جگہ کا معائنہ کیا۔ مشتبہ لوگوں کو اکٹھا کیا اور سب کو ایک جگہ کھڑا کر کے کہا:

''جگہ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ جس کی ڈاڑھی میں تنکا ہو گا وہی چور ہو گا۔''

موجودہ لوگوں میں سے جو چور تھا اس نے اپنی ڈاڑھی پر احتیاطاً ہاتھ پھیرا کہ شاید کوئی تنکا ہو تو وہ گر جائے۔ کوتوال تو نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً اس کو پکڑ لیا اور کہا:

''چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔''

حکایت ۴: ایک گاؤں کے مندر سے ایک قیمتی مورتی چوری ہوگئی۔ گاؤں کے مکھیا اور دوسرے لوگوں نے چور کا پتا لگانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس گاؤں کے قریب ایک دوسرا بڑا گاؤں تھا۔ وہاں ایک بوجھ بجھکڑ رہتے تھے۔ جب سارا گاؤں کسی مسئلے کے حل میں ناکام ہو جاتا تھا تو گاؤں کے سربرآوردہ لوگ بوجھ بجھکڑ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی پریشانی بیان کرتے تھے۔ بوجھ بجھکڑ بڑے اعتماد سے سر ہلاتے، کبھی مسکراتے اور کبھی سنجیدہ صورت بنا لیتے اس کے بعد مسئلے کا حل بتا دیتے۔ چنانچہ مورتی چوری کا معاملہ بھی ان سے رجوع کیا گیا۔ بوجھ بجھکڑ نے آنکھیں بند کیں۔ دیر تک سوچتے رہے، پھر سب کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد ہنسنے لگے اور بولے:

''سارا گاؤں مل کر اپنے ہی گاؤں کے چور کا پتا نہیں لگا سکا۔ جاؤ اب ہم چور کو پکڑوا دیں گے اور مال بھی برآمد کروا دیں گے مگر سارے گاؤں پر جرمانہ بھی ڈالیں گے۔''

سب نے ایک زبان ہو کر کہا:

''بو جھ بجھکڑ جی! ہم سب تیار ہیں، جو حکم ہو ہم سب کو منظور ہے۔''

بو جھ بجھکڑ نے کہا:

''اب تم لوگ میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میں کل تمہارے گاؤں میں آ کر تدبیر بتا دوں گا۔''

اس کے بعد سب لوگ اپنے گاؤں کو واپس چلے گئے۔

دوسرے روز صبح ہی بو جھ بجھکڑ پنچائت میں پہنچ گئے۔ پنچائت کی اور سارے گاؤں کے لوگوں ک شکرانا (سادہ چاول جس میں کھاتے وقت کافی مقدار میں گھی اور شکر ڈالتے ہیں) کھلانے کی رائے دی روپیہ جمع کر لیا گیا، پنچائت گھر میں سب کو ایک جگہ بٹھا کر شکرانا کھلایا گیا، بیچ میں بو جھ بجھکڑ بیٹھ گئے۔ کھا کھاتے کھاتے اچانک اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مسکرا کر بولے:

''بھائیو! میں نے چور کا پتا لگا لیا ہے، یہیں بیٹھا ہے، کس مزے سے شکرانا اڑا رہا ہے،
اس کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔''

سب لوگ ڈاڑھی والوں کی طرف دیکھنے لگے۔ چور کے بھی ڈاڑھی تھی۔ وہ جلدی جلدی ڈاڑھی ک پھٹکارنے لگا کہ تنکا گر جائے۔ بو جھ بجھکڑ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''بھائیو! یہی چور ہے۔''

اس کو سب نے گھیر لیا۔ چور بو جھ بجھکڑ کے قدموں پر گر پڑا اور مورتی کو واپس کرتے ہو۔ گڑ گڑا کر معافی مانگنے لگا۔

چور کے گھر مور

چور کے گھر چوری ہونا۔ چالاک کو دغا دینا۔ یہ کہاوت اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص چالاک کو بھی دھوکا دے یا کوئی شخص کسی سے کوئی چیز اڑا لائے اور اس چیز کو اس سے کوئی دوسرا جھپٹ۔ جائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک چور نے کسی رئیس کے گھر میں چوری کی۔ اس کے ہاتھ تمام زیورات لگے۔ اس نے ان زیورات میں سے سونے کے ایک ہار کو ایک کھونٹی میں ٹانگ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دیوار کی منڈ

ایک مور آ کر بیٹھ گیا۔ مور نے کھونٹی سے لٹکا ہوا ہار دیکھا تو سمجھا کہ سانپ لٹک رہا ہے۔ وہ جھپٹا اور ہار کو سانپ سمجھ کر نگل گیا۔ مور کو ہار نگلتے ہوئے چور نے دیکھ کر کہا:

''کیا خوب! چور کے گھر مور۔

چور لاٹھی دو جنے، ہم باپ پوت اکیلے

جب کئی شخص ایک آدمی سے مات کھا جاتے ہیں تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنی کمزوری چھپانے کے لیے الٹی سیدھی یا بے مطلب کی باتیں کرتا ہے تو بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک حکایت سے ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کوئی باپ بیٹے اپنے گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ جنگل کا راستہ تھا۔ جب وہ دونوں سنسان راستے سے گزر رہے تھے کہ لاٹھی لیے ہوئے ایک چور ملا۔ چور نے ان پر حملہ کیا اور ڈرا دھمکا کر ان کا سارا سامان چھین لیا۔ سامان چھن جانے کے بعد جب دوسرے گاؤں پہنچے اور لوگوں کو اس حادثے کا پتا چلا تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا تو انہوں نے کہا:

''ہم (باپ، بیٹا) اکیلے تھے اور وہ (چور اور لاٹھی) دو تھے۔ لہٰذا ان دو کے مقابلے میں ہم اکیلے کر بھی کیا سکتے تھے؟''

چوروں کے ساتھ مانڈو بھی پھنسے

خطا کار کے ساتھ نیک شخص کی سرزنش۔ جب کسی قصوروار کے ساتھ کسی نیک اور شریف شخص کو سزا دی جائے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب یہ واقعہ ہے:

واقعہ: کئی ڈاکوؤں نے کسی مالدار کے گھر میں ڈاکہ ڈالا۔ ان کے ہاتھ بہت سا مال لگا۔ لوٹ کا مال لے کر وہ اس جنگل میں پہنچے جہاں مانڈو یہ رشی کا آشرم تھا۔ انہوں نے لوٹ کے مال کو رشی کے آشرم میں چھپا دیا اور خود بھی وہیں چھپ گئے۔ جب راجا کے محافظ ڈاکوؤں اور مال کی تلاش میں آشرم پہنچے اور احتیاطاً آشرم کی تلاشی لی تو انہوں نے ڈاکوؤں کو بھی گرفتار کر لیا اور لوٹے گئے مال کو بھی برآمد کر لیا۔ آشرم میں ڈاکوؤں اور مال کی موجودگی سے محافظوں کا شک یقین میں بدل گیا اور مانڈو یہ رشی کا ان ڈاکوؤں سے ضرور تعلق ہے۔ انہوں نے ڈاکوؤں کے ساتھ رشی کو بھی قصوروار ٹھہرا کر سخت سزا دی۔

سب نے ایک زبان ہو کر کہا:

''بوجھ بجھکڑ جی! ہم سب تیار ہیں، جو حکم ہو ہم سب کو منظور ہے۔''

بوجھ بجھکڑ نے کہا:

''اب تم لوگ میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میں کل تمہارے گاؤں میں آ کر تدبیر بتادوں گا۔''

اس کے بعد سب لوگ اپنے گاؤں کو واپس چلے گئے۔

دوسرے روز صبح ہی بوجھ بجھکڑ پنچائت میں پہنچ گئے۔ پنچائت کی اور سارے گاؤں کے لوگوں ک
شکرانا (سادہ چاول جس میں کھاتے وقت کافی مقدار میں گھی اور شکر ڈالتے ہیں) کھلانے کی رائے دی
روپیہ جمع کر لیا گیا، پنچائت گھر میں سب کو ایک جگہ بٹھا کر شکرانا کھلایا گیا، بیچ میں بوجھ بجھکڑ بیٹھ گئے۔ کھا
کھاتے کھاتے اچانک اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مسکرا کر بولے:

''بھائیو! میں نے چور کا پتا لگا لیا ہے، یہیں بیٹھا ہے، کس مزے سے شکرانا اڑا رہا ہے،
اس کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔''

سب لوگ ڈاڑھی والوں کی طرف دیکھنے لگے۔ چور کے بھی ڈاڑھی تھی۔ وہ جلدی جلدی ڈاڑھی ک
پھٹکارنے لگا کہ تنکا گر جائے۔ بوجھ بجھکڑ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''بھائیو! یہی چور ہے۔''

اس کو سب نے گھیر لیا۔ چور بوجھ بجھکڑ کے قدموں پر گر پڑا اور مورتی کو واپس کرتے ہوئے
گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔

چور کے گھر مور

چور کے گھر چوری ہونا۔ چالاک کو دغا دینا۔ یہ کہاوت اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص
چالاک کو بھی دھوکا دے یا کوئی شخص کسی سے کوئی چیز اڑا لائے اور اس چیز کو اس سے کوئی دوسرا جھپٹ
جائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک چور نے کسی رئیس کے گھر میں چوری کی۔ اس کے ہاتھ تمام زیورات لگے۔ اس
نے ان زیورات میں سے سونے کے ایک ہار کو ایک کھونٹی میں ٹانگ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دیوار کی منڈ

ایک مور آ کر بیٹھ گیا۔ مور نے کھونٹی سے لٹکا ہوا ہار دیکھا تو سمجھا کہ سانپ لٹک رہا ہے۔ وہ جھپٹا اور ہار کو سانپ سمجھ کر نگل گیا۔ مور کو ہار نگلتے ہوئے چور نے دیکھ کر کہا:

''کیا خوب! چور کے گھر مور۔''

چور لاٹھی دو جنے، ہم باپ پوت اکیلے

جب کئی شخص ایک آدمی سے مات کھا جاتے ہیں تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنی کمزوری چھپانے کے لیے الٹی سیدھی یا بے مطلب کی باتیں کرتا ہے تو بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک حکایت سے ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کوئی باپ بیٹے اپنے گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ جنگل کا راستہ تھا۔ جب وہ دونوں سنسان راستے سے گزر رہے تھے کہ لاٹھی لیے ہوئے ایک چور ملا۔ چور نے ان پر حملہ کیا اور ڈرا دھمکا کر ان کا سارا سامان چھین لیا۔ سامان چھن جانے کے بعد جب دوسرے گاؤں پہنچے اور لوگوں کو اس حادثے کا پتا چلا تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا تو انہوں نے کہا:

''ہم (باپ، بیٹا) اکیلے تھے اور وہ (چور اور لاٹھی) دو تھے۔ لہٰذا ان دو کے مقابلے میں ہم اکیلے کر بھی کیا سکتے تھے؟''

چوروں کے ساتھ مانڈو بھی پھنسے

خطاکار کے ساتھ نیک شخص کی سرزنش۔ جب کسی قصوروار کے ساتھ کسی نیک اور شریف شخص کو سزا دی جائے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب یہ واقعہ ہے:

واقعہ: کئی ڈاکوؤں نے کسی مالدار کے گھر میں ڈاکہ ڈالا۔ ان کے ہاتھ بہت سا مال لگا۔ لوٹ کا مال لے کر وہ اس جنگل میں پہنچے جہاں مانڈو یہ رشی کا آشرم تھا۔ انہوں نے لوٹ کے مال کو رشی کے آشرم میں چھپا دیا اور خود بھی وہیں چھپ گئے۔ جب راجا کے محافظ ڈاکوؤں اور مال کی تلاش میں آشرم پہنچے اور احتیاطاً آشرم کی تلاشی لی تو انہوں نے ڈاکوؤں کو بھی گرفتار کر لیا اور لوٹے گئے مال کو بھی برآمد کر لیا۔ آشرم میں ڈاکوؤں اور مال کی موجودگی سے محافظوں کا شک یقین میں بدل گیا اور مانڈو یہ رشی کا ان ڈاکوؤں سے ضرور تعلق ہے۔ انہوں نے ڈاکوؤں کے ساتھ رشی کو بھی قصوروار ٹھہرا کر سخت سزا دی۔

چھوڑو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی بھلا

دیکھیے: بخشو بی بلی، چوہا لنڈورا ہی بھلا۔

حبشی کی ٹوپی نرالی

ہر شخص کو اپنی ہی عقل اور اپنا ہی بیٹا سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی بادشاہ کے دربار میں بچوں کے پیار پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وہاں دو گروہوں کے درمیان مختلف رائے تھیں۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ بچوں پر عموماً سب کو پیار آتا ہے۔ بچہ کسی کا ہو سب کو خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ ہر شخص اپنے بچے کو دنیا کے دوسرے بچوں سے زیادہ خوبصورت اور عقل مند خیال کرتا ہے۔ اس کو اپنے بچے پر زیادہ پیار آتا ہے۔ صبح سے شام ہوگئی مگر کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ بادشاہ نے رائے کی سچائی معلوم کرنے کے لیے دربار کو ملتوی کرتے ہوئے دوسرے دن دربار منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے دن شہر کے ہر طبقے کے بچوں کو دربار میں بلایا گیا۔ جس میں وزیروں، سرداروں، مالداروں اور رئیسوں کے بچے بھی تھے اور خدمت گاروں، غلاموں، نوکروں اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے بچے بھی تھے۔ بادشاہ نے ایک بہترین زرنگار ٹوپی شاہی تخت پر رکھوادی۔ جب دربار آراستہ ہوا اور بادشاہ تشریف لائے تو بچوں کی دنیا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بچے بھی دربارِ شاہی میں پہنچ کر بہت مگن تھے۔ بادشاہ نے زرنگار ٹوپی اٹھائی اور ایک حبشی غلام کو اشارہ سے اپنے پاس بلایا۔ جب وہ بادشاہ کے سامنے آکر دست بستہ کھڑا ہوا تو بادشاہ نے اسے ٹوپی دے کر کہا:

"اس وقت دربار میں بہت سے بچے ہیں۔ تم کو جو سب سے پیارا اور خوبصورت نظر آئے اسے یہ ٹوپی پہنادو۔"

حکم کی تعمیل میں حبشی غلام ٹوپی لے کر بچوں کی صفوں سے گزرتا گیا اور غور سے بچوں کو دیکھتا گیا وہاں اس حبشی غلام کا بچہ بھی موجود تھا۔ جب وہ اپنے بچے کے پاس پہنچا تو اس نے وہ ٹوپی اپنے بچے کو پہنا دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر شخص اپنے بچہ ہی کو زیادہ خوبصورت اور بہتر سمجھتا ہے اور سب سے زیادہ اس کو پیار کرتا ہے۔

حساب جوں کا تیوں، کنبہ ڈوبا کیوں؟

حساب تو ٹھیک ہے مگر خاندان دریا میں کیوں ڈوبا؟ کم پڑھنا لکھنا خطرناک ہوتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ تجربہ ضروری ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک منشی جی جو خود کو ماہر حساب سمجھتے تھے، اپنے پورے خاندان کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک گہری ندی پڑتی تھی۔ جب وہ ندی کے کنارے پہنچے تو منشی جی نے ندی کو پار کرنے سے پہلے اس کی گہرائی ناپی اور پھر اپنے خاندان کے ہر فرد کی لمبائی ناپ کر اس کا اوسط نکالا۔ خاندان کے ہر فرد کی لمبائی کا اوسط ندی کی گہرائی سے زیادہ تھا۔ اس لیے وہ اپنے خاندان کے ساتھ ندی کو پار کرنے کے لیے اس میں اتر پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا خاندان ڈوب گیا اور منشی جی بہہ گئے۔ منشی جی پڑھے لکھے تو تھے بلکہ ماہر حساب بھی تھے مگر صرف حساب لگانے بھر کے، تجربہ سے کورے تھے۔ وہ اتنے ذہین نہ تھے کہ سوچتے، اس طرح اوسط لگانا یہاں کام نہ دے گا۔

حضور کا غلام ہوں، بینگن کا نہیں

آپ کا نوکر ہوں، بینگن کا غلام نہیں ہوں۔ آپ کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں اس کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے جھوٹ سچ سے کوئی مطلب نہیں۔ اپنے مالک یا حاکم کی جی حضوری کرنے اور مطلب پرست کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ جو شخص لالچ کے باعث کسی کی جا بے جا طرفداری کرے اس کے لیے بھی یہ کہاوت استعمال ہوتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی طرح سے بیان کی جاتی ہے۔ ایک حکایت اکبر اور بیربل کے مابین گفتگو ہے۔

(دیکھیے: آپ کا نوکر ہوں، کچھ بینگنوں کا نوکر نہیں)

حکایت ۲: ایک نواب صاحب رات کا خاصہ نوش جاں فرما رہے تھے۔ غذا میں بینگن کا سالن بھی تھا۔ نوابوں کے یہاں مصاحبین کی باتیں بڑی عجیب اور مزیدار ہوتی ہیں۔ وہ مزاج شناس بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس محبت میں بھی ایک مصاحب نے اپنی ذہانت کے جلوے دکھائے۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ نواب صاحب بینگن کا سالن دوسری غذاؤں کے مقابلے میں خوب مزے لے کر کھا رہے ہیں، کہنے لگا:

''حضور بینگن بھی کیا چیز ہے۔ اس ترکاری کا کیا کہنا، اس کی بورانی بنتی ہے، بینگن کے بھی کتنے آداب ولوازم ہیں، بریانی سے کھائیے، دلما بھی پکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ الٹے ہاتھ سے بھی کھاؤ تو بھی مزے کے لگیں۔ بینگن کا سا حسن تو فطرت نے کسی دوسری ترکاری کو عطا ہی نہیں کیا۔ کیا رنگ ہے، کیا روپ ہے، اس پر کیسی دمک ہے، ریشم کی طرح چکنا ہے، چتر دھاری ہے، سر پر سبز تاج ہے اور شاہی عصا بھی شامل ہے۔ ترکاریوں کا راجا ہے۔ واقعی بادشاہوں کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔''

نواب صاحب خوش ہو کر مصاحب کی لذیذ حکایت سنتے رہے اور مزے لے لے کر بینگن کا سالن معمول سے زیادہ مقدار میں کھا گئے۔ محفل برخاست ہوئی، نواب صاحب محل سرا میں پہنچے۔ استراحت کے لیے مسہری پر لیٹ گئے۔ انہیں رات کو خوشگوار نیند نہیں آئی۔ پیٹ میں قراقر رہی۔ صبح کو جب نواب کا دربار لگا تو نواب صاحب نے فرمایا:

''بھئی بینگن تو بڑی بیہودی ترکاری ہے، رات بھر پیٹ میں درد سارہا، تمام رات بے چینی میں کٹی۔ آئندہ میری غذا میں بینگن کو شامل نہ کیا جائے۔''

کل جو مصاحب بینگن کی تعریف کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے۔ بینگن کی برائی سنتے ہی کہنے لگے:

''حضور والا! بینگن سے بری اور مضر تو دنیا میں کوئی ترکاری نہیں ہے۔ نام سنئے تو بے گن، رنگ دیکھیے تو سب ترکاریوں سے جدا، نہ سبز ہے نہ بادامی نہ سفید، پوری طرح کالا بھی نہیں ہے۔ اس کو کاٹ کر دیکھیے تو بھدا بیج افراط سے بھرے ہوئے جیسے کیڑے سما گئے ہوں۔ اس لیے فطرت نے اس کے دہانے پر سبز مہر لگا دی ہے اور دماغ میں میخ ٹھونک دی ہے۔''

یہ سن کر نواب صاحب نے کہا: بینگن کے بیان میں رات اور صبح کو یہ فرق؟''

مصاحب نے دست بستہ عرض کیا: ''حضور کا غلام ہوں بینگن کا نہیں۔''

خان اپنا پیسہ کھاتا ہے

اس کہاوت کا استعمال ایسے موقعوں پر کرتے ہیں جب کوئی اپنے مال کو خرچ کرے اور لوگ اس پر بے وجہ تنقید کریں یا پھر جہاں کوئی شخص اپنے پیسے کو بے جا صرف کرے یا پھوہڑپن سے خرچ کرے یا پیسہ خرچ کرنے کی جس کو تمیز نہ ہو۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو معمولی فرق کے

ساتھ کئی طرح سے بیان کی جاتی ہے۔(دیکھیے ''باباز رِخودمی خورم'')

حکایت: ایک افغان نے ہندوستان کی غذاؤں کی بہت تعریف سن رکھی تھی کہ وہاں کھانے کی ایک سے ایک بہترین چیز سستے داموں ملتی ہے۔اتفاق سے اسے ہندوستان کسی کام سے آنا ہوا۔جس شہر میں اس کا قیام تھا، سب سے پہلے اس شہر کے بازار گیا تاکہ بہترین غذائیں خرید کر کھا سکے۔افغان کھانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔دیکھنے میں اسے جو چیز اچھی لگی اسے خرید کر کھانے لگا۔مٹھائی کی دوکان پر پہنچا تو لڈو، پیڑے، جلیبی، برفی وغیرہ کا مزہ لیا۔پھلوں کی دوکان کی طرف گیا تو کیلے، سنگترے اور انگور وغیرہ بک رہے تھے۔وہ ان میں سے کچھ پھل خریدتا اور مزے لے کر کھاتا۔کچھ آگے بڑھا تو کریانے کا سامان بک رہا تھا۔کئی قسم کے سفید، لال، پیلے بادامی رنگ کے مختلف بناوٹ کے صابون ایک دوکان میں رکھے ہوئے تھے۔خان نے لال رنگ کا ایک صابون خریدا اور راستے کے کنارے کھڑے ہوکر اسے کھانے لگا۔صابون میں لڈو، پیڑے، برفی، جلیبی اور پھلوں جیسا مزہ تو نہ تھا۔اس نے سوچا یہ ضرور کوئی فائدے مند چیز ہے جو جسم کے لیے مفید ہوگی۔وہ جیسے جیسے اسے چباتا جارہا تھا۔منہ سے جھاگ نکل کر باہر آرہی تھی۔آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ناک ٹپکنے لگی تھی۔خان کی اس حرکت کو دیکھ کر لوگ اس کے قریب جمع ہوگئے تھے۔آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔لوگ طرح طرح کی باتیں کررہے تھے اور اس کی بے وقوفی پر ہنس رہے تھے۔کچھ دیر بعد ایک شخص خان کے پاس گیا اور اس سے کہا:

''اے خان برادر یہ کیا کھاتا ہے۔یہ تو صابون ہے، اس سے کپڑے دھوئے جاتے ہیں، نہاتے وقت بدن پر لگایا جاتا ہے۔یہ کھانے کی چیز نہیں ہے۔''

خان نے جواب دیا:

''میں کچھ نہیں جانتا کہ اس سے کپڑے دھوئے جاتے ہیں یا نہایا جاتا ہے یا اس کا نام کیا ہے؟ میں نے تو اسے اپنی محنت کی کمائی کے پیسے سے خریدا اور خان اپنا پیسہ کھاتا ہے۔آپ لوگ یہاں کھڑا کھڑا کیا دیکھتا ہے، جاتا کیوں نہیں؟''

خان خاناں، جن کے کھانے میں بطانہ

پوشیدہ طور پر کسی کی مدد کرنا۔کسی پر اس طرح احسان کرنا کہ وہ شرمندہ نہ ہو۔یہ مثل ایسے موقع بولی جاتی ہے جب کوئی شخص نہایت خاموشی کے ساتھ کسی کی ضرورت کو پورا کرے۔(بطانہ بمعنی پوشیـ

چیز) اس مثل کا تعلق اس واقعہ سے ہے:

واقعہ: کہا جاتا ہے کہ خان خاناں نہایت منعم، سخی اور مخیر تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت کو رفع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ ضرورت مندوں کی اس طرح مدد کرتے تھے کہ ان کو پتا بھی نہ چلے اور ان کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ وہ جب کسی ضرورت مند کو کھانا بھجواتے تھے تو اس میں اشرفیاں چھپا کر رکھ دیتے تھے تاکہ اس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔ اسی لیے مجازاً ہر پوشیدہ احسان کرنے والے کی نسبت بولنے لگے۔

خان خاناں، کھانے میں بطانہ

دیکھیے: خان خاناں جن کے کھانے میں بطانہ

خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے

خدا کا ہر کام اچھا ہوتا ہے۔ خدا جو بھی کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ جب کسی پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسے صبر و تحمل کرنے اور تسلی دینے کے لیے کہتے ہیں۔ اس قول کے تعلق سے ایک کہانی بیان کی جاتی ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی طرح سے مشہور ہے:

کہانی: زمانۂ قدیم کی بات ہے۔ کسی ملک کے بادشاہ کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے کئی وزیر تھے جن میں سے ایک وزیر بہت عقل مند اور دور اندیش تھا۔ وہ نہایت خدا پرست اور ایمان کا پکا تھا۔ وہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنے ہوش و حواس درست رکھتا تھا۔ بادشاہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ وزیر اکثر کہا کرتا تھا۔ خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔

ایک بار بادشاہ اپنے اسی وزیر کے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے جنگل گیا۔ وہاں کسی اوزار سے اس کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ بادشاہ نے وزیر کو دکھایا۔ وزیر نے اس میں پٹی باندھتے ہوئے کہا:

''خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اس میں آپ کی بھلائی ہی ہوگی۔''

بادشاہ تو انگوٹھے کے کٹ جانے سے نہایت غمزدہ تھا۔ اسے وزیر پر غصہ آیا۔ اس نے وزیر کو ڈانٹتے ہوئے آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جانے کو کہا۔ وزیر یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا:

''خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اس میں بھلائی ہوگی۔''

کہانی ۲: دوسری روایت اس طرح ہے کہ ایک بار بادشاہ کے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے پر ایک پھوڑا نکل آیا۔ تمام علاج کرنے پر بھی وہ ٹھیک نہ ہوا۔ آخر کار انگوٹھے کو کاٹنا پڑا۔ بادشاہ کو انگوٹھا کٹ جانے کا بہت افسوس ہوا۔ وزیروں کو دربار میں بلا کر جب بادشاہ نے اپنے غم کا اظہار کیا تو ہر وزیر نے بھی افسوس جتایا لیکن اس وزیر نے کہا:

''عالم پناہ! خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے اس میں آپ کی بہتری ہوگی۔''

وزیر کی یہ بات بادشاہ کے دل میں چبھ گئی۔ اس نے طیش میں آ کر وزیر کو قید خانے میں ڈلوا دیا اور کہا میں تو تمہیں بہت قابل اور عقل مند سمجھتا تھا۔ تمہاری عزت بھی کرتا تھا۔ مگر آج میرا نظریہ بدل گیا ہے۔ کسی کا کوئی عضو کٹ جانے پر بھلا کیا بہتری ہوسکتی ہے۔ جب سپاہی وزیر کو قید خانے کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس وقت بھی وزیر کہہ رہا تھا۔ حضور اس میں بھی کوئی بھلائی ہوگی۔ خدا جو کرتا ہو ٹھیک ہی کرتا ہے۔ بادشاہ کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس نے عمر قید کی سزا سنا دی۔

کچھ دنوں کے بعد جب بادشاہ پھر شکار کے لیے جنگل گیا تو ایک ہرن کا پیچھا کرتے کرتے بہت دور نکل گیا۔ راستے میں چوروں یا وحشیوں نے اسے گھیر لیا۔ انہیں دیوی ماں کی مورتی کے سامنے بلی چڑھانے کے لیے ایک تندرست آدمی کی تلاش تھی۔ بادشاہ جیسے لحیم و شحیم، خوب صورت اور جوان آدمی کو پا کر وہ لوگ بہت خوش ہوگئے۔ بلی چڑھانے کے لیے ایسا گبھرو مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ انہوں نے اپنی رسم کے مطابق بادشاہ کو نہلایا یا دُھلایا، بلی کے بہترین کپڑے پہنوائے، بہترین کھانا کھلایا اور سجا سنوار کر دیوی ماں کی مورتی کے پاس لے گئے اور کالی ماں کے چرنوں کے قریب بیٹھا دیا۔ بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف موت ناچ رہی تھی۔ ایک وحشی اس کے سامنے خنجر لے کر کھڑا ہوگیا۔ دیگر وحشی خوشی میں جھوم جھوم کر ناچنے گانے لگے۔ بس بلی چڑھانے کے لیے وحشیوں کو اپنے پروہت کا انتظار تھا۔ اتنے میں پروہت بھی وہاں پہنچ گیا۔ سب لوگ کالی ماں کی جے جے کار کرنے لگے۔ بادشاہ نے خیال کیا اب جان گئی تب جان گئی۔ پروہت نے بادشاہ کو غور سے دیکھا۔ اس کے ایک ایک عضو کا معائنہ کیا اور جب داہنے ہاتھ کے انگوٹھے پر نظر پڑی تو وہ کٹا ہوا تھا۔ پروہت نے کہا:

''اس شخص کی بلی نہیں چڑھائی جاسکتی کیونکہ اس کا ایک عضو کٹا ہوا ہے۔ کالی ماں ناراض ہو جائیں گی۔ وہ سالم آدمی کی بلی مانگتی ہیں۔ اسے چھوڑ دیا جائے اور دوسرے آدمی کو تلاش کر کے فوراً لایا جائے ورنہ مہورت نکل جائے گا۔''

غرض بادشاہ کو چھوڑ دیا گیا۔ بادشاہ کی جان میں جان آئی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوا اپنی سلطنت پہنچا۔ اسے وزیر کی بات یاد آئی کہ خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے وہ سوچنے لگا اگر میرا انگوٹھا کٹا نہ ہوتا تو میں ضرور قتل کر دیا گیا ہوتا۔ بادشاہ نے وزیر کو زنداں سے رہا کروایا اور اس سے معافی کا خواستگار ہوا۔ اس نے اپنی ساری روداد وزیر کو سنائی۔ وزیر نے کہا:

''حضور! زنداں میں میری بھلائی ہی ہوئی۔ اگر میں قید خانے میں نہ ہوتا تو ضرور آپ کے ساتھ ہوتا۔ وحشی لوگ آپ کا انگوٹھا کٹا ہونے کے سبب آپ کو تو چھوڑ دیتے اور آپ کے بجائے میری بلی چڑھا دیتے۔''

بادشاہ نے کہا سچ ہے:

''خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔''

داتا دان دے بھنڈاری کا پیٹ پھٹے

سخی سخاوت کرے، شوم بخیل جَل جَل مرے۔ کوئی جلے کوئی حسد کرے۔ یہ کہاوت اس جگہ کہی جاتی ہے جہاں کوئی شخص کسی کو کچھ دے اور دیکھنے والے کو ناگوار ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک واقعہ اس طرح مشہور ہے:

کہانی: حضرت شاہ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید عرصہ دراز سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ دیگر امور کے علاوہ اس کے سپرد بھنڈارا بھی تھا۔ بھنڈاری کی حیثیت سے وہ ہر آنے جانے والے کے قیام و طعام کا انتظام کرتا تھا مگر اب تک دولت فقر سے محروم تھا۔ ایک روز ایک شخص حضرت شاہ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور بھنڈاری سے اپنے ٹھہرنے اور کھانے کے لیے گزارش کی۔ بھنڈاری اس کے قیام وطعام کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی جب وہ شخص وہاں سے جانے لگا تو بھنڈاری اپنی فراست سے سمجھ گیا کہ اس شخص کو ایک ہی رات میں حضرت شاہ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ نے دولت فقر سے نواز دیا۔ اس نے اس شخص سے کہا کہ

''حضرت نے تم کو ایک ہی رات میں سب کچھ عطا کر دیا ہے اور میں ایک مدت سے یہاں حاضر ہوں اور خدمت کر رہا ہوں مگر اب تک دولت فقر سے محروم ہوں۔''

اس شخص نے جواب دیا:

''داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھٹے'' یا ''داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھولے''

اس کے جواب میں اتنی تاثیر تھی کہ اسی وقت بھنڈاری کے پیٹ میں درد ہونے لگا اور پیٹ پھولنے لگا۔ شدت کا درد ہونے اور پیٹ کے برابر پھولنے کے سبب تھوڑی ہی دیر میں اس کا پیٹ پھٹ گیا اور روح پرواز کر گئی۔ وہ اس طرح حسد کی آگ میں جل بھن کر مر گیا۔

داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھولے

دیکھیے: داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔

داتا دے، بھنڈاری کا پیٹ پھٹے

دیکھیے: داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔

داتا دے، بھنڈاری کا پیٹ پھولے

دیکھیے: داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔

داتا دے، بھنڈاری کی چھاتی پھٹے

دیکھیے: داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔

داتا دے، بھنڈاری کی گانڑ پھٹے

دیکھیے: داتا دان دے، بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔

دال چاول بھی ہے، اُلّن بھی ہے

دیکھیے: آٹا دال اور اُلو بھی ہے۔ (اس کہاوت میں اُلو کے بجائے اُس کی مادہ ''اُلّن'' کا ذکر ہے)۔

دال میں کچھ کالا ہے

دیکھیے: کچھ دال میں کالا ہے۔

دُبلے کو ماریں شاہ مدار

دیکھیے: مرتے کو ماریں شاہ مدار۔

دَدّا ہم پانوں سِکوڑ کر ناپ دے آئے، کہا تو بیٹا پہن کر کون سُکھ اُٹھاؤ گے

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی نہایت چالاک شخص نہایت احمقانہ حرکت کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک کسان کا لڑکا جو اپنے آپ کو نہایت چالاک اور ہوشیار سمجھتا تھا، اپنے جوتے بنوانے کے لیے ایک چمار کے پاس گیا۔ اس نے چمار سے جوتوں کے دام پوچھے۔ چمار نے بڑے جوتوں کے زیادہ چھوٹے جوتوں کے کم دام بتائے۔ لڑکے نے سوچا اگر کچھ چھوٹا جوتا پہنا جائے تو کچھ کم دام دینا پڑیں گے۔ یہ سوچ کر اس نے ناپ دیتے وقت اپنے پیر سکوڑ لئے۔ لڑکا اپنے من ہی من میں نہایت خوش ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے پیر سکوڑ کر چمار کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ اب چھوٹے جوتوں کے کم پیسے دینا پڑیں گے۔ گھر آ کر جب اس نے اپنے باپ سے بڑے فخر کے ساتھ اپنی ہوشیاری اور چمار کو بے وقوف بنانے کی بات کہی تو باپ نے بیٹے سے کہا:

"تو بیٹا پہن کر کون سکھ اٹھاؤ گے۔"

دریا میں بہو بندر

جب کوئی شخص ناواقفیت کی بنا پر کسی بات کا مطلب کچھ سے کچھ سمجھے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک مالدار مگر اَن پڑھ کسان رہتا تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ تنہائی کی زندگی سے تنگ آ کر اس نے ایک بندر کو پال لیا۔ دھیرے دھیرے اسے بندر سے محبت ہو گئی۔ وہ بندر کے ساتھ کھاتا پیتا اور بندر ہی کے ساتھ سوتا۔ وہ جہاں کہیں جاتا بندر کو ضرور ساتھ لے جاتا۔ دھیرے دھیرے اس کی یہ حالت ہو گئی کہ بغیر بندر کے ایک پل بھی اس سے نہیں رہا جا سکتا تھا۔ بندر کو وہ سگی اولاد سے بھی زیادہ چاہتا اور پیار کرتا تھا۔ ایک عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک رات معمول کے مطابق کسان بندر کے ساتھ سو رہا تھا کہ اچانک بندر چپ چاپ اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ جب کسان کی آنکھ کھلی تو اس نے بندر کو اِدھر اُدھر ڈھونڈا، آوازیں لگائیں مگر بندر کا کہیں پتا نہ چلا۔ بندر کے غم میں کسان کا برا حال ہو گیا۔ اس نے کھانا پینا کم کر دیا۔ بندر کے ہجر و فراق میں سوکھ کر کانٹا ہونے لگا۔

ایک روز کسان نے اسی غم میں سوچا کہ نہ میری کوئی اولاد ہے نہ بیوی نہ ہی کوئی رشتہ دار۔ یہ تمام دولت میرے کس کام کی ہے۔ آخر ایک بندر ہی تو تھا جو میری اولاد کی طرح تھا۔ جب وہ ہی چلا گیا تو اس دولت کا وارث کون ہوگا۔ کیوں نہ اس دولت کو اسے ڈھونڈنے کے لیے خرچ کر دی جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے ساتھ سفر کا سامان لیا اور تمام دولت لے کر بندر کو ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ عرصۂ دراز تک اطراف کے تمام جنگلوں اور شہروں میں وہ بندر کو ڈھونڈتا پھرا مگر کہیں اس کا سراغ تک نہ ملا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بندر کو تلاش کرتا رہا۔ نہ اسے کھانے پینے کی سُدھ تھی نہ کپڑوں کی۔ اس کی ڈاڑھی بڑھ گئی تھی۔ حلیہ بالکل بدل گیا تھا۔ تھک ہار کر گھومتا پھرتا بندر کو تلاش کرتا ہوا کئی سال کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس آیا۔ اس عرصہ میں گاؤں کا نقشہ بدل گیا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ بچے بڑے ہو گئے تھے جن کو پہچاننا مشکل تھا۔ گاؤں کے ایک قدرے وسیع میدان میں لوگ جمع تھے۔ شاید کوئی تقریب تھی۔ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا ہوا قوال لہک لہک کر فارسی کی ایک غزل پڑھ رہا تھا۔ یہ شخص بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ قوال نے جب یہ مصرع پڑھا:

"ایں طرفہ تماشہ دریا بہ حَباب اندر"

تو اس شخص نے جیب سے نوٹ نکال کر قوال کی نذر کیا۔ قوال نے اس مصرع کو پھر پڑھا تو اس نے پھر ایک نوٹ نذر کیا۔ قوال نے سوچا کہ اس شخص کو یہ مصرع پسند آ گیا ہے اسی لیے نذرانہ دے رہا ہے۔ اب کیا تھا قوال بار بار مصرع کو پڑھتا اور وہ بار بار اچھی خاصی رقم نذر کرتا۔ سامعین حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے؟ قوال نے اس مصرع کو اس کثرت سے ادا کیا کہ اس کی جیب خالی ہو گئی۔ جب اس کے پاس دینے کے

لیے کچھ نہ بچا تو بڑے بڑے آنسوؤں سے رونے لگا۔ مجمع سے ایک شخص اس کے پاس اٹھ کر آیا اور پوچھنے لگا:

''بڑے میاں! کیا آپ بتانے کی زحمت کریں گے کہ اس مصرع میں کیا خاص بات تھی جو آپ کو پسند آگئی اور آپ نے اپنی ساری دولت قوال کے نذر کردی۔''

اس شخص نے جواب دیا:

''یہ شخص قوال نہیں، اللہ کا ولی ہے۔ بہت پہنچا ہوا ہے۔ میں بیس سال سے اپنے پیارے بندر کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں مگر آج تک اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ نہ تو میرا کوئی عزیز ہے نہ رشتہ دار اور نہ ہی کوئی اولاد۔ یہ دولت اسی بندر کے لیے تھی۔ یہ قوال مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا: ''کیوں ہر طرف تماشہ کرتا پھر رہا ہے؟ دریا میں بہہ گیا ہے بندر۔'' میں نے سوچا اگر یہ پہلے ہی مل جاتا تو میں ناحق پریشان تو نہ ہوتا۔ یہ رقم بندر کو ڈھونڈنے کے لیے ہی تھی لہٰذا میں نے سب کی سب اس پہنچے ہوئے قوال کو دے دی۔''

اس شخص نے سوچا عجیب جاہل آدمی ہے۔ قوال پڑھ رہا تھا:

''این طرفہ تماشہ دریا بہ حباب اندر'' اور یہ شخص سمجھ رہا تھا'' ہر طرف تماشہ کیا، دریا میں بہا بندر''

دریں چہ شک

اس میں شک کی کوئی بات نہیں۔ اس میں کیا شک ہے؟ جب کوئی شخص لالچ میں پڑ کر کسی سے فریب کھا جائے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک دلچسپ حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک سوداگر تھا۔ اس کا کاروبار بگڑ گیا تھا۔ دوستوں نے رفاقت چھوڑ دی تھی۔ قرض خواہ تقاضے کے لیے بار بار اس کے پاس آتے تھے۔ اس کی بیوی بھی تیز اور طرار تھی۔ پریشان ہو کر سوداگر اور اس کی بیوی نے صلاح کی کہ اس شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جا کر بسنا چاہئے۔ و[...] دونوں اپنا سارا سامان لے کر وہاں سے کسی دوسرے شہر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے پاس بنگالے کی ایک مینا بھی تھی۔ نئے شہر میں پہنچ کر انہوں نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اس مکان کے دو دروازے تھے۔

ایک دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ چھتے میں اور پیچھے کی طرف کھلتا تھا۔ انہوں نے دروازے پر ایک پہرہ دار مقرر کر دیا۔ اب سوداگر نے نئے شہر کے بازاروں میں گھومنا شروع کیا۔ اس نے کپڑے، زیورات، فرنیچر، کراکری وغیرہ کی بڑی بڑی دوکانوں کو دیکھا۔ گھر میں بیوی نے مینا کو ''دریں چہ شک'' کی خوب مشق کرائی۔ وہ نسوانی لہجے میں بالکل بیگم کے انداز میں ''دریں چہ شک'' کہنا سیکھ گئی۔

سوداگر نے ایک دن مینا کے پنجرے کو پالکی میں رکھوا دیا اور اس کے اوپر بہترین کپڑے کا پردہ ڈال دیا۔ اس نے پالکی برداروں کو بلایا اور ان کے ذریعہ بازار میں بڑے دوکانداروں کے یہاں پالکی کو لے گیا۔ وہ دوکاندار سے خریدنے کے لیے مال مانگتا۔ جب دوکاندار مال دیتا تو وہ دکھانے کے بہانے مال کو پالکی کے اندر کر دیتا اور قیمت بتا کر کہتا:

''بیگم کیسے مال پسند آیا؟''

پالکی کے اندر سے آواز آتی ''دریں چہ شک''۔

سوداگر پھر کہتا:

''مال کی قیمت کل صبح ہوتے ہی ادا کر دیں گے۔''

پردہ کے اندر سے پھر آواز آتی:

''دریں چہ شک''۔

دوکاندار بڑا آدمی سمجھ کر صبح کے وعدے پر مال ادھار دے دیتا۔ غرض گھر آکر سوداگر نے پالکی زنانہ مکان میں اتروادی۔ مال کو مکان کے اندر بھجوا دیا۔ دوسرے دروازے پر بار برداری تیار تھی۔ جلدی جلدی تمام مال کو لدوا دیا اور وہاں سے رات ہی کو دونوں میاں بیوی مال لے کر چمپت ہو گئے۔ صبح ہوتے ہی تمام دوکاندار مکان کے دروازے پر آوازیں دینے لگے مگر جواب ندارد۔ آخر وہ لوگ مکان میں داخل ہوئے تو دیکھا خالی وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہکا بکا سے رہ گئے، برآمدہ میں مینا کا پنجرا لٹک رہا تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر لوگوں نے آپس میں کہنا شروع کیا۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ مینا فوراً نسوانی آواز میں بولی:

''دریں چہ شک؟''

اب تمام دوکاندار سمجھ گئے کہ پالکی کے اندر سے ''دریں چہ شک'' کی جو آواز آ رہی تھی وہ کسی عورت کی نہیں بلکہ اسی مینا کی تھی۔ ایک نے کہا:

''سوداگر نے ہم سب کو جُل دے دیا۔''

مینا بولی:

''دریں چہ شک''۔

ایک دوکاندار نے کہا:

''ہم سب لٹ گئے۔''

مینا نے جواب دیا:

''دریں چہ شک۔''

ایک نے کہا:

''زیادہ نفع کی لالچ میں ہم لوگ بہت برے مارے گئے۔''

مینا تڑ سے بولی:

''دریں چہ شک۔''

آخر کار تمام دوکاندار کفِ افسوس ملتے ہوئے واپس چلے گئے۔

دستار اور گفتار اپنی ہی کام آتی ہے

اپنے ہاتھ سے اپنی پگڑی باندھنا چاہئے اور اپنی بات خود ہی کہنا مناسب ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں دربار اکبری کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے:

واقعہ: اکبر اعظم کے دربار کے نورتن، ملا دو پیازہ کی پگڑی کی بندش پر اعتراض کیا کرتے تھے اور اکثر ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ملا دو پیازہ اپنی پگڑی بے پروائی سے سر پر لپیٹ لیا کرتا تھا جب کہ دوسرے درباری آئینہ کے سامنے گھنٹوں بنا سنوار کر اپنی اپنی پگڑیاں باندھا کرتے تھے۔ ایک روز جب نورتن ملا کی بے ترتیب بندھی پگڑی کو دیکھ کر ہنس رہے تھے تو اکبر بادشاہ نے ملا سے پوچھا:

''سب کی پگڑی نہایت سلیقے سے بندھی ہے جب کہ تمہاری پگڑی بے ترتیب ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟''

ملا نے دست بستہ کہا:

''جہاں پناہ! میں اپنی پگڑی خود اپنے ہاتھ سے باندھتا ہوں جب کہ یہ سب اپنی اپنی بیویوں سے پگڑیاں بندھوا کر آتے ہیں۔ اگر آپ کو میری بات کی تصدیق کرنا ہے تو

یہیں دربار میں اسی وقت سب کو حکم دینے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ اپنی اپنی پگڑی کھول کر پھر سے باندھیں۔"

چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا اور سب نے اپنی پگڑیاں کھول کر پھر سے باندھیں۔ سب کی پگڑیاں پہلے کے مقابلے میں بے ترتیب بندھیں۔ ملا دو پیازہ نے بھی اپنی پگڑی کھول کر پھر سے باندھی۔ اس کی پگڑی ویسی ہی بندھی جیسی پہلے بندھی تھی۔ اب ملا کو دوسروں پر ہنسنے اور اپنی بات کی تصدیق کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے بادشاہ سے کہا:

"جہاں پناہ! میں نہ کہتا تھا کہ یہ سب لوگ اپنی اپنی بیویوں سے پگڑیاں بندھوا کر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس وقت ویسی عمدہ پگڑیاں نہیں باندھ سکے جیسی پہلے باندھے تھے۔ میں اپنی پگڑی خود اپنے ہاتھ سے باندھتا ہوں۔ اسی لیے اس کی بندش میں کوئی فرق نہیں پڑا۔"

بات دراصل یہ تھی کہ ملا دو پیازہ کے علاوہ جلدی میں بغیر آئینے کے کوئی ٹھیک سے پگڑی نہیں باندھ سکا تھا اور ملا بغیر آئینے کے پگڑی باندھا کرتا تھا۔

دعوت شیراز اسی کا نام ہے

نہایت بے تکلفی کی دعوت جس سے میزبان کو تکلیف نہ ہو اور نہ زیادہ بار خاطر ہو۔ سادہ اور معمولی غذا جو موقع پر حاضر اور موجود ہو کھلا دینے کی ضیافت۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب شیخ سعدی شیرازی سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے:

واقعہ: شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اپنے کسی دوست کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس نے ان کے کھانے میں نہایت اہتمام و تکلف کیا۔ شیخ سعدی جب کھانے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا: "آہ! دعوت شیراز"

دوسرے وقت میزبان نے اس سے بھی بہتر اور پر تکلف کھانا یہ سوچ کر تیار کرایا کہ شاید کھانے میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ شیراز کی دعوت اس سے بہتر ہوتی ہوگی۔ اسی لیے انہوں نے دعوت شیراز کو یاد کر کے "آہ دعوت شیراز" کہا۔ تیسرے وقت میزبان نے اور بھی بہترین اور پر تکلف کھانے کا اہتمام کیا مگر تیسرے وقت بھی کھانا کھانے کے بعد شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے وہی فقرہ کہا یعنی "آہ! دعوتِ شیراز" شیخ

سعدی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دوست کے یہاں کئی روز مہمان رہے اور رفتہ رفتہ تکلفات کم ہوتے گئے۔ میزبان نے اپنے دل میں سوچا کہ کسی دن چل کر شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دعوت کھا کر دیکھا جائے کہ کیا خاص بات ہے جوان کو یہاں کا کھانا پسند نہ آیا اور دعوت شیراز کو برابر یاد کرتے رہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے دوست ایک روز شیراز پہنچ گئے اور شیخ کے مہمان ہوئے۔ شیخ شیرازی نے مہمان کے ہاتھ دھلا کر جو معمولی کھانا گھر میں پکا تھا سامنے لاکر رکھ دیا۔ مہمان نے کھانا کھایا اور دل میں خیال کیا کہ اس وقت موقع نہ تھا اسی لیے جو سادہ معمولی کھانا گھر میں موجود تھا وہی لاکر سامنے رکھ دیا۔ اب دوسرے وقت وہ بہترین اور پر تکلف کھانا کھلائیں گے جس کو میرے یہاں برابر آہ بھر کر یاد کر رہے تھے۔ مگر دوسرے وقت بھی ویسا ہی معمولی اور سادہ کھانا اس کے سامنے آیا۔ وہ شخص جب تک شیخ کا مہمان رہا ویسا ہی سادہ، بے تکلف اور معمولی کھانا اس کو کھانے کو ملتا رہا۔ آخر کار جب ایک دن مہمان رخصت ہونے لگا تو اس نے شیخ سعدی سے پوچھا:

''یار! تم جب میرے یہاں مہمان تھے تو آہ بھر کر دعوتِ شیراز کو یاد کرتے تھے اور اچھے سے اچھے، بہترین اور پر تکلف کھانے کو بھی ناپسند کیا کرتے تھے۔ آخر بات کیا ہے؟''

شیخ سعدی نے جواب دیا:

''پر تکلف کی مہمانداری دو تین وقت نبھ سکتی ہے زیادہ دن نہیں۔ اس لیے مشہور ہے کہ ایک دن کا مہمان دو دن کا مہمان، تیسرے دن بلائے جان۔ میں اسی لیے آہ بھر کر ''دعوتِ شیراز'' کو یاد کیا کرتا تھا کہ بے تکلف، سادہ اور معمولی کھانا کھلانے میں مہمان کتنے ہی دن رہے، میزبان کی طبیعت پر بار نہیں گزرتا۔ اسی کا نام دعوتِ شیراز ہے۔''

دکھ سکھ ماننے کا ہے

دُکھ اور سکھ کو جتنا ہی مانیں اتنی ہی تکلیف اور خوشی ہوتی ہے۔ اس فقرہ یا کہاوت کو اکثر فقرا کہا کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک دکھ سکھ برابر ہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ دکھ اور ہوس کو نفسیاتی طور پر کم کرنے کے لیے بھی اس فقرے کو کہتے ہیں۔ اس کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک سوداگر تجارت کرنے کی غرض سے بدیش گیا۔ وہاں اس کو پندرہ سال تک رہنا پڑا۔

وہ اپنے پیچھے ایک سال کا بیٹا چھوڑ کر گیا تھا۔ جواب سولہ سال کا جوان ہو چکا تھا۔ وہ جوان اپنے والد سے ملنے کے لیے اسی ملک کو روانہ ہوا جہاں وہ تجارت کرنے کی غرض سے گیا تھا۔ ادھر سوداگر بھی روپیہ پیسہ کما کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اتفاقاً راستے میں دونوں ایک ہی سرائے میں ٹھہرے۔ بیٹا سرائے میں پہلے پہنچا تھا۔ اس نے جاتے ہی اس ایک کمرے کو کرائے پر لے لیا جو خالی تھا۔ باپ بعد میں پہنچا لیکن کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سرائے کے مالک کو زیادہ روپیہ دے کر لڑکے سے کمرہ خالی کرا لیا۔ لڑکا رات بھر باہر سردی میں ٹھٹھرتا رہا اور باپ آرام سے کمرے میں خراٹے بھرتا رہا۔ صبح لڑکے سے بات چیت کرنے پر جب سوداگر کو پتا چلا کہ یہ تو اسی کا بیٹا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ رات میں اسے سرائے کے کمرے سے نکلوا کر سوداگر کو جس قدر خوشی کا احساس ہوا تھا، صبح یہ جان کر کہ یہ اسی کا بیٹا جو رات بھر سردی سے ٹھٹھرتا رہا، نہایت تکلیف ہوئی یعنی جس فعل سے سوداگر کو سکھ کا احساس ہوا وہی اب دکھ کا باعث تھا۔

دلی دُور ہے

دیکھیے: ابھی دلی دور ہے۔

دلی کی کمائی، کماندو کے نالے میں بہائی

باہر کمائی کر کے وہیں خرچ کر دینا۔ خالی ہاتھ گھر واپس آنا۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب کوئی شخص کمانے کی غرض سے باہر جائے اور خالی ہاتھ واپس گھر آئے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب دہلی کے قریب کماندو کا وہ نالا ہے جہاں مسافروں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔

دہلی کے قریب کماندو کا نالا ہے جہاں کسی وقت بڑے بڑے غار تھے۔ ان غاروں میں ڈاکو چھپ کر بیٹھ جاتے تھے۔ دہلی سے کمائی کرنے کے بعد گھر لوٹنے والے جن مسافروں کا اس نالے سے گزر ہوتا تھا۔ ان کا مال و اسباب ڈاکو لوٹ لیا کرتے تھے اور وہ بے چارہ مایوس ہو کر خالی ہاتھ اپنے گھر واپس جاتا تھا۔ گھر اور بستی کے لوگ سمجھتے تھے کہ دہلی سے خوب کمائی کر کے واپس آیا ہے اور ہم لوگوں سے چھپا رہا ہے کہ دوسرے لوگ دہلی جا کر کما کر خوش حال نہ ہو جائیں۔ جب کوئی راز دار اس سے پوچھتا تھا تو اس کو سیدھا سیدھا سچا اور دو ٹوک جواب مل جاتا تھا:

''دہلی کی کمائی، کماندو کے نالے میں بہائی۔''

دلی ہنوز دُور است

دیکھیے: ابھی دلی دور ہے۔

دمڑی کا شوربا اور چوہے کی دم

کھانے پینے کی تھوڑی سی چیز میں بھی خرابی ہونا۔ یہ کہاوت اس موقع پر ظرافت سے بولتے ہیں جب کھانے پینے کی تھوڑی سی چیز میں بھی کوئی کراہت والی چیز نکلے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک افیونی تھا۔ وہ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا ہر کام اوٹ پٹانگ ہوتا تھا۔ اس لیے اس کی بیوی بھی بے ربط زندگی گزارنے کی عادی ہوگئی تھی۔ وہ اکثر پڑوس میں جا کر عورتوں سے باتیں کرنے میں اپنا وقت گزارتی تھی۔ جب جی چاہا کھانا پکا لیا اور افیونی گھر میں آئے تو ان کے سامنے کھانا رکھ دیا اور جب صبح کو افیون کا نشہ اترتا تھا تو وہ میاں افیونی کی خوب گت بناتی تھی۔

ایک دن صبح کو افیونی کی بیوی دیر سے اٹھی۔ اس نے ناشتے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ صبح ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ دونوں کو بھوک لگ رہی تھی۔ افیونی بولا:

''ارے بھاگوان اتنی دیر میں سو کر اٹھی ہے۔ اب کیا دوپہر کو ناشتہ ہوگا۔''

بیوی نے تنک کر آ کر کہا:

''اے ہے، میں آج دیر سے اٹھی ہوں تو کیا ہو گیا۔ کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تم تو پڑے پڑے چارپائی توڑ رہے ہو۔ اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ کٹرے سے شوربا ہی لے آتے۔ روٹی تو ایک آدھ ڈلیا میں رات کی پڑی ہے۔''

افیونی نے بیڑی نکال کر سلگائی اور کھانستے ہوئے بولا:

''اچھا لا پیالہ تو دے دے۔''

بیوی نے چارپائی پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا:

''اجی اپنے آپ دیکھ لو۔ چبوترے پر دھرا ہوگا۔ میں تو اب ناشتہ کر کے ہی اٹھوں گی۔''

افیونی نے بڑبڑا کر اپنی چادر سنبھالی۔ پیالہ ہاتھ میں لیا اور بے فکری کے ساتھ بیڑی کا دھواں

اڑاتے ہوا کٹرے پہنچا۔ اس نے بھٹیارے سے کہا:

''پہلوان! اس پیالے میں دمڑی کا شوربا توڈال دینا۔''

پیالے میں شوربا لے کر وہ گھر پہنچا اور بیوی سے مخاطب ہو کر کہا:

''آج کا سالن بڑے مزے کا ہے تو ہی اسے کھالے۔ میں کارخانے میں جا کر چائے پاپے منگوا کر ناشتہ کرلوں گا۔''

افیونی نے کھونٹی سے اپنا سیاہ چکٹا ہوا کوٹ اتارا کہ اتنے میں بیوی کی بھرائی ہوئی آواز آئی:

''میاں یہ کیا شروا اٹھالائے۔''

افیونی نے کہا:

''کیوں! کیا بات ہے؟ پہلوان فجلو بھٹیارے کے یہاں سے لایا ہوں۔''

بیوی نے کہا: ''اس فجلو کا برا ہو، وہ تباہ ہو جائے۔ اس شروے میں تو چوہے کی دم نکلی ہے۔''

یہ سنتے ہی افیونی کو تاؤ آ گیا۔ وہ لپکتا ہوا بھٹیارے کے پاس پہنچا اور اس نے تیز لہجے میں بولا:

''واہ پہلوان واہ! اچھا شوربا دیا۔ صبح ہی صبح ایمان نگلنے کے لیے بیٹھے ہو۔ تم نے تو دوستی پر بھی لات ماردی۔''

پہلوان نے کہا: ''بادشاہ کیا بات ہے، ابھی تک پنک میں ہو۔''

افیونی غرّا کر بولا:

''میاں پنک کی ایسی تیسی، تمہارے شوربے میں چوہے کی دم نکلی ہے۔ بیوی دیکھتے ہی بھرا گئی۔''

یہ سن کر فضلو بھٹیارے نے افیونی سے کہا:

''بادشاہ اپنی بیوی سے جا کر کہو۔ دمڑی کے شوربے میں چوہے کی دم نہیں تو کیا ہاتھی کی دم نکلے گی۔ ویسے تم اپنے پرانے یار ہو، ایک پیالہ شوربا اور لے جاؤ۔''

دن آئے اچھے بن میں پائے بھونے مور، چوروں نے لڈو کھائے، گھر میں بھینس بیائی گھوڑ

دن اچھے آنے پر تمام کام خود بخود بن جاتے ہیں اور یکا یک فائدہ ہونے لگتا ہے۔ یہ کہاوت اس

وقت کہی جاتی ہے جب توقع کے خلاف کسی کو فائدہ ملے یا خود بخود کام بنتے چلے جائیں۔اس کہاوت کے تعلق سے ایک کہانی بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں ایک غریب شخص رہتا تھا۔ بیکاری اور بے روزگاری کے سبب اس کے بیوی بچے بھوکوں مرنے لگے۔ایک روز اس کی بیوی نے کہا:

''کب تک یوں ہی گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے۔ کچھ روزی روٹی کی فکر کرو۔''

بے کاری سے تنگ ہو کر اور بیوی کے کہنے پر اس نے باہر جا کر کمائی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ گھر سے جاتے وقت راستے میں کھانے کے لیے بیوی نے کچھ لڈو بنا کر ایک کپڑے میں باندھ دیئے۔لڈو بنانے کے لیے جس اوکھلی میں وہ رات کے اندھیرے میں اناج کوٹ رہی تھی اس میں ایک زہریلا سانپ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی اس میں کٹ کر مل گیا۔اس طرح کٹا ہوا اناج زہریلا ہو گیا۔اس نے اسی اناج کے لڈو بنا کر شوہر کو دے دیئے جو زہریلے تھے۔ جاتے وقت اس کا گزر ایک جنگل سے ہوا جہاں کچھ دیر پہلے آگ لگ چکی تھی۔ جنگل کی اس آگ میں ایک مور بھی جل کر بھن گیا تھا۔اس نے اس بھنے ہوئے مور کو نہایت رغبت سے کھایا اور آرام کرنے کے لیے ایک پیڑ کی چھایا میں لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہاں ڈاکوؤں کا ایک گروآیا جس نے اسے لوٹ لیا اور سارے لڈو مزے لے لے کر کھا گئے۔لڈو کھاتے ہی تمام ڈاکو مر گئے۔اس شخص نے ڈاکوؤں کا تمام مال اپنے قبضے میں کر لیا۔ڈاکوؤں کی لوٹ کا بیش قیمت مال لے کر جب وہ خوشی خوشی اپنے گھر واپس آیا تو اس کے سامنے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا کہ اس کی بھینس کے گھوڑی پیدا ہوئی۔اب تو اس کی خوشی کا اور بھی ٹھکانہ نہ رہا کہ بھینس کے گھوڑی دینے سے اسے گھوڑی تو ملی ہی ملی کھانے پینے کے لیے دودھ بھی میسر ہو گیا۔اب کیا تھا وہ اور اس کی بیوی بچے شان سے زندگی گزارنے لگے۔

دُنیا کو کسی طرح چین نہیں /

ہر حالت میں کسی میں عیب نکالنا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب لوگ کسی شخص میں بے وجہ عیوب اور خامیوں کو نکالیں خواہ وہ شخص کتنا ہی اچھا کام کرے۔اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک مشہور اور دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک بار ایک بوڑھا شخص اور اس کا بیٹا کہیں جا رہے تھے۔ وہ دونوں اپنے ٹٹو پر بیٹھے تھے۔ راستے میں انہیں کچھ لوگ ملے اور ان سے کہنے لگے:

''تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ تم دونوں اس کمزور ٹٹو پر سوار کب سے سفر کر رہے ہو۔ تم مسٹنڈوں نے بے چارے ٹٹو کا کیا حال بنا رکھا ہے۔''

یہ سن کر لڑکا ٹٹو سے اتر گیا اور پیدل چلنے لگا۔ بوڑھا باپ ٹٹو پر بیٹھا رہا۔ کچھ دور چلنے کے بعد راہ چلنے والوں نے آپس میں طنز بھرے لہجے میں دونوں کو سنا کر کہا:

''دیکھو اس بڈھے کی بے شرمی، بیٹا بے چارہ پیدل چل رہا ہے اور بڈھا کھوسٹ کس ٹھاٹھ سے ٹٹو پر بیٹھا ہوا سفر کر رہا ہے۔ اس نے کچھ تو بیٹے کا خیال کیا ہوتا۔''

یہ سن کر بوڑھا ٹٹو پر سے اتر گیا اور اس نے لڑکے کو ٹٹو پر سوار کر دیا اور خود ٹٹو کی رسی پکڑ کر چلنے لگا۔ کچھ اور آگے چلنے پر ایک آدمی نے انہیں پھر ٹوک دیا: ''کیا کلجگ ہے، بوڑھا باپ پیدل چل رہا ہے اور سپوت اکڑ کر ٹٹو پر بیٹھا سفر کر رہا ہے۔''

یہ سن کر بیٹا بھی ٹٹو سے اتر پڑا۔ اب دونوں پیدل چلنے لگے مگر لوگوں کو پھر بھی چین نہیں آیا۔ کچھ دور جانے کے بعد جب کچھ راہ گیر انہیں ملے اور ہنسی اڑانے کے انداز میں کہنے لگے:

''ایسے احمق تو کسی نے دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ اچھا خاصا ٹٹو ساتھ ہے اور دونوں کے دونوں پیدل چل رہے ہیں۔''

یہ سن کر دونوں پریشان ہوئے اور دونوں نے تنگ آ کر ٹٹو کو زمین پر لٹا دیا اور انہوں نے مل کر ٹٹو کے چاروں پیر رسی سے باندھ دیئے۔ اس کے بعد پیروں کے بیچ میں لاٹھی ڈال کر ٹٹو کو الٹا لٹکا لیا اور لاٹھی کے ایک سرے کو اپنے کاندھوں پر رکھ کر چل پڑے۔ اب کیا تھا دیکھنے والوں نے ان کا تماشا بنا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بھیڑ لگ گئی۔ لوگ تالیاں بجا بجا کر ان کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ لوگ ہنسی کے انداز میں کہتے تھے:

''ان سے بڑے احمق اور اوندھی کھوپڑی کے لوگ کہاں ملیں گے جو زندہ ٹٹو کے پیر باندھ کر اور الٹا لٹکا کر اپنے کندھوں پر لیے جا رہے ہیں۔ بے وقوف ہیں بے وقوف۔ ان دونوں کو تو ٹٹو پر سوا ہو کر سفر کرنا چاہئے تھا۔''

اپنا مذاق اڑتے دیکھ کر ان دونوں باپ بیٹوں نے سوچا کہ تمام پریشانیوں کا سبب یہ ٹٹو ہی ہے۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ان لوگوں نے ٹٹو کو ایک ندی میں دھکیل دیا اور اپنے راستے چل دیئے۔

دو ہی دفعہ صحیح

اچھا ایسا ہی صحیح، نہایت مجبور اور لاچار شخص کے لیے بولتے ہیں۔ جب کوئی ہوشیار اور مطلبی شخص اپنی مطلوبہ چیز حاصل کرنے میں ناکام رہے اور مجبوراً اپنا ارادہ بدل لے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے:

دیکھیے: میں نے تین دفعہ کھایا ہے۔

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی

پورا پورا انصاف۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب منصف یا کوئی شخص ایسا کھرا انصاف کرے جس پر ذرا بھی شک کا گمان نہ ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب معمولی فرق کے ساتھ دو دلچسپ حکایتیں بیان کی جاتی ہیں، جن میں سے پہلی حکایت اس طرح ہے:

حکایت ۱: ایک حلوائی دودھ میں بہت پانی ملایا کرتا تھا۔ ایک روز ایک بندر اسی حلوائی کی دوکان سے روپیوں پیسوں سے بھرا ہوا گھڑا اٹھا کر لے گیا اور ساحل دریا پر کھڑے ایک درخت کے اوپر جا بیٹھا۔ حلوائی بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ اس نے بندر کو بہت بہلایا پھسلایا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ دینے کے لیے بندر کو مٹھائیاں بھی دکھائیں مگر وہ نہ مانا۔ بندر نے پیڑ کے اوپر سے روپے اور اٹھیاں وغیرہ تو دریا میں پھینکنا شروع کر دیں اور پیسے حلوائی کی طرف یہ دیکھ دیکھ کر حلوائی کی جان سوکھ رہی تھی۔ آخر میں اس نے تھک ہار کر اور جل بھن کر کہا:

''ارے ظالم کیا غضب کر رہا ہے۔ پیسے میرے طرف پھینک رہا ہے اور اور روپے، اٹھنیاں اور چونیاں دریا میں ڈال رہا ہے۔''

تماشائیوں میں سے ایک شخص نے حلوائی سے کہا:

''بندر ٹھیک ہی کر رہا ہے۔ دودھ کے دام تو تیرے پاس پھینک رہا ہے اور پانی کے دام پانی میں ملا رہا ہے۔ یہ ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔''

حکایت ۲: کوئی گوالا اپنے گاؤں سے دودھ لے کر روزانہ ایک قریبی شہر میں جایا کرتا تھا۔ کسی کو پتا نہ چلے اس لیے راستے میں پڑنے والے ایک تالاب سے وہ دودھ میں پانی ملایا کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے پاس اچھی خاصی دولت جمع ہو گئی۔ ایک روز اس نے سوچا کہ اس دولت سے کچھ سونا وغیرہ خرید کر

رکھ لیا جائے تو اچھا ہو۔ ایک دن وہ اپنی کمائی ہوئی تمام دولت لے کر سونا وغیرہ خریدنے کے لیے شہر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسی تالاب کے کنارے اس نے بیٹھ کر سوچا کہ یہاں تنہائی میں بیٹھ کر روٹی کھالوں۔ شہر میں کہیں مناسب جگہ نہیں ملے گی اور نہ ہی وہاں کھانا کھانے کے لیے وقت مل سکے گا۔ یہ سوچ کر اس نے تالاب کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور روٹی کھانے لگا۔ اتنے میں پاس کے ایک درخت سے بندر اترا اور روپیوں کی تھیلی لے کر تیزی کے ساتھ اسی پیڑ پر چڑھ گیا۔ گوالے نے دیکھا تو بہت گھبرایا اور بندر کو روٹی دکھا کر پھسلانے کی کوشش کرنے لگا مگر بندر نے اس کی ایک نہ سنی۔ بندر نے بڑے ٹھاٹھ سے روپیوں کی تھیلی کھولی اور ایک ایک روپیہ تالاب کے اندر پھینکنے لگا۔ اتنے میں کچھ راہ گیر بھی وہاں آ گئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی گوالے کے ساتھ مل کر بندر سے تھیلی لینے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ اب تک بندر نے آدھے سے زیادہ روپے تالاب کے پانی میں پھینک دیئے تھے اور پیڑ پر بیٹھے بیٹھے ٹھاٹھ سے گوالے کا منہ دیکھ رہا تھا۔ گوالا بندر کے سامنے ہاتھ جوڑے، گوگڑا رہا تھا۔ آخر میں کچھ روپیوں کو چھوڑ کر سارے روپے اس نے تالاب میں پھینک دیئے تھے۔ اب تھیلی میں کچھ روپے ہی بچے تھے جس کو بندر نے گوالے کی طرف اچھال دی۔ گوالا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا:

''سارے روپے تو ظالم نے تالاب میں پھینک دیئے۔ اب اتنے تھوڑے روپیوں کو کیا کروں گا۔''

راہ گیروں میں سے ایک نے گوالے سے کہا:

''اس میں افسوس کرنے کی کیا بات ہے۔ بندر نے قدرت کی طرف سے انصاف کیا ہے۔ اس نے پانی کے دام پانی میں پھینک دیئے ہیں اور دودھ کے دام تیری طرف اچھال دیئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔''

دولت اندھی ہوتی ہے

دولت مند غریبوں کے دکھ کو نہیں سمجھتے۔ مالدار آدمی اچھائی برائی کا دھیان نہیں رکھتے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی مالدار شخص دولت کے بل پر نازیبا حرکت کرے یا کسی کے ساتھ زیادتی سے پیش آئے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔ جو اس طرح ہے:

واقعہ: بادشاہ تیمور لنگ جس وقت دلی آیا تو اس کی خدمت میں ایک اندھا شخص حاضر ہوا جس کا

نام دولت تھا۔ بادشاہ نے ازراہ مذاق اس سے کہا:

''کیا دولت بھی اندھی ہوتی ہے۔''

اندھے نے حاضر جوابی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا:

''جہاں پناہ! اگر دولت اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے پاس کیوں آتی؟''

بادشاہ اس حاضر جوابی سے بہت خوش ہوا۔ تیمور دراصل لنگڑا تھا۔ اسی لیے وہ تیمور لنگ کے نام سے مشہور ہوا۔

دیدم و لے نہ گویم

بغیر سوچے سمجھے غیر ملکی زبان کا استعمال کرنا۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر کہی جاتی ہے جب کوئی شخص بدیشی بھاشا نہ جانتے ہوئے بھی اس کا غلط استعمال کرے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک نادان شخص نے کسی استاد سے فارسی پڑھنا شروع کی۔ استاد نے اس کو سکھایا ''دیدم و لے نہ گویم'' یعنی دیکھ رہا ہوں مگر کہوں گا نہیں۔ مگر وہ شخص سمجھا کہ اس کا مطلب ہوتا ہے ''میں نہیں جانتا۔''

ایک روز کسی مغل کا ایک اونٹ کھو گیا۔ وہ اسے ہر چہار طرف ڈھونڈتا پھرا مگر اونٹ کا کہیں پتا نہیں چلا۔ تھک ہار کر وہ ایک درخت کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک اس راستے سے وہی نادان گزرا۔ مغل نے اس سے پوچھا کہ میرا اونٹ کھو گیا ہے۔ تم نے تو اسے کہیں نہیں دیکھا ہے۔ نادان نے جواب دیا:

''دیدم و لے نہ گویم۔''

اس پر مغل نے اس سے التجا کی کہ بھائی بتا دو۔ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا مگر احمق نے پھر وہی جواب دیا یعنی ''دیدم و لے نہ گویم''۔ مغل نے بار بار اس سے منت و گزارش کی مگر ہر بار اس نے وہی جواب دیا۔ آخر تنگ آکر اس نے اس نادان کی پٹائی شروع کر دی۔ لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ جب لوگوں نے مارنے پیٹنے کی وجہ دریافت کی تو مغل نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

''میرا اونٹ کھو گیا ہے۔ اسے پتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور یہ بار بار کہتا ہے بتاؤں گا نہیں۔''

لوگوں نے اس سے پوچھا:

''جب تمہیں معلوم ہے کہ اونٹ کہاں ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے تو اس نے جواب دیا۔''

''میں بتاؤں تب، جب مجھے پتا ہو۔''

اس پر اس سے پوچھا گیا کہ پھر تو ''دیدم و لے نہ گویم'' کیوں کہتا تھا؟ تو اس نے کہا:

''میں سمجھتا تھا کہ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ''میں نہیں جانتا''۔

دیکشا لینا آسان سے، سیدھا دینا مشکل ہے

مُرید ہونا یا تعلیم حاصل کرنا تو آسان مگر نذرانہ پیش کرنا مشکل ہے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب اصل کام تو آسانی سے ہو جائے مگر اس سے متعلقہ کاموں میں دقت کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کسی اہیر کو بھگتی کرنے کی دھن سوار ہوئی۔ وہ ایک پنڈت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے پنڈت جی سے کہا کہ مجھے دیکشا یعنی تعلیم دیں اور مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔ پنڈت جی نے اس سے کہا:

''ٹھیک ہے اگر تمہیں دیکشا یا منتر حاصل کرنے کا شوق ہے تو جیسا میں کہوں تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا۔ تبھی دیکشا لینا سودمند ہوگا ورنہ بیکار ہے۔ اگر تمہیں اپنے من کی کرنا ہے تو جاؤ اور اپنے من کی کرو۔''

اہیر نے کہا:

''مہاراج! آپ جو کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔ اس پر پنڈت جی نے اس سے کہا:

''کل آنا تم کو دیکشا دی جائے گی۔''

دوسرے دن اہیر پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پنڈت جی نے اس سے کہا:

''دیکھیے جیسا میں کہوں اور کروں ویسا ہی کرنا۔''

اہیر نے کہا:

''بہتر ہے۔''

پنڈت جی نے آمنے سامنے دو آسن بچھوائے۔ ایک پر خود بیٹھ گئے اور دوسرے آسن کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہنے لگے:

''بیٹھ سامنے۔''

اہیر نے پلٹ کر پنڈت جی سے کہا:

''بیٹھ سامنے۔''

پنڈت جی نے کہا:

''نرا احمق ہے بیٹھتا کیوں نہیں؟''

اہیر نے بھی پنڈت جی کی نقل کرتے ہوئے کہا:

''نرا احمق ہے بیٹھتا کیوں نہیں؟''

اب پنڈت جی کو غصہ آ گیا اور انہوں نے طیش میں آکر اہیر کے گال پر ایک چانٹا جڑ دیا اور کہا:

''ابے الو کے پٹھے میں تجھ سے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا ہوں اور تو بک بک کیے جا رہا ہے۔''

اس پر اہیر نے بھی پنڈت جی کے گال پر ایک ہاتھ جما دیا اور کہا:

''ابے الو کے پٹھے میں تجھ سے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا ہوں اور تو بک بک کیے جا رہا ہے۔''

اب کیا تھا پنڈت جی نہایت غیض وغضب میں آ گئے انہوں نے دونوں ہاتھ سے اہیر کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اہیر پہلے تو دیکھتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ پنڈت جی تھمیں تو وہ بھی پیٹنا شروع کرے مگر جب اسے محسوس ہوا کہ پنڈت جی اس طرح ماننے والے نہیں ہیں تو اس نے بھی پنڈت جی کو دُھننا شروع کر دیا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو بے تحاشہ پیٹتے جا رہے تھے۔ چوں کہ اہیر پنڈت جی سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اس لیے تھوڑی ہی دیر میں اس نے پنڈت جی کو دبوچ لیا اور ان کی خوب مرمت کی۔ پنڈت جی بہ مشکل تمام اپنی جان بچا کر بھاگے۔ انہوں نے گھر آ کر ہی دم لیا۔ گھر میں پنڈتائین بڑی بے صبری سے پنڈت جی کی راہ دیکھ رہی تھی کیوں کہ آج موٹا شاگرد پھنسا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس سے خوب مال ملے گا مگر پنڈت جی کی حالت زار دیکھ کر پنڈتائین کے ہوش اڑ گئے۔ کچھ دیر کے بعد جب پنڈت جی کے حواس درست ہوئے اور وہ بولنے کے لائق ہوئے تو انہوں نے پنڈتائین کو پورا قصہ سنایا۔ ادھر جب اہیر کا پسینہ سوکھا تو اسے یاد آیا کہ دیکشا تو لے لی مگر پنڈت جی کو سیدھا (نذرانہ، جس میں اناج اور کپڑے وغیرہ ہوتے ہیں) تو ابھی تک دیا ہی نہیں۔ وہ سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا:

''سیدھا لے کر پنڈت جی کے گھر چلی جاؤ۔''

سیدھا لے کر اہیرن جوں ہی پنڈت جی کے دروازے پر پہنچی تو پنڈتائین نے اپنے شوہر کی پٹائی کا بدلا لینے کی دل میں ٹھان لی۔ اس نے اہیرن کو اپنے گھر میں بند کر کے خوب پٹائی کی۔ پٹائی کرتے کرتے اس کو ادھ مرا کر دیا۔ کسی طرح اہیرن اپنی جان بچا کر بھاگی اور اس نے گھر آ کر اپنے شوہر سے کہا:

''دیکشا لینا تو آسان ہے سیدھا دینا مشکل ہے۔''

دیکھ تریا کے چالے، سر منڈا منہ کالے
دیکھ مردوں کی پھیری، ماں تیری کہ میری

اپنی ضد کو پورا کرنے کے لیے اپنا ہی نقصان کرنا یا اپنی ہی بے عزتی کرانا۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر بھی طنزاً کہی جاتی ہے جب کسی عیار کو اسی کی چال سے شکست کر دیا جائے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کسی میاں بیوی کے درمیان اس بات کو لے کر بحث چھڑ گئی کہ عورت اور مرد میں زیادہ ہوشیار اور عقل مند کون ہوتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جنس کی طرف داری کر رہے تھے۔ بیوی کہہ رہی تھی کہ عورتیں مردوں سے زیادہ عقل مند ہوتی ہیں اور شوہر دلائل کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ مردوں کی عقل مندی اور ہوشیاری کو عورتیں کبھی نہیں پا سکتیں۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد بھی دونوں اپنی اپنی ضد پر اڑے رہے اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ کچھ دنوں کے بعد عورت بیماری کا بہانہ بنا کر چارپائی پر لیٹ رہی۔ تمام علاج و معالجہ کے بعد بھی وہ ٹھیک نہیں ہوئی۔ ٹھیک تو تب ہوتی جب اسے کوئی بیماری ہوتی۔ شوہر دوادارو لا لا کر پریشان ہو گیا مگر عورت جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ عورت نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کا شوہر اب بہت پریشان ہو گیا ہے تو اس نے ایک چال چلی۔ صبح ہوتے ہی اس نے اپنے شوہر سے کہا:

''میں نے آج رات ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ ایک بزرگ مجھ سے خواب میں فرما رہے تھے کہ اگر تیری ساس اپنا سر منڈا کر اور گدھے پر سوار ہو کر اپنا منہ کالا کر کے میرے سامنے آئے تو مجھے اس موذی بیماری سے نجات حاصل ہو جائے گی۔''

یہ سنتے ہی شوہر کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کی بیوی بیمار نہیں ہے بلکہ اسے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہی

ہے۔اس نے بیوی سے کہا:

''ٹھیک ہے، میں کل اپنی ماں کا سر منڈوا کر، منہ کالا کروا کر اور گدھے پر بٹھا کر تیرے سامنے لے آؤں گا تم کوئی فکر نہ کرو۔''

بیوی بہت خوش ہوگئی۔ دوسرے دن وہ اپنی ماں کے پاس جانے کے بجائے اپنی سسرال جا پہنچا۔ داماد کو اچانک آیا دیکھ کر ساس فکر مند ہوگئی اور گھبرا کر خیریت پوچھنے لگی۔ داماد نے افسردہ ہو کر کہا:

''تمہاری بیٹی بستر مرگ پر پڑی ہے۔ کوئی دوا دارو اب تک کارگر نہیں ہوئی۔ مجھ سے ایک ہوشیار نے کہا ہے کہ اس کے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ اپنا سر منڈوا کر، منہ کالا کر کے گدھے پر سوار ہو کر اس کے سامنے جائیں۔''

ماں کو اپنی بیٹی بہت پیاری ہوتی ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ماں نے اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے فوراً فیصلہ کر لیا اور داماد کے کہنے کے مطابق اپنا سر منڈوایا، منہ کالا کیا اور گدھے پر سوار ہو کر چل پڑی۔ گھر پہنچ کر وہ بیوی کے سامنے جا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے منہ کالا کیے، سر منڈائے گدھے پر اس کی ساس بیٹھی تھی۔ بیوی نے جب اسے دیکھا تو اپنی ساس سمجھ کر اور خوش ہو کر کہا:

''دیکھ تریا کے چالے، سر منڈا منہ کالے۔''

اس کے جواب میں شوہر نے کہا:

''دیکھ مردوں کی پھیری، ماں تیری کہ میری۔''

یہ سنتے ہی شرم سے پانی پانی ہوگئی اور آخر کار اپنی شکست قبول کر لی۔

دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

نہیں معلوم کیا انجام ہو؟ خدا جانے تقدیر کیا دکھائے؟ معاملہ کیا صورت اختیار کرتا ہے؟ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب کئی حکایتیں ہیں جو معمولی فرق کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی حکایت اس طرح ہے:

حکایت ۱: ایک مرتبہ ایک کمہار اور ایک گھسیارے نے ساجھے میں ایک اونٹ خریدا۔ گھسیارے نے اونٹ کی پیٹھ کے ایک طرف گھاس لادی اور کمہار نے دوسری جانب اپنے مٹی کے برتن لادے۔ وہ دونوں اونٹ کے ساتھ اپنا اپنا مال فروخت کرنے کے لیے شہر کے بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اونٹ گردن اٹھا اٹھا کر گھسیارے کی گھاس کھاتا جا رہا تھا۔ اونٹ کو گھاس کھاتا دیکھ کر کمہار ہنسنے لگا۔ گھسیارے نے

سوچا ''عجیب آدمی ہے؟ میرے نقصان پر ہنس رہا ہے۔''

اس نے کمہار سے کہا:

''کاہے ہنسے کمہار کے پوت، کونے کروٹ بیٹھے اونٹ۔''

''یعنی اے کمہارے کے بیٹے تو میرے نقصان پر ہنس رہا ہے، دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔''

آخر کار جس وقت وہ دونوں اونٹ کے ساتھ شہر کے بازار پہنچے تو اونٹ اسی کروٹ بیٹھ گیا جس طرف کمہار کے برتن لدے تھے۔ بہت سارے برتن چور چور ہو گئے۔

حکایت۲: ایک قصبے سے ایک کسان اور ایک منہار اپنے اپنے اونٹ پر مال لے کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کسان نے اپنے اونٹ کی پیٹھ پر چارہ لاد رکھا تھا اور منہار نے کانچ کی چوڑیاں۔ دونوں اونٹ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کسان نے منہار سے کہا:

''تم اپنے اونٹ کو آگے کرلو۔''

منہار نے جواب دیا:

''عجیب آدمی ہو۔ تم اپنے اونٹ کو آگے رکھو۔ میرا اونٹ تمہارے اونٹ کے سہارے سے آگے بڑھتا رہے گا۔ کیونکہ تمہارے اونٹ پر چارہ لدا ہوا ہے۔ اگر میرا اونٹ آگے چلے گا تو پیچھے مڑ مڑ کر تمہارے اونٹ کی پیٹھ پر لدے چارے کی طرف دیکھتا رہے گا۔ جس سے اس کی چال کم ہو جائے گی۔ پیچھے ہونے کی وجہ سے تمہارے اونٹ کی رفتار پر بھی اثر پڑے گا۔ اس کے علاوہ میرے اونٹ کے آگے چلنے میں بھی خطرہ ہے۔ کہیں اونٹ بدک گیا تو کانچ کی چوڑیاں ہیں۔ نازک اتنی ہوتی ہیں کہ سب کی سب چکنا چور ہو جائیں گی اور میری رقم ڈوب جائے گی۔ تمہیں کاہے کا ڈر، تمہارے اونٹ پر تو چارہ لدا ہے، نہ ٹوٹنے کا ڈر نہ پھوٹنے کا۔''

کسان خاموش ہو گیا اور اس نے اپنے اونٹ کو چپ چاپ آگے کرلیا۔ منہار کے اونٹ نے کسان کے اونٹ پر لدے چارے کو منہ مار مار کر کھانا شروع کر دیا۔ کسان اور منہار سفر بھر ملہاریں گاتے رہے۔ منہار دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ مفت کے چارے میں اس کے اونٹ کا پیٹ بھر جائے گا۔ کسان نے بھی تاڑ لیا تھا کہ منہار کا اونٹ، اس کے اونٹ پر لدے ہوئے چارے میں منہ مارتا چل رہا

ہے۔ اس نے راستے میں کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا۔ صبر وضبط سے کام لیا مگر تھوڑی دیر کے بعد یہ ضرور کہتا رہا:

''دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟''

منہار کی سمجھ میں اس جملے کا مطلب کچھ نہ آیا۔ وہ سمجھا کہ کسان یوں ہی بڑبڑا رہا ہے۔ آخر کار دھیرے دھیرے وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ منہار کے اونٹ کا پیٹ بھر چکا تھا۔ وہ منزل پر پہنچتے ہی ایک کروٹ سے بیٹھ گیا۔ منہار کی بہت سی چوڑیاں چکنا چور ہو گئیں۔ کسان یہ دیکھتے ہی خوش ہو گیا اور فتح مندی سے مسکرایا۔ اب منہار کی سمجھ میں آیا کہ کسان کے لیے بار بار کہہ رہا تھا کہ ''دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟''

تیسری حکایت معمولی فرق کے ساتھ اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۳: ایک کنجڑے اور ایک کمہار نے شرکت میں ایک اونٹ کرایے پر لیا۔ کنجڑے اور کمہار کو اپنا اپنا مال بیچنے کے لیے اونٹ پر لاد کر قصبے کی بازار میں فروخت کرنے کے لیے لے جانا تھا۔ کنجڑے نے اونٹ کی پیٹھ کے ایک طرف ترکاری اور کمہار نے دوسری جانب مٹی کے برتن لادے۔ راستے میں اونٹ اپنی گردن اٹھا اٹھا کر کنجڑے کی ترکاری کھاتا جاتا تھا۔ کمہار اسے دیکھ دیکھ کر بہت خوش تھا۔ جب منزل پر پہنچے تو اونٹ والے نے جیسے ہی اونٹ کو بٹھایا تو وہ اس کروٹ بیٹھ گیا جدھر کمہار کے برتن لدے تھے۔ ان میں سے بہت سے برتن دبنے سے ٹوٹ گئے۔ جب کنجڑے اور کمہار نے اپنے اپنے نقصان کا مقابلہ کیا تو زیادہ نقصان کمہار کا ہوا۔ اس وقت کنجڑے نے کمہار سے طنزاً کہا:

''بھائی افسوس کیوں کرتے ہو۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ آئندہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟''

چوتھی حکایت کے لیے دیکھیے: تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔

دیکھیے اونٹ کس کل بیٹھے؟

دیکھیے: دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

دینے کہا گھوڑا، اب دیتے ہیں، اب دیتے ہیں

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی شخص کو کوئی چیز دینے کے لیے کہہ کر بار بار ٹالا جائے۔

اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی بادشاہ کے دربار میں کوئی شاعر اپنے شعر پڑھ رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی شعری تخلیق سے خوش ہو کر انعام میں ایک گھوڑا دینے کا اعلان کیا۔ کچھ روز انتظار کرنے کے بعد جب شاعر نے بادشاہ کے وعدہ کو یاد دلایا تو بادشاہ نے کہا:

''اب دیتے ہیں''

پھر دن گزرنے کے بعد جب شاعر نے بادشاہ کے حضور عرض کیا تو بادشاہ نے پھر فرمایا:

''اب دیتے ہیں۔''

غرض جب بھی شاعر بادشاہ کو اس کا وعدہ یاد دلاتا۔ بادشاہ وہی جملہ کہہ کر شاعر کو ٹال دیتا۔ بہت دن گزر جانے پر بھی جب شاعر کو گھوڑا نہیں ملا اور وہ عاجز ہو گیا تو اس نے یہ کہاوت کہی:

''دینے کہا گھوڑا، اب دیتے ہیں، اب دیتے ہیں، اب دیتے ہیں۔''

گھڑ کر بادشاہ کو سنائی جس کو سن کر بادشاہ نادم ہو گیا اور اس نے شاعر کو انعام میں ایک کے بجائے دو گھوڑے عطا کیے

دیکھے بھالے کا سودا نہیں

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کی بات پر یقین نہ کرے اور جب اسے کسی ذریعہ سے پتا چل جائے کہ اس بات کے ماننے میں یا اس چیز کے حاصل کرنے میں اسی کا فائدہ ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ ہارون رشید اپنے کچھ مشیروں اور مصاحبوں کے ساتھ شہر کے دورے پر نکلا۔ شہر کے باہر حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ مجذوبیت کی حالت میں سڑک کے کنکر پتھر چن چن کر گھروندا سا بنا رہے تھے۔ ہارون رشید ان کے اس فعل کو دیکھ کر وہاں کھڑا ہو گیا۔ سلام کرنے کے بعد اس نے حضرت بہلول دانا سے پوچھا:

''یا شیخ یہ کیا بنا رہے ہو؟''

بہلول دانا نے جواب دیا:

''جنت میں رہنے کے لیے گھر بنا رہا ہوں، کوڑیوں کے مول ہیں۔ بولو خریدو گے؟''

ہارون رشید نے اپنے مشیروں اور مصاحبوں کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا:

''حضور یہ جنونی حرکت ہے۔ آپ یہاں بیکار اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔''

اپنے مشیروں کی بات مان کر ہارون رشید جوں ہی آگے بڑھا حضرت بہلول دانا نے اس سے کہا:

''ہارون رشید! یہ جنت کا مکان ہے۔ کوڑیوں کے مول ہے بلکہ مفت ہے اسے خرید لو، بعد میں پچھتاؤ گے۔ پھر آؤ گے تو کسی بھی قیمت میں اسے نہیں پاؤ گے۔''

ہارون رشید اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اسی رات ہارون رشید کو خواب میں نظر آیا کہ وہ کسی طرح جنت میں داخل ہو گیا ہے۔ وہاں وہ ادھر اُدھر گھوم رہا ہے مگر جنت میں رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں مل رہا ہے۔ کافی تگ ودو کے بعد وہ ایک مقام پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر سامنے ایک عالیشان محل پر پڑی جس کی چوٹی پر لکھا ہوا تھا ''قصر بہلول دانا''۔ اس محل کا نقشہ بھی اسی طرح کا تھا جیسا بہلول دانا نے کنکروں اور پتھروں سے زمین پر بنایا تھا۔ اس کے بعد ہارون رشید کی آنکھ کھل گئی۔ باقی ساری رات وہ بے چین رہا۔ صبح ہوتے ہی اپنے مشیروں کے ساتھ وہ بہلول دانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نہایت ادب و احترام سے سلام کرنے کے بعد ان سے مکان خریدنے کی گزارش کی تو بہلول دانا نے فرمایا:

''یہ دیکھے بھالے کا سودا نہیں۔''

ہارون رشید نے کہا:

''حضرت اسے خریدنے کے لیے میں اپنی سلطنت آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

مگر بہلول دانا کسی بھی قیمت پر راضی نہیں ہوئے۔

دھان بچارے بھلے، کوٹا، کھایا، چلے

دھان بہت اچھی چیز ہے، کوٹا کھایا اور چل دیئے۔ یہ دراصل ایک طنز ہے جو کسی کام کے مشکل ہونے پر کہا جاتا ہے۔ دھان کوٹ کر چاول نکالنا اور چاول سے بھات بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ اسی لیے جب کسی مشکل کام کو کوئی شخص آسان کہے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی سرائے میں دو مسافر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں آپس میں دوستی ہو گئی۔ ایک

مسافر کے پاس کھانے کے لیے تھوڑے سے ستو تھے اور دوسرے کے پاس دھان۔ جب آپس میں کھانے پینے کی بات چلی تو ستو والے مسافر نے کہا:

''میرے پاس تو ستو ہیں۔ میں انہیں کھا کر اگلی منزل کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔''

دھان والے مسافر نے کہا:

''تمہیں بہت دیر لگے گی۔ میرے پاس دھان ہیں۔ کوٹ پھٹک کر فوراً کھا لوں گا اور یہاں سے چل پڑوں گا۔ تمہیں یہاں سے روانہ ہونے کی مجھ سے زیادہ جلدی ہے۔ تم ستو کو کس طرح جلدی کھا سکو گے کیوں کہ ستو من بھتو، گڑیا نمک ڈالو پھر پانی ڈالو، پھر گھولو، پھر کھاؤ اور دھان بچارے بھلے، کوٹا کھایا چلے۔ اگر تمہیں یہاں سے جانے کی جلدی ہے تو میرے دھان سے ستو بدل لو اور دھان کھا کر یہاں سے جلدی روانہ ہو جاؤ۔''

ستو والا مسافر سیدھا اور بھولا تھا۔ اس لیے وہ دھان والے کے بہکاوے میں آ گیا۔ اس نے اپنے ستو کے بدلے اس کے دھان لے لئے۔ اب کیا تھا وہ تو ستو کھا کر چلتا بنا اور دوسرا مسافر دھان کوٹتا ہی رہ گیا۔

ڈاڑھی میں تنکا

دیکھیے: چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔

ڈلہ کٹنی سے کون جیتا ہے؟

ایسی عورت جو نہایت مکار، عیار اور پُرفن ہو۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی مکار اور عیار شخص سے بار پانا مشکل ہو۔ اس کہاوت کے پس منظر میں فارسی کی ایک مشہور تلمیح ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

تلمیح: مشہور ہے کہ حلب میں ڈلہ نامی ایک کٹنی رہتی تھی (فارسی میں اس کا صحیح تلفظ دلّہ ہے) وہ نہایت عیار، مکار اور پُرفن تھی مگر اپنے زہد و تقویٰ اور تسبیح و مصلی کی آڑ میں لوگوں کو اپنے دام تسخیر میں پھانسا کرتی تھی۔ وہ لوگوں کے گھروں کے اندر پہنچ کر وہاں کا بھید معلوم کرتی اور پھر موقع پا کر رات کے وقت اپنے دامادوں کے ساتھ جا کر اس کے مال و زیورات وغیرہ کا صفایا کر دیتی۔ وہ اس درجہ شاطر اور ہوشیار تھی

کہ اس نے حلب میں ہزاروں گھروں کا مال وزر لوٹ کر ان کو برباد کر دیا تھا۔ جب حلب سے اسے نکال دیا گیا تو بغداد پہنچ کر اس نے اور بھی اندھیر مچایا اور وہاں کے باشندوں کو خوب لوٹا۔ اس کے مکر وفریب سے خلیفۂ بغداد تک نہ بچ سکا۔ پر فن اتنی تھی کہ نہ کبھی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی اور نہ اس کے قبضے سے چوری کا مال برآمد ہوا۔

ڈوبا بنش کبیر کا، جو اپجا پوت کمال

آباء واجداد کی شان میں بٹا لگانے والا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص اپنے اسلاف کے کارناموں یا وضع قطع کے خلاف کوئی کام کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب دو حکایات اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کبیر نے اپنے بیٹے کمال کو عہدِ طفولیت میں یہ تعلیم دی تھی کہ بیٹا دنیا کے ہر شخص کو اپنا بھائی سمجھنا اور عورتوں کو ماں اور بہن سمجھنا۔ کمال جب بڑا ہوا تو کبیر نے اس کی شادی کرنا چاہی۔ کمال نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ کبیر کے بہت سمجھانے بجھانے پر کمال نے کہا:

"آپ ہی نے مجھے تعلیم دی ہے کہ میں دنیا کے ہر شخص کو اپنا بھائی اور عورتوں کو ماں اور بہن سمجھوں۔ اس لیے مجھے دنیا میں ہر آدمی بھائی اور ہر عورت ماں یا بہن نظر آتی ہے۔ اب آپ بتائیے کہ میں شادی کروں تو کس سے؟"

کبیر سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ اس طرح کمال نے اپنی شادی نہیں کی جس کی وجہ کبیر کی نسل آگے نہیں بڑھ سکی اور اس کا خاندان ختم ہو گیا۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے سلسلے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ کمال اپنے والد کے نظریات اور اقوال کی تردید کیا کرتے تھے۔ کمال کے دلائل سے تنگ ہو کر اور طیش میں آ کر کبیر نے ایک دن اس سے کہا: "ڈوبا بنش کبیر کا، اپجا پوت کمال۔"

ڈوبے کٹورا اپٹے گھڑیال

خطا کوئی کرے سزا کوئی پائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب زمانۂ قدیم میں گھڑیال بجانے کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: قدیم زمانے میں جب گھڑی ایجاد نہیں ہوئی تھی تو کٹورے سے گھڑی کا کام لیا جاتا تھا۔

جس ڈیوڑھی پر گھڑیال بجتا تھا وہاں پانی سے بھرے ہوئے ایک گہرے برتن میں سوراخ دار کٹورے کو تیرا دیتے تھے۔ کٹورے میں سوراخ اتنا کیا جاتا تھا کہ وہ دھیرے دھیرے پانی بھرنے کے سبب ایک گھنٹے میں ڈوب جاتا تھا۔ کٹورا ڈوبنا اس بات کی علامت تھی کہ ایک گھنٹہ ہوگیا ہے۔ اس کے بعد فوراً ہتھوڑے سے گھڑیال کو پیٹ کر بجا دیا جاتا تھا۔ اس سے یہ مثل بن گئی اور مندرجہ بالا مفہوم لیا جانے لگا۔

ڈوبے کٹورا، پٹے گھنٹہ

دیکھیے: ڈوبے کٹورا، پٹے گھڑیال۔

ڈوم کا تیر، خدا جھوٹ کرے

کسی امر بین کے اخفا کرنے یا ظاہری آفت اور مصیبت کو چھپانے کے موقع پر اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ ایک ڈوم کسی جنگل سے گزر رہا تھا۔ اسی جنگل میں کوئی شکاری شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے جوں ہی نشانہ لگا کر کسی بھاگتے ہوئے جانور کو تیر مارا تو تیر خطا کر کے ڈوم کی ران میں جالگا جس سے خون جاری ہوگیا۔ ران میں پیوست تیر اور خون کو دیکھ کر بھی ڈوم نے کہا:

''خدا جھوٹ کرے یا خدا خیر کرے یعنی تیر کا لگنا جھوٹ ہو۔''

اسی وقت یہ مثل بن گئی کہ ''ڈوم کا تیر خدا جھوٹ کرے یا ڈوم کا تیر خدا خیر کرے۔''

ڈوم کا تیر، خدا خیر کرے

دیکھیے: ڈوم کا تیر، خدا جھوٹ کرے۔

ڈھاک تلے کی بے باقی، شہر میں لینا دینا

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی بات کا فیصلہ ہو جانے کے باوجود کوئی نہ کوئی ایسی پخ لگی رہے جس سے وہ فیصلہ بے کار ہو جائے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک شخص نے کسی مہاجن سے کچھ قرض لیا مگر وہ اسے ادا نہ کرسکا۔ جب مہاجن نے تقاضے پر تقاضے کرنا شروع کیے تو اس نے ایک تدبیر کی۔ مہاجن روزانہ شہر سے گاؤں کی طرف اپنا قرض وصول کرنے کے لیے جایا کرتا تھا اور سورج ڈوبنے سے پہلے اپنے گھر کو لوٹ آیا کرتا تھا۔ ایک دن مہاجن اپنے معمول کے مطابق شام کے وقت گاؤں سے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جنگل پڑتا تھا۔ مہاجن کا گزر جوں ہی اس جنگل سے ہوا، اس شخص نے اسے ڈھاک کے ایک درخت کے نیچے پکڑ لیا اور اس کو ڈرا دھمکا کر کہا: ''تو قرض کی رقم چھوڑ دے ورنہ میں تجھ کو اسی وقت جان سے مار ڈالوں گا۔''

مرتا کیا نہ کرتا، مہاجن نے جان کے خوف سے قرض کی رقم چھوڑنے کا اقرار کرلیا۔ اس کے بعد قرض دار نے کہا:

''اچھا اب اس قرض کی فارغ خطی لکھ دو تو تم کو چھوڑ دوں گا۔''

چنانچہ مجبور ہو کر مگر نہایت چالاکی کا ثبوت دیتے ہوئے مہاجن نے لکھا:

''ڈھاک تلے کی بے باقی، شہر میں لینا دینا یا ڈھاک تلے کی چوکتی لیکھا جوں کا توں۔''

یہ تحریر لے کر قرض دار نے مہاجن کو چھوڑ دیا اور فارغ خطی کو لے کر خوشی خوشی اپنے گھر آیا۔ دوسرے دن جب اس نے فارغ خطی کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا تو انہوں نے بے باقی کے اس رقعہ کو پڑھ کر کہا:

''میرے احمق یار، یہ فارغ خطی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں بے باقی ڈھاک کے تلے کی لکھی ہے مگر شہر کا حساب باقی ہے یا اس میں چوکتی ڈھاک کے تلے کی لکھی ہے نہ کہ شہر کی، حساب جوں کا توں ہے۔ میاں کس خیال میں ہو، محض فارغ خطی سے کیا ہوتا ہے بہی کھاتے میں اس کا اندراج نہیں ہوا ہے۔''

ڈھاک تلے کی چوکتی، لیکھا جوں کا توں

دیکھیے: ڈھاک تلے کی بے باقی، شہر میں لینا دینا۔

ڈھیٹر نی نہیں بولتی، گھر میں گڑا برتن بولتا ہے

ڈھیٹری عورت نہیں بولتی بلکہ اس کے گھر میں گڑا ہوا دولت کا برتن بولتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

دولت میسر ہونے پر غرور و تکبر ہونا لازمی ہے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی نیا دولت مند، دولت کے نشے میں نازیبا حرکت یا غرور اور گھمنڈ کی باتیں کرے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ ایک ڈھیڑنی شہر کے سب سے مالدار شخص کے پاس گئی۔ جب اس شخص نے ڈھیڑنی سے آنے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا:

"میں اپنے بیٹے کے لیے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔ اگر آپ اپنی بیٹی کا نکاح میرے بیٹے سے کر دیں تو آپ کی بیٹی زندگی بھر میرے یہاں عیش کرے گی۔"

امیر آدمی کو نہایت تعجب ہوا کہ اس ڈھیڑی عورت کی ہمت کیوں کر ہوئی جو میری بیٹی کے لیے رشتہ لے کر آئی۔ مالدار آدمی نہایت ذی ہوش اور دور اندیش تھا۔ اس نے سوچا یہ یوں ہی میری بیٹی کے لیے پیغام لے کر نہیں آئی ہے بلکہ اس کے ہاتھ کہیں نہ کہیں سے خزانہ لگ گیا ہے۔ اس لیے وہ ایک دن موقع لگا کر اور کچھ مزدوروں کو ساتھ لے کر اس ڈھیڑنی کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے مزدوروں سے کئی جگہ فرش کھدوایا۔ آخر کار جب ڈھیرنی کی چارپائی کے نیچے کی زمین کھودی گئی تو مالدار شخص کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے نیچے کئی گھڑوں میں دولت بھری ہوئی تھی۔ مالدار آدمی نے دولت سے بھرے گھڑوں کو دیکھ کر کہا:

"ڈھیڑنی نہیں بولتی، گھر میں گڑا برتن بولتا ہے۔"

راجا نل پر پتا پڑی، بھونی مچھلی جل میں پڑی

بنے ہوئے کام کا بدقسمتی سے بگڑ جانا، برے دن آئیں تو ہر کام میں نقصان ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں مہابھارت کا ایک ضمنی قصہ ہے جو اس طرح ہے:

قصہ: نل نشادھ دیش کا راجا تھا۔ وہ بہادر، خوبصورت اور ایک باہمت انسان ہی نہ تھا بلکہ علم و فضل میں بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ خاص طور پر وہ ویدوں کا عالم مانا جاتا تھا۔ دمینتی ودھرب دیش کے راجا بھیم کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ انتہائی خوبصورت اور نیک مزاج تھا۔ نل اور دمینتی نے ایک دوسرے کو کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ دمینتی جب شادی کے قابل ہوئی تو راجا بھیم نے سوئمبر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سوئمبر میں بہت سے راجا شامل ہونے آئے، ان میں نل بھی تھا۔ ان کے علاوہ سوئمبر میں چار دیوتا اگنی، اندر، ورن اور یم بھی

شامل ہوئے۔ ان دیوتاؤں نے اپنی اپنی صورتیں نل کی ہم شکل بنالی تھیں۔ کیوں کہ انہیں دمنیتی کی محبت کا علم تھا۔ دمنیتی نے اس کے باوجود بھی سوئمبر کے وقت نل کا انتخاب کیا۔ آخر کار دونوں کی شادی ہوگئی۔ محبت کرنے والوں کا یہ جوڑا ایک عرصہ تک ہنسی خوشی کی زندگی گزارتا رہا۔ ان کے دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ لڑکے کا نام اندرسین اور لڑکی کا نام اندرسینا تھا۔ نل کا چھوٹا بھائی پشکر بہت بدطینت تھا۔ وہ نل سے حسد رکھتا تھا۔ اس نے نل کے ساتھ جوا کھیلا اور فریب کر کے غالب آ گیا۔ نل کو اس بازی میں اپنا سب کچھ ہارنا پڑا۔ بیوی، بچے، سلطنت، محل اور پہننے کے کپڑے تک باقی نہ بچے۔ سلطنت پشکر کے ہاتھ آ گئی۔ پشکر نے نل کے ساتھ دمنیتی کو بھی چھوڑ دیا لیکن یہ اعلان کرادیا کہ کوئی شخص ان دونوں کی مدد نہ کرے۔ ایک عرصہ تک یہ دونوں جنگل جنگل مارے مارے پھرتے رہے۔ جب دکھ اور مصیبتوں کی انتہا ہوگئی تو ایک دن دمنیتی کو سوتا چھوڑ کر نل کہیں چلا گیا تاکہ دمنیتی اس کے ساتھ تکلیف نہ اٹھائے اور اپنے گھر چلی جائے۔ دمنیتی جب سو کر اٹھی تو اس نے نل کو غائب پایا۔ کئی روز تک وہ نل کو تلاش کرتی رہی۔ جب مایوس ہوگئی تو اپنے گھر جانے کے بجائے راجا چھیدی کے یہاں پناہ گزیں ہوگئی۔ راجا چھیدی کو جب کسی طرح دمنیتی کی اصلیت معلوم ہوئی تو اس نے دمنیتی کو اس کے باپ راجا بھیم کے یہاں بجھوایا۔ اسی زمانے میں راجا نل جنگل جنگل اکیلے بھٹکتا رہا۔ ایک دن نل کو سانپ نے کاٹ لیا۔ اس کے زہر سے نل کی موت تو نہیں ہوئی لیکن وہ بدصورت اور کوتاہ قد ہوگیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ نل کئی دن سے بھوکا تھا۔ اسے کھانے کے لیے جنگل میں کئی دن سے کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ کسی طرح اس کے ہاتھ ایک مچھلی لگی۔ اس نے کھانے کیلئے مچھلی کو بھونا اور جونہی کھانے کے لیے بیٹھا کہ ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور بھنی ہوئی مچھلی کو اپنی چونچ میں داب کر لے اڑا۔ جب پرندہ مچھلی کو اپنی چونچ میں داب کرندی کے اوپر سے اڑ رہا تھا کہ اس کی چونچ سے مچھلی چھوٹ کرندی میں گر گئی۔ اسی واقعہ سے یہ کہاوت وجود میں آ گئی کہ ''راجا نل پر بپتا پڑی، بھونی مچھلی جل میں پڑی''

رامائن ساری ہوگئی، سیتا کس کا باپ؟

جو احمق پوری بات سن کر بھی کچھ نہیں سمجھتا اس کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک بار کسی جگہ رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ سننے والوں میں ایک اہیر بھی تھا۔ جب پوری کتھا ختم ہوگئی تو کتھا سننے والے باری باری سے کتھا کہنے والے پنڈت سے کتھا سے متعلق سوالات کرنے

لگے۔ پنڈت جی سوالات کے جواب دے کر انہیں مطمئن کر رہے تھے۔ اہیر نے سوچا وہ کیوں کسی سے پیچھے رہے۔ اس نے ابھی اٹھ کر پوچھا:

''پنڈت جی وہ جو سیتا ہے وہ کس کا باپ ہے؟''

یہ سن کر سبھی لوگ ہنسنے لگے۔ اس احمق نے رامائن کی کتھا تو سنی مگر کچھ سمجھنا تو دور کی بات ہے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکا تھا کہ سیتا کسی عورت کا نام تھا یا کسی مرد تھا۔ اسی وقت سے یہ کہاوت وجود میں آ گئی کہ ''رامائن ساری ہو گئی، سیتا کس کا باپ؟''

رنڈوؤں کے کرم میں نہیں لُگائی تو کیسے ہو شادی بھائی

تقدیر کے آگے تدبیر کام نہیں آتی۔ اگر مقدر خراب ہے تو بنے ہوئے کام بھی بگڑ جاتے ہیں۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی بدقسمت لاکھ کوشش اور تدابیر کے بعد بھی ناکام رہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی جگہ چھے بدقسمت بھائی رہتے تھے۔ ان میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جب تمام کوشش کرنے کے بعد بھی ان میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی تو انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ جب ہمارے مقدر میں کوئی لڑکی شادی کیلئے نہیں ہے تو کیوں نہ جھوٹ موٹ کی دلہنوں سے شادی کر کے اپنے دلوں کو تسلی دے لیں۔ سب سے پہلے ایک بھائی کمہار کے پاس گیا اور اس نے کمہار سے کہا:

''بھائی میرے شادی کہیں نہیں ہو پا رہی ہے مگر مجھے دلہن چاہئے۔ تم ایسا کرو کہ میرے لیے مٹی کی ایک خوبصورت دلہن بنا دو۔ میں اس سے ہی شادی کر لوں گا۔ تمہاری جو اجرت ہو گی ادا کروں گا۔''

کمہار نے اس کی بات مان کر مٹی کی خوبصورت دلہن تیار کر دی اور اس کو سکھانے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا اور خود سو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گھنگھور گھٹا اٹھی اور جم کر پانی برسا۔ مٹی کی دلہن پانی میں گھل کر بہہ گئی اور وہ رنڈوا کا رنڈوا رہ گیا۔

دوسرا بھائی بڑھئی کے پاس پہنچا اور اس نے اس سے لکڑی کی دلہن بنوانے کی خواہش ظاہر کی۔ بڑھئی ترس کھا کر لکڑی کی دلہن بنانے کے لیے راضی ہو گیا۔ اس نے بڑی محنت سے لکڑی کی ایک حسین دلہن

تیار کی مگر دلہن تیار ہوتے ہی دفعتاً اس کے گھر میں آگ لگ گئی۔ گھر کا سامان جلنے کے ساتھ ساتھ لکڑی کی دلہن بھی جل کر خاک ہوگئی۔ جب اسے معلوم ہوا تو وہ ہاتھ مل کر رہ گیا۔

تیسرا بھائی موم والے کے پاس پہنچا اور اس نے اپنی دکھ بھری داستان سنا کر موم کی دلہن بنوانے کی گزارش کی۔ موم والے نے اس سے کہا:

''ٹھیک ہے۔ میں آج موم کی دلہن بنا دوں گا، کل آ کر لے جانا اور میری اجرت بھی ساتھ لیتے آنا۔''

جب موم کی دلہن تیار ہوگئی تو اس نے اسے ایک الماری میں رکھ دیا اور خود کہیں چلا گیا۔ کوئی چوہا موم کی دلہن کو گھسیٹ کر لے گیا اور اسے دھوپ میں چھوڑ کر بل میں گھس گیا۔ اب کیا تھا دھوپ سے دھیرے دھیرے موم کی دلہن پگھل کر بہہ گئی۔ تیسرے بھائی کو جب اس کی خبر ہوئی تو آہ بھر کر رہ گیا۔

چوتھا بھائی حلوائی کی دوکان پر پہنچا اور اس نے حلوائی سے کہا:

''بھائی مجھ پر رحم کرو، تمام کوشش کرنے کے بعد بھی میری شادی نہیں ہو سکی ہے تم میرے لیے مٹھائی کی دلہن بنا دو تو میں اسی کے ساتھ شادی کر کے خوش ہو جاؤں گا۔''

حلوائی نے اس سے کہا:

''ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے مٹھائی کی ایک بہترین دلہن تیار کر دوں گا کل صبح آ کر لے جانا اور اس کے ساتھ شادی کر کے خوش ہونا۔''

حلوائی نے مٹھائی کی دلہن تیار کر کے اپنے خوانچے پر رکھ دی، صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ مٹھائی کی دلہن کو چیونٹیوں نے کھا کر برابر کر دیا ہے۔ چوتھے بھائی کو جب اس کی خبر ہوئی تو مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔

پانچواں بھائی ایک بزاز کی دوکان پر گیا اور اس نے اپنی دکھ بھری کہانی سنا کر بزاز سے کہا:

''میرے لیے کپڑے کی ایک دلہن بنوا دو۔ میں اس سے ہی شادی کر لوں گا اور تمہارے احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا۔''

بزازے نے کہا:

''تمہارے لیے کپڑے کی حسین ترین دلہن بنوا دوں گا۔ کل آ کر اس کے ساتھ شادی کر لینا۔''

بزاز نے کپڑے کی دلہن تیار کروا کر ایک الماری میں رکھوادی۔ پانچواں بھائی جب دلہن لینے آیا تو بزاز اس کے ساتھ اپنی دوکان پر گیا۔ اس نے جوں ہی دوکان کھولی تو کیا دیکھتا ہے کہ کپڑے کی اس حسین ترین دلہن کو چوہوں نے کتر کتر کر پوری دوکان میں پھیلا دیا ہے۔

چھٹا بھائی مالدار تھا۔ وہ ایک سنار کی دوکان پر گیا۔ اس نے سنار سے کہا:

''ہم چھ بھائی ہیں، ہم میں سے اب تک کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ تمام کوشش اور تگ و دو کے بعد بھی ناکام رہے۔ میرے پانچوں بھائیوں میں سے ایک نے کمہار سے مٹی کی دلہن بنوائی تو وہ پانی برسنے سے بہہ گئی۔ دوسرے بھائی نے بڑھئی سے لکڑی کی دلہن بنوائی تو آگ لگنے سے اس کی چتا جل گئی۔ تیسرے بھائی نے موم کی دلہن بنوائی تو دھوپ سے پگھل کر بہہ گئی۔ چوتھے بھائی نے حلوائی سے مٹھائی کی دلہن بنوائی تو چیونٹیوں نے کھا کر اسے برابر کردیا۔ پانچویں بھائی نے بزاز سے کپڑے کی دلہن بنوائی تو چوہوں نے اُسے کتر کتر کر ملک عدم پہنچا دیا۔ اب تم میرے لیے ایک سونے کی بے مثال دلہن تیار کردو تا کہ میں اس سے بیاہ کر کے تم کو دعا دوں۔''

سنار نے اس سے کہا:

''ٹھیک ہے میں تمہارے لیے آج ہی سونے کی دلہن بنادوں گا۔ کل آکر اسے لے جانا اور اس کے ساتھ شادی کر کے عیش کرنا۔''

سنار نے اس کے لیے سونے کی ایک بے مثال دلہن تیار کردی اور اپنی دوکان میں رکھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ رات میں چوروں نے اس کی دوکان کا سارا سامان چوری کرلیا اور سونے کی دلہن کو بھی اٹھا لے گئے۔ صبح ہوتے ہی جب چھٹواں بھائی سنار کے ساتھ اس کی دوکان پر پہنچا تو دوکان خالی دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سنار نے جب اپنے مال کے ساتھ ساتھ سونے کی دلہن چوری ہوجانے پر افسوس کا اظہار کیا تو اس نے کہا:

''رنڈوؤں کے کرم میں نہیں لگائی تو کیسے ہو شادی بھائی۔''

روپیہ کو روپیہ کماتا ہے

دیکھیے: زر را زر می کشد۔

روپیہ کو روپیہ کھینچتا ہے

دیکھیے: زر را زر می کشد۔

روزے چھڑانے گئے تھے، نماز گلے پڑی

دیکھیے: گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی۔

روزے معاف کرانے گئے تھے، نماز گلے پڑی

دیکھیے: گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی۔

رون گورئی کی کتیا

رون اور گورئی گاؤں کی کتیا کی طرح۔ جب کوئی شخص زیادہ لالچ میں پڑ کر بھرپور فائدہ حاصل کرنے کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرے مگر اس کے ہاتھ کچھ نہ لگے۔ تب یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: مدھیہ پردیش کے ضلع بِھنڈ میں رون اور گورئی نام کے دو گاؤں ہیں۔ ایک مرتبہ ایک ہی دن دونوں گاؤں میں شادیوں کا کھانا تھا۔ وہاں کی کتیا نے سوچا دونوں گاؤں کا کھانا کھانا چاہئے۔ آج میری قسمت کھل گئی ہے۔ پو بارہ ہیں، خوب مزہ آئے گا۔ یہ سوچ کر وہ پہلے رون گاؤں گئی، وہاں اس نے دیکھا کہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں اس لیے ابھی دیر ہے۔ اس نے سوچا تب تک گورئی گاؤں ہو آؤں۔ وہاں جانے پر اس نے دیکھا کہ وہاں پر بھی یہی حال ہے۔ لوگوں نے ابھی ابھی کھانا شروع کیا ہے۔ وہ رون گاؤں کی طرف لوٹ پڑی۔ جب وہ رون گاؤں میں آئی تو اس نے دیکھا کہ لوگ کھانا کھا کر چلے گئے ہیں اور جوٹھن بھنگی اٹھا کر لے گیا ہے۔ وہ پھر الٹے پیر گورئی گاؤں کی طرف بھاگی اور جب وہاں پہنچی تو اس نے وہاں دیکھا کہ یہاں بھی رون گاؤں کی طرح حال ہے یعنی سب لوگ کھانا کھا چکے ہیں اور جوٹھن بھنگی اٹھا کر لے گیا ہے۔ آخر میں مایوس ہو کر وہ جوں ہی دونوں گاؤں کے بیچ میں آئی تو بھوک کی تاب نہ لا کر تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا

ادنیٰ کو اعلیٰ چیزوں کا حوصلہ بے مقدوری میں مقدور والوں کی برابری کرنا۔ مفلسی میں تونگری کی امنگ کرنے والوں کی نسبت یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک مالدار سوداگر تھا۔ اس کے ایک ہی بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ تمام جائیداد اور دولت کا تنہا وارث ہوا۔ مفت خوروں اور مطلبی دوستوں کا مجمع اس کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہو گیا۔ رات دن عیش و آرام میں گزرنے لگے۔ دوست مالدار ہو گئے اور یہ سوداگر کا بیٹا دھیرے دھیرے مفلس ہو گیا۔ اب اس کے دوست اس سے گریز کرنے لگے۔ ایک دن اس کی ماں نے اس کو مایوس اور اداس دیکھ کر کہا:

"میں اسی دن کے لیے نصیحت کرتی تھی۔ افسوس تو نے ایک نہ سنی۔"

بیٹے نے کہا:

"آپ نے جو کچھ کہا تھا سب بجا تھا۔ اس شہر کے لوگ مطلب کے یار ہیں۔ اب آئندہ کبھی دوستوں کے چکر میں نہ پھنسوں گا۔"

اس نے کچھ جائیداد بیچ کر تھوڑا بہت سرمایہ اکٹھا کیا اور نہایت احتیاط سے رکھا۔ اس نے اب یہ معمول بنا لیا کہ ہر روز ایک نو وارد مسافر کو شام کے وقت اپنے گھر لاتا۔ اس کی خاطر داری کرتا اور کھلا پلا کر صبح کو رخصت کر دیتا۔ آخر میں اس سے یہ بھی کہہ دیتا کہ اب کبھی میرے گھر کی طرف رخ نہ کرنا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ کسی نو وارد کی تلاش میں دریا کے پل پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں کے بادشاہ سے اس کی ملاقات ہوئی جو ایک عرب تاجر کے بھیس میں تھا۔ بادشاہ کے ساتھ ایک غلام بھی تھا۔ بادشاہ رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیس بدل کر نکلا تھا۔ اس سوداگر نے بادشاہ کو تاجر سمجھ کر مدعو کر لیا اور غلام کے ساتھ اسے اپنے گھر لے آیا۔ سوداگر نے بادشاہ کو اپنا سارا قصہ کہہ سنایا۔ بادشاہ اس کی داستان سن کر حیران تھا۔ سوداگر نے یہ بھی بتایا کہ محلّہ کی مسجد کا امام اور اس کے چار دوست نہایت مردم آزار ہیں۔ اگر میں ایک روز کے لیے بادشاہ بن جاؤں سو سو کوڑے امام کے دوستوں اور چار سو کوڑے امام کے لگوا کر شہر میں تشہیر کراؤں۔ آخر شب میں میزبان نے مہمان سے کہا:

''تھوڑی سی رات باقی ہے اب ہم لوگوں کو سوجانا چاہئے۔ آپ صبح کو دروازہ بند کر کے چلے جانا۔''

مہمان نے کافی کی پیالی میں بے ہوشی کی دوا ملا کر کہا:

''یہ آخری جام میرے ہاتھ سے پی لو، پھر ہم کہاں اور تم کہاں۔''

اس کے پیتے ہی تاجر بے ہوش ہوگیا۔ بادشاہ نے اپنے غلام سے کہا:

''اس کو اٹھا کر لے چلو''

بادشاہ اسے اپنے ہمراہ محل سرا میں لایا۔ اس کے بعد اسے اپنی خواب گاہ میں لے گیا اور وزیر کو حکم دیا:

''یہ شخص کل ہماری جگہ تخت پر جلوس کرے گا۔''

صبح کے وقت جب سوداگر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ہر شخص اس سے بادشاہ کی طرح مخاطب ہے۔ وہ پریشان تھا کہ یہ عالم خواب ہے یا عالم بیداری۔ تھوڑی دیر کے بعد سوداگر کو لباسِ شاہانہ پہنایا گیا اور اس کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا۔ دربار میں امراء نے نذریں پیش کیں۔ اس نے امورِ سلطنت انجام دیئے۔ جب کوتوال اس کے دربار میں حاضر ہوا تو اس نے محلے کی مسجد کے امام اور اس کے چاروں دوستوں کو طلب کر کے سزا دلوائی۔ اس کے بعد دربار آراستہ ہوا۔ بادشاہ کے حکم سے اسے پھر بیہوشی کی دوا پلائی گئی اور اسی حالت میں اس کو اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔ جب صبح کو وہ سو کر اٹھا تو بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ ماں نے کہا: ''بیٹا تجھے کیا ہو گیا؟''

تو اس نے کہا: ''میں بادشاہ ہوں اور آپ بیگم عالیہ ہو۔''

ماں نے جواب دیا:

''رہیں جھونپڑوں میں، خواب دیکھیں محلوں کا۔ بیٹا آج رات تو نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔''

زر را زر می کشد

روپے ہی سے روپیہ پیدا ہوتا ہے۔ روپیہ کو روپیہ کھینچتا ہے۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے انہیں اور دولت ملتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب معمولی فرق کے ساتھ دو تین حکایتیں ہیں جو اس

طرح بیان کی جاتی ہیں:

حکایت ۱: کسی شخص نے سن رکھا تھا کہ زر رازرمی کشد یعنی روپیہ کو روپیہ کھینچتا ہے۔ اس کے پاس ایک ہی روپیہ تھا۔ وہ آزمائش کیلئے بازار گیا اور ایک صراف کی دوکان کے سامنے جا کر اس نے اپنا روپیہ کو صراف کے روپیوں کی ڈھیری پر پھینک دیا اور منتظر کھڑا رہا کہ اب کوئی روپیہ اس کے روپیہ کے ساتھ کھنچ کر آتا ہے۔ بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب کوئی روپیہ اس کے روپیہ کے ساتھ کھنچ کر نہ آیا تو صراف نے اس کو دوکان کے سامنے بہت دیر سے کھڑا دیکھ کر پوچھا:

''میاں کیسے کھڑے ہو؟''

اس نے کہا:

''میں نے ایک روپیہ تمہاری روپیوں کی ڈھیری پر پھینک دیا ہے کہ یہ کوئی روپیہ کھینچ کر لائے گا کیوں کہ میں نے سن رکھا ہے کہ زر رازرمی کشد یعنی روپیہ کو روپیہ کھینچتا ہے۔''

صراف نے جواب دیا:

''میرے بہت سے روپیوں نے تمہارے ایک روپیہ کو کھینچ لیا۔ تم نے صحیح سنا تھا کہ زرکوزر کھینچتا ہے۔

دوسری حکایت معمولی ترمیم کے ساتھ اس طرح مشہور ہے کہ:

حکایت ۲: اس شخص نے صراف کے روپیوں کے ڈھیر کے پاس ایک روپیہ رکھ دیا اور اس انتظار میں دور جا کر کھڑا ہو گیا کہ اس کا روپیہ صراف کے ڈھیر سے روپیہ کو کھینچ کر لائے مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ جب صراف کی نظر اس روپیہ پر پڑی تو وہ یہ سمجھا کہ یہ روپیہ میرے روپیوں کے ڈھیر سے پھٹک گیا ہے، اسی نے اس روپیہ کو اٹھا کر اپنے روپیوں کے ڈھیر میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر وہ شخص صراف کے پاس آیا اور اس نے کہا:

''میں نے سنا تھا کہ روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنے روپیہ کو تمہارے روپیوں کے ڈھیر کے ساتھ رکھ دیا تھا کہ یہ کوئی روپیہ کھینچ کر لائے گا مگر یہ کیا ہوا۔ میرا گانٹھ کا روپیہ بھی چلا گیا۔''

صراف نے جواب دیا:

''تم نے ٹھیک سنا تھا۔ میرے روپیوں نے تمہارے روپیہ کو کھینچ لیا۔ اب سمجھے زر رازرمی کشد۔''

تیسری حکایت بھی معمولی فرق کے ساتھ اس طرح کہی جاتی ہے:

حکایت ۳: وہ شخص اپنے اکلوتے روپیہ کو لے کر صراف کی دوکان پر گیا اور اس کے روپیوں کے ڈھیر کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اب اس نے اپنے روپیہ کو ہاتھ میں لے کر صراف کے روپیوں کے پاس کیا تاکہ کوئی روپیہ اس کے روپیہ سے کھینچ کر آجائے۔ وہ بار بار اپنے روپیہ کو صراف کے روپیوں کے پاس کرتا مگر کسی روپیہ کو نہ کھنچنا تھا نہ کھنچا بلکہ ہوا یہ کہ ایک بار اس کا ہی روپیہ صراف کے روپیوں کے ڈھیر میں جاگرا۔ اس نے مایوس ہو کر صراف سے کہا:

''میں نے سنا تھا کہ زر کو زر کھینچتا ہے مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ میرا ہی روپیہ چلا گیا۔''

صراف نے کہا:

''تم نے صحیح سنا تھا، تمہارے اکلوتے روپیہ کو میرے بہت سے روپیوں نے کھینچ لیا ہے۔ اب سمجھے زر را زر می کشد یعنی روپیہ کو روپیہ کھینچتا ہے۔''

زر کو زر ہی کھینچتا ہے

دیکھیے: زر را زر می کشد۔

زندگی بھر رہے کاسی، مرنے کے بیری مگہر باسی

زندگی بھر تو اچھے لوگوں کی صحبت میں رہے اور آخر میں بدکاروں کی صحبت اختیار کی۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص زندگی بھر تو اچھی جگہ قیام کرے اور آخر وقت میں کسی خراب جگہ چلا جائے۔ تو ہم پرست اور بدعقائد لوگوں کو سمجھانے کے لیے اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ہندی کے مشہور شاعر کبیر داس کی پیدائش، زندگی اور موت کے واقعات ہیں:

واقعات: کبیر داس ہندی کے ایک مشہور صوفی اور سنت شاعر تھے۔ عوام کے عقائد کے مطابق ان کا جنم بنارس میں ہوا تھا۔ سوامی رامانند کی دعا سے یہ ایک بیوہ برہمنی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ بیوہ برہمنی لوک لاج اور سماج میں بدنامی کے خوف کے سبب انہیں لہرتارا نامی تالاب کے کنارے چھوڑ آئی تھی۔ نیرو اور نیما نامی لاولد میاں بیوی اس طفل کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ نیرو اور نیما ذات کے مسلمان جلاہے تھے۔ انہوں نے اولاد کی طرح اس بچے کی پرورش کی۔ یہی بچہ بڑا ہو کر سنت کبیر داس کے نام سے مشہور

ہوا۔ کبیر داس نے جلاہے کا پیشہ اختیار کر کے خاندان کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان کی بیوی کا نام لوئی تھا جس کے بطن سے کمال نامی لڑکا اور کمالی نامی لڑکی پیدا ہوئی۔

کبیر نہایت بے باک اور مست مولا قسم کے آدمی تھے۔ وہ تعلیم یافتہ تو نہ تھے مگر سیر و سیاحت اور صوفی سنتوں کی صحبت میں رہنے کے سبب انہیں مختلف مذاہب اور فرقوں کے متعلق معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے زمانے کے عظیم مصلح تھے۔ ظاہر داری اور توہم پرستی سے انہیں نفرت تھی۔ ظاہری پوجا پاٹ اور پرستش و عبادت سے زیادہ باطنی پاکی اور صفائی کو اہمیت دیتے تھے۔ کبیر نے کبھی کسی مقام مخصوص کی بزرگی کو اہمیت نہیں دی۔ وہ ہمیشہ عمل پر یقین کرتے رہے۔ انہوں نے اس عقیدہ کی دھجیاں اڑانے کے لیے کہ "کاشی میں مرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے اور مگہر میں مرنے سے دوزخ کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔" اپنے آخری وقت میں وہ کاشی چھوڑ کر مگہر چلے گئے تھے جہاں ۱۴۹۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی وقت سے یہ مثل وجود میں آئی کہ "زندگی بھر رہے کاسی، مرنے کے بیری مگہر باسی۔"

زلیخا پڑھی پر یہ نہ جانا عورت ہے یا مرد

دیکھیے: زلیخا زن بود کہ مرد۔

زلیخا تو ساری پڑھ گئے پر یہ نہ جانا کہ وہ عورت تھی یا مرد

دیکھیے: زلیخا زن بود کہ مرد۔

زلیخا زن بود کہ مرد

ان لوگوں کے متعلق کہتے ہیں جو بے سمجھے بوجھے پڑھتے ہیں یا بات کی تہہ کو نہیں پہنچتے۔ سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔ بات کی اصلیت معلوم کرنا چاہئے۔ یہ مثل اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی کے سامنے کوئی بات تفصیل سے بیان کی جائے اور وہ اسے پھر بھی نہ سمجھے۔ ساری داستان سن لی مگر یہ نہ سمجھے کہ زلیخا عورت تھی یا مرد۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی مولوی صاحب نے طلباء کو مکتب میں کئی روز تک داستانِ زلیخا پڑھائی۔ جب داستانِ زلیخا تمام ہوئی تو انہوں نے طلباء سے کہا:

''تم لوگوں نے پوری داستان پڑھ لی۔ اگر کسی کے سمجھنے میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو وہ کھڑے ہو کر پوچھ سکتا ہے۔''

درجہ کے کچھ طلباء نے داستان سے متعلق کچھ سوالات کیے جن کے جوابات دے کر مولوی صاحب نے ان کو مطمئن کیا۔ درجہ میں ایک کمزور اور ناسمجھ طالب علم بھی تھا۔ اس نے سوچا کئی لڑکوں نے مولوی صاحب سے سوالات کیے ہیں جس سے مولوی صاحب سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ طلباء ہوشیار ہیں اور دل لگا کر مطالعہ کرتے ہیں، لہٰذا مجھے بھی کوئی سوال کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا:

''ہاں برخوردار تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا:

''مولوی صاحب یہ بتائیے کہ زلیخا کس کا باپ تھا؟''

اس کے اس سوال پر درجہ کے تمام طلباء کھلکھلا کر ہنس پڑے اور وہ شرمندہ ہو گیا۔ مولوی صاحب نے اس طالب علم سے کہا:

''زلیخا تو ساری پڑھ گئے پر یہ نہ جانا کہ عورت تھی یا مرد یعنی زلیخا زن بود کہ مرد۔''

زیادہ ہوشیار تین جگہ چیڑے

جو اپنے کو بہت زیادہ ہوشیار اور چالاک سمجھتا ہے وہ ہی زیادہ دھوکا کھاتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: دو دوست ایک ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک دوست اپنے آپ کو بہت زیادہ ہوشیار اور چالاک سمجھتا تھا۔ چلتے چلتے ان دونوں کے پیروں میں کوئی چیز لگ گئی۔ ایک دوست نے اپنے پیر کو زمین پر رگڑ دیا جس سے لگی ہوئی چیز بڑی حد تک صاف ہو گئی۔ لیکن وہ دوست جس کو اپنی چالاکی اور ہوشیاری پر ناز تھا اس نے اس چیز کو ہاتھ سے اٹھایا، یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کیا چیز ہے؟ مگر جب ہاتھ سے اٹھا کر بھی دیکھنے پر یقینی طور پر پتا نہیں چلا کہ یہ کیا چیز ہے تو اس نے سونگھنے کیلئے اپنے ہاتھ کو اپنی ناک کے پاس کیا۔ جب سونگھنے سے بھی اس کی بو کو نہیں سمجھ سکا تو اس نے ہاتھ کو ناک کے بالکل قریب کر لیا۔ جس سے وہ چیز اس کی ناک پر لگ گئی، تب پتا چلا کہ وہ اور کوئی چیز نہیں بلکہ پاخانہ ہے۔ اس طرح زیادہ ہوشیاری

دکھانے کی وجہ سے اس نے پاخانے کو پیر کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور ناک پر بھی لگالیا۔اس کے دوست نے یہ دیکھ کر کہا:

''زیادہ ہوشیار تین جگہ چپڑے۔''

سات سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

دیکھیے: نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔

ساٹھ گاؤں بکری چر گئی

کوئی ناممکن بات یا حیرت انگیز واقعہ کا رونما ہونا۔اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی ناقابل یقین بات کو منوانے کی کوشش کرے۔اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی جنگل میں ایک غریب چرواہا رہتا تھا۔اس ملک کا بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ جنگل کی سیر کو نکلا۔گھومتے گھومتے رات ہوگئی تو وہ اسی چرواہے کی کٹیا میں ٹھہر گیا۔چرواہے نے بادشاہ اور اس کے وزیر کی بہت خدمت کی۔حسب حیثیت خاطر داری اور تواضع کی چلتے وقت بادشاہ نے خوش ہو کر ایک پتے پر فرمان لکھ کر اسے ساٹھ گاؤں کی سرداری عطا کر دی اور اس سے کہہ دیا کہ اسے لے کر کل دربار میں آجانا۔بادشاہ کے جانے کے بعد اس غریب چرواہے نے پتے کو کہیں رکھ دیا جسے اس کی بکری کھا گئی۔وہ بے چارہ بہت فکرمند ہوا۔وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ افسوس ساٹھ گاؤں بکری چر گئی۔وہ پھر بھی بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور اپنے دکھ بھرے قصے کو رو رو کر سنایا۔

بادشاہ نے ہنس کر کہا:

''جب ساٹھ گاؤں بکری چر گئی تو اب کیا کیا جائے۔جو تمہارے مقدر میں تھا وہ ہوا۔اب میں کیا کر سکتا ہوں۔''

بعض لوگوں کے مطابق بادشاہ نے اس غریب چرواہے سے کہا:

''اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے۔میں دوسرا فرمان لکھوا کر تم کو عطا کر دوں گا جاؤ عیش کرو عیش۔''

ساجھے کی سوئی سانگ پر چلے

دیکھیے: ساجھے کی سوئی سینگرا پر چلے۔

ساجھے کی سوئی سانگے پر جاتی ہے

دیکھیے: ساجھے کی سوئی سینگرا پر چلے۔

ساجھے کی سوئی سینگرا پر چلے

ساجھے یا شرکت کے کام میں بہت پریشانیاں ہوتی ہیں۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی ساجھے کے کام میں وقت پیش آئے اور پھر بھی وہ کام ٹھیک سے نہ ہو سکے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک روز وہ دونوں کسی شہر گئے۔ وہاں انہوں نے ساجھے میں ایک سوئی خریدی۔ جب وہ لوگ اپنے گاؤں کی طرف چلے تو سوئی ایک دوست کے پاس تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس دوست نے سوچا۔ سوئی تو ساجھے میں خریدی گئی ہے۔ میں ہی اسے اکیلا لے کر کیوں چلوں۔ اس نے دوسرے دوست سے کہا:

''یار! یہ سوئی ہم دونوں کے ساجھے کی ہے۔ میں اسے یہاں تک اکیلے ڈھو کر لایا ہوں۔ اب اسے تم لے کر چلو۔''

دوسرے دوست نے جواب دیا:

''جب یہ سوئی ہم دونوں کے ساجھے کی ہے تو دونوں لوگ اسے لے کر چلیں گے۔ میں اکیلے کیوں لاد کر چلوں۔''

اب کیا تھا، رتی بھر وزن کی سوئی کو لے کر جانے کے لیے ایک بڑا سا بانس لایا گیا۔ جس کے بیچ میں سوئی باندھی گئی۔ بانس کے ایک سرے کو ایک دوست نے اپنے کندھے پر رکھا اور دوسرے دوست نے دوسرے سرے کو اپنے کندھے پر رکھا۔ اس طرح دونوں دوست سوئی کو لے کر اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ (اس طرح کے ڈھونے کے کام میں لائے جانے والے بانس یا لکڑی کو ''سانگ'' یا سینگرا کہتے ہیں۔)

سارا گھر جل گیا، تب انگوٹھی پوچھی

دیکھیے: سارا گھر جل گیا، تب چوڑیاں پوچھیں۔

سارا گھر جل گیا، تب چوڑیاں پوچھیں

یہ کہاوت اس اوچھے شخص کی نسبت کہتے ہیں جو اتفاق سے اچھی چیز پہن کر لوگوں کو دکھانے کی طرح طرح سے کوشش کرے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی اوچھی عورت نے عید کے دن نہایت خوب صورت سونے کی چوڑیاں پہنیں۔ اس نے ہر ایک کو کسی نہ کسی بہانے سے اشارہ کر کر کے دکھانے کی ناکام کوشش کی مگر کسی نے چوڑیوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ آخر کار وہ مایوس ہوگئی، پھر اس کو اچانک کوئی خیال آیا۔ اس نے اپنے مکان پر تیل چھڑک کر دیا سلائی دکھادی۔ شعلے بلند ہونے لگے۔ لوگ آگ بجھانے کے لیے دوڑ پڑے۔ کسی نے پوچھا:

"آگ کیسے لگی!"

عورت نے ہاتھ اٹھا کر چولہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"آگ وہاں سے لگی ہے؟"

اس نے محسوس کیا کہ اب بھی کسی کی نظر اس کی نئی اور قیمتی چوڑیوں کی طرف نہیں گئی ہے تو اپنے ہاتھوں کو پھیلا پھیلا کر بتلانے لگی کہ ادھر بھی پانی ڈالو، ادھر بھی بجھاؤ۔ ایسا بار بار کرنے میں اتفاق سے کسی کی نظر اس کی چوڑیوں پر جا پڑی اور اس نے پوچھ لیا: "یہ سونے کی چوڑیاں کہاں سے منگوائی ہیں، نہایت خوبصورت ہیں، قیمتی معلوم ہوتی ہیں۔"

عورت نے تیور بدل کر جواب دیا:

"اب پوچھنے کا خیال آیا۔ جب سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں۔"

دوسری حکایت میں چوڑیوں کی بجائے سونے کی انگوٹھی کا ذکر کیا گیا ہے

سارس کی دعوت، تھالی میں کھیر

دیکھیے: جیسے کو تیسا۔

ساری رامائن سن کر پوچھا، سیتا کس کی بہو تھی؟

دیکھیے: رامائن ساری ہوگئی، سیتا کس کا باپ؟

بعض لوگوں کے مطابق اہیر نے پنڈت جی سے پوچھا تھا کہ ''سیتا کس کی بہو تھی'' نہ کہ اس نے یہ پوچھا تھا کہ ''سیتا کس کا باپ؟''

ساری رامائن سن کر پوچھے کہ سیتا کس کی جورو تھی؟

دیکھیے: رامائن ساری ہوگئی، سیتا کس کا باپ؟

ایک روایت کے مطابق اہیر نے پنڈت جی سے سوال کیا تھا کہ ''سیتا کس کی جورو تھی'' اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ ''سیتا کس کا باپ تھا؟''

ساری رامائن ہوگئی، سیتا کس کا باپ؟

دیکھیے: رامائن ساری ہوگئی، سیتا کس کا باپ؟

ساری رامائن ہوگئی، سیتا کس کی جورو؟

دیکھیے: رامائن ساری ہوگئی، سیتا کس کا باپ؟

ایک حکایت کے مطابق اہیر نے پنڈت جی سے پوچھا تھا کہ ''سیتا کس کی جورو تھی؟'' نہ کہ اس نے یہ پوچھا تھا کہ ''سیتا کس کا باپ تھا؟''

ساری سوئیاں نکالے وہ کوئی نہیں، جو آنکھ کی نکالے وہ سب کچھ

دیکھیے: آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی تھیں۔

سارے برتن مر گئے، بچہ جنی دیگ

تمام برتن مر گئے اور دیگ کے بچہ پیدا ہوا۔ ہوشیار اور چالاک شخص کا اس سے بھی زیادہ ہوشیار

شخص سے واسطہ پڑنا۔ جیسے کو تیسا ملنا۔ اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی چالاک، اور عیار شخص کو اس سے بھی زیادہ عیار اور فریبی شخص مل جائے اور اپنا بدلا لے لے۔ یہ کہاوت اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب کوئی شخص لالچ اور طمع میں پڑ کر اپنا ایمان خراب کر لے یا اس کی نیت میں فتور پیدا ہو جائے۔

اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: ایک عیار شخص کرائے پر برتن وغیرہ دینے والے ایک سیٹھ کی دوکان پر گیا اور اس سے کہا:

''میرے یہاں شادی کی تقریب ہے جس کے لیے فلاں فلاں برتنوں کی ضرورت ہے۔ دودن کے لیے کرائے پر دے دیجئے اور کرایہ پیشگی لے لیجئے۔ شادی کے بعد سارے برتن بہ حفاظت واپس کر دیئے جائیں گے۔''

سیٹھ جی نے سارے مطلوبہ برتن کرایے پر دے دیئے۔ دودن کے بعد جب وہ شخص برتن واپس کرنے آیا تو اس نے تمام برتن شمار کر کے واپس کر دیئے۔ آخر میں ایک چھوٹی سی دیگچی بھی سیٹھ جی کی خدمت میں پیش کر دی جو لیے گئے برتنوں سے زائد تھی۔ سیٹھ جی نے پوچھا:

''یہ کیا ہے، یہ تو تم نے کرائے پر نہیں لی تھی۔''

اس شخص نے جواب دیا:

''بلاشبہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ اسے کل رات اس دیگ نے جنا ہے جسے میں کرائے پر لے گیا تھا۔''

سیٹھ جی کے دل میں لالچ پیدا ہوا۔ اس نے سوچا ایسے گاؤدی کہاں ملتے ہیں دیگچی کو لے کر دوکان کے اندر رکھ آیا۔

کچھ دن کے بعد وہ شخص پھر اسی لالچی سیٹھ کے یہاں گیا اور اس سے کہا:

''بھائی میرے یہاں آج رات ایک عظیم الشان تقریب ہے جس کے لیے زیادہ برتنوں کی ضرورت ہے۔ کرایہ پیشگی لے لیجئے اور اتنے برتن میرے گھر پہنچا دیجئے۔''

سیٹھ جی کے دل میں لالچ تو تھا ہی۔ اس نے سوچا پھر کوئی برتن بچہ دے گا۔ اس نے خوشی خوشی تمام مطلوبہ برتن اس کے گھر پہنچا دیئے اور پیشگی کرایہ بھی نہیں لیا۔ اس کے بعد کئی روز گزر گئے مگر وہ شخص برتن واپس کرنے نہیں آیا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، سیٹھ جی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ آخر ایک دن وہ اس شخص کے یہاں اپنے برتن لینے کے لیے پہنچ گیا۔ جوں ہی سیٹھ نے اس کے دروازے پر دستک دی کہ وہ شخص روتا

پیٹتا ہوا باہر نکل آیا اور اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر کہنے لگا:

''سیٹھ جی غضب ہوگیا، آپ کے سارے برتن مر گئے۔ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔''

سیٹھ جی نے کہا:

''دماغ تو نہیں چلا گیا ہے؟ کیا بکتے ہو؟ کہیں برتن بھی مرا کرتے ہیں۔''

اس شخص نے جواب دیا:

''سیٹھ جی یہ سچ ہے کہ برتن نہیں مرتے ہیں۔ مگر آپ کو یہ تو ماننا پڑے گا کہ اگر دیگ بچہ جن سکتی ہے تو برتن مر بھی سکتے ہیں۔''

سیٹھ جی نے آہ بھر کر کہا:

''بھائی دل پر جبر کر کے تسلیم کر لیتا ہوں۔ اچھا اب سیدھے ہاتھ سے ان برتنوں کا اتنے دن کا کرایہ تو دے دیجئے۔''

اس نے کہا:

''سیٹھ جی! کرایہ دینے میں مجھے کوئی عذر نہ تھا مگر مردہ برتنوں کی تدفین میں کرائے سے بھی زیادہ رقم خرچ ہوگئی جو آپ کو ادا کرنا چاہئے۔''

سیٹھ جی اپنا دل تھام کر رہ گئے۔

سانجھی چلے سانجھ سے، ساتھ بسنتا پوت
مادھو بھی تو جات ہے، باندھ کمر میں سوت

جب کوئی شخص کسی کے دام میں پھنسا ہوا اور سخت نگرانی کے باوجود بھی دھوکا دے کر نکل جائے تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں مادھو نامی ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام سانجھی اور بیٹی کا نام بسنتا تھا۔ وہ کئی مہاجنوں کا قرض دار تھا۔ مہاجن اس کے گھر بار بار تقاضا کرنے آتے تھے مگر دینے کے

لیے اس کے پاس کچھ نہ بچا تھا۔ مہاجنوں کے تقاضوں سے تنگ آ کر اس نے کئی بار گاؤں چھوڑ کر بھاگ جانے کا ارادہ کیا مگر سخت نگرانی کے سبب وہ ہمیشہ ناکام رہا۔ ایک بار ہولی کا تیوہار آیا تو اس نے شام کے وقت اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو کہیں بھجوا دیا۔ دوسرے دن خود ہولی کا سوانگ بھر کر سوانگ بھرنے والوں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ ہولی کے سوانگی تمام اول فول بک رہے تھے۔ اس نے بھی سوانگیوں کے انداز میں زور زور سے کہنا شروع کر دیا:

''سانجھی چلے سانجھ سے، ساتھ بستا پوت، مادھو بھی تو جات ہے، باندھ کمر میں سوت۔''

اور یہ کہتا ہوا وہ اپنے گاؤں سے نکل گیا۔ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ ہولی کا سوانگ بھر کر اول فول بک رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد لوگوں نے اس کہاوت کا مطلب سمجھا۔ سارے مہاجن پچھتا کر رہ گئے۔ وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گاؤں سے نکل گیا۔

سانچ کہے سو مارا جائے، جھوٹ کہے سو لڈو کھائے

سچ کہنے والے کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جھوٹ بولنے والا مزے اڑاتا ہے۔ سچ بولنے میں بھی موقع اور مصلحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ کہاوت اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب کوئی شخص ایسے موقع پر سچ بات کہے کہ فساد برپا ہو جائے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح مشہور ہے:

حکایت: ایک گاؤں میں دو شخص رہتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص ہمیشہ سچ بولا کرتا تھا۔ اور دوسرا سوائے جھوٹ کے کچھ کہتا ہی نہ تھا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ کہیں جانے کا ارادہ کر لیا اور سفر کے لیے نکل پڑے۔ جنگل کا راستہ تھا۔ راہ بھٹک کر بندروں کے ایک جزیرے میں جا پہنچے۔ بندروں کے بادشاہ شاہ میمون کو جب ان دونوں اجنبیوں کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے دونوں کو گرفتار کر کے اپنے دربار میں پیش کرنے کا حکم دے دیا۔ بندروں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان دونوں مسافروں کو آناً فاناً پکڑ کر اپنے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ شاہ میمون نے ان سے کہا:

''اے اجنبیو! میں کیسا ہوں اور کس قسم کا بادشاہ معلوم ہوتا ہوں؟''

جھوٹ بولنے والے مسافر نے پہلے جواب دیا:

''جہاں پناہ! آپ مجھ کو بڑے صاحب جاہ و ثروت بادشاہ معلوم ہوتے ہیں۔''

اس کے بعد بادشاہ نے پھر پوچھا:

''میرے درباریوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

جھوٹے مسافر نے کہا:

''آپ کے درباری نہایت لائق اور وفادار نظر آتے ہیں۔''

شاہ میمون اور اس کے درباری اس سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس مسافر کو طرح طرح کے تحفے پیش کیے۔ مارے خوشی کے اس کا منہ لڈوؤں سے بھر دیا۔

اب سچ بولنے والے مسافر کی باری تھی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اسے جب جھوٹ بولنے میں تحفے اور لڈو ملے ہیں۔ اگر میں سچ بولوں گا تو مجھے اور زیادہ قیمتی تحفے ملیں گے۔ شاہ میمون نے سچ بولنے والے مسافر سے پوچھا:

''بتاؤ میں اور میرے درباری تمہیں کیسے معلوم ہوتے ہیں؟''

سچے مسافر نے سیدھے سادے الفاظ میں جواب دیا:

''تم ایک عمدہ بندر ہو اور تمہارے یہ درباری بھی اچھے بندر معلوم ہوتے ہیں۔''

شاہ میمون کو اس کی یہ سچی بات نہایت ناگوار گزری اور وہ بگڑ گیا۔ اس کے دربار کے بندر بھی اس سے خفا ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سچے مسافر کو نوچ اور کاٹ کر زخمی کر دیا۔ سچے مسافر کے منہ سے بس اتنا نکلا: ''سانچ کہے سو مارا جائے، جھوٹ کہے سو لڈو کھائے۔''

ستر چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

دیکھیے: نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔

سر منڈاتے فضیحت بھئے، ذات پات دونوں سے گئے

مونڈ منڈائے فضیحت بھئے، ذات پات دونوں سے گئے۔

سمجھنے والے کی موت ہے

جو سمجھتا ہے وہی پریشان رہتا ہے۔ خاندان میں سمجھ دار شخص ہی کو پریشانیاں اٹھانا پڑتی ہیں کیوں کہ اسی کو ہر چیز کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے اکبر اور بیربل کا

ایک قصہ مشہور ہے جو اس طرح ہے:

قصہ: ایک بار اکبر بادشاہ کے دربار میں گانا ہو رہا تھا۔ سامعین میں سے اکثر سر ہلا ہلا کر گانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اکبر کو ان کی یہ حرکت ناگوار خاطر ہوئی۔ اس نے حکم دیا کہ اب کوئی بھی درباری گانا سننے کے دوران اپنا سر نہیں ہلائے گا۔ اگر ہلائے گا تو سمجھ لے کہ اس کی موت اس کے سامنے کھڑی ہے۔ سامعین میں سے اکثر موسیقی کے علم سے ناواقف تھے انہوں نے اپنا سر ہلانا بند کر دیا اور کچھ خوف کے مارے خاموش ہو رہے۔ بیربل ماہر علم موسیقی تھا۔ اس سے نہ رہا گیا وہ اپنا سر ہلا ہلا کر گانے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے بادشاہ سے کہا:

''جہاں پناہ! اور لوگوں کی بات دوسری ہے لیکن سمجھنے والے کی موت ہے۔ اس سے سر ہلائے بغیر نہیں رہا جاتا۔''

سن رے ڈھول، بہو کے بول

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی کو تنبیہ کرنا مقصود ہو۔ بہلا پھسلا کر اسی کے ذریعہ اس کا راز فاش کرا دینے کے موقع پر بھی اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک گھر میں ماں، بیٹا اور بہو رہتے تھے۔ بہو کا کردار مشتبہ تھا۔ لہٰذا اس کی ساس نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی نگرانی کرتی رہی۔ جب اس کا شک یقین میں بدل گیا تو اس نے اپنے بیٹے سے بہو کی بدچلنی کے بارے میں شکایت کی۔ بیٹا اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا اس لیے اس نے ماں کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ماں نے رہ رہ کر بہو کے چال چلن کے بارے میں بیٹے کو کئی بار آگاہ کیا مگر اس کے کان میں جوں تک نہ رینگی۔ اتفاق سے ایک بار بہو بیمار پڑ گئی تو ساس نے بہو کی بدکرداری کا راز فاش کرنے کی ترکیب سوچی۔ وہ ایک پنڈت جی کے پاس گئی اور ان کو پٹی پڑھا پڑھا کر بہو کو دکھانے کے بہانے گھر لے آئی۔ پنڈت جی نے بہو کی نبض دیکھ کر کہا:

''یہ لو گنگا جل پی لو۔ اب تمہارا آخری وقت ہے۔ اپنی غلطیوں اور گناہوں کو ہمارے سامنے ظاہر کر کے توبہ کر لو تو تمہاری نجات ہو جائے گی ورنہ سیدھے دوزخ میں جاؤ گی۔''

بہو یہ سن کر گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں ہی اس نے پنڈت جی اور اپنی ساس کے سامنے غلطیوں اور

گناہوں کو ظاہر کرنا قبول کرلیا۔ ساس نے بہو کے شوہر یعنی اپنے بیٹے کو ایک ڈھول کے اندر چھپا کر اسی کمرے میں رکھ دیا تھا تا کہ جب بہو اِن کے سامنے اپنی زبان سے اپنی بد چلنی کا اقرار کرے تو وہ خود اپنے کانوں سے سن سکے۔ ایسا ہی ہوا، جب بہو نے اپنی غلطیوں اور گناہوں کے بارے میں بتانا شروع کیا تو بیچ بیچ میں ماں ڈھول کی طرف اشارہ کر کے کہتی جاتی تھی:

''سن رے ڈھول، بہو کے بول'' یعنی اے بیٹا! میں نے تجھ کو سینکڑوں بار بہو کی بد چلنی کے بارے میں آگاہ کیا مگر تو نے میری باتوں پر ذرا بھی یقین نہ کیا۔ اب خود اپنی بیوی کے منہ سے سن کر آگاہ ہو جاؤ۔''

سنگت کی پھوٹ کا اللہ بیلی

دیکھیے: اکیلے دکیلے کا اللہ کا بیلی

سوت کی انٹی اور یوسف کی خریداری

حیثیت کم ارادے بڑے۔ اگر کوئی شخص معمولی بساط پر کسی بڑے کام کا حوصلہ کرے تو اس تلمیحی مثل کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ایک تلمیح سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

تلمیح: حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی تھے۔ ان میں بنیامین تو سگے اور باقی دوسری ماؤں سے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی ساری اولادوں میں حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین ہی کو چاہتے تھے۔ یہ بات ان کے دوسرے بیٹوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح ان دونوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیں۔ ایک دن انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے جا کر ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا اور ان کا کرتہ کسی جانور کے خون میں تر کر کے باپ کو لا کر دکھایا اور کہا:

''یوسف کو بھیڑیے نے کھالیا ہے۔''

توراۃ میں لکھا ہے کہ اس کے بعد برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر مصری سوداگروں کے ہاتھ کھوٹے درہموں میں فروخت کر دیا۔ ابھی یہ سوداگر حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر مصر کی طرف روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے حسن و جمال کی شہرت مصر پہنچ چکی تھی۔ غلام خرید نے

والے لوگ حسین وجمیل غلام خریدنے کے لیے بازار میں بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ مصری سوداگر جس وقت حضرت یوسف کو لے کر مصر کے بازار میں پہنچے اس وقت ہزاروں لوگ دور دور سے ان کو خریدنے کے لیے آکر جمع ہوگئے تھے۔ پہنچتے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو نیلام پر چڑھایا گیا۔ ہر شخص اس حسین ترین غلام کو خریدنا چاہتا تھا۔ ان خریدنے والوں کی بھیڑ میں ایک بڑھیا بھی تھی جس کے پاس سوائے ایک سوت کی انٹی کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ اس کا حوصلہ دیکھ کر کسی نے کہا:

''سوت کی انٹی اور یوسف کی خریداری۔''

جواب ضرب المثل بن گیا ہے۔

سوت نہ پونی، کوری سے لٹھا لٹھ

بنا بات کا جھگڑا، خواہ مخواہ کا جھگڑا (معنی اور کہاوت کے استعمال کے لیے دیکھیے: سوت نہ کپاس کوری گھر لٹھم لٹھا)۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک مرتبہ ایک ٹھاکر کسی کوری (ہندو جلاہا) کے پاس گیا اور اس سے کہا

''میرے لیے کھادی کی ایک بہترین چادر بن دے۔''

کوری نے کہا:

''میرے پاس سوت نہیں ہے، اگر آپ سوت دے دیں تو میں چادر بن دوں گا۔''

ٹھاکر نے کہا:

''میرے پاس سوت نہیں ہے۔''

اس پر کوری نے کہا:

''اچھا آپ پونی ہی دے دیں، میں سوت خود ہی کات لوں گا۔''

ٹھاکر نے جواب دیا:

''میرے پاس پونی بھی نہیں ہے۔''

یہ سن کر کوری نے کہا:

''تو پھر آپ ہی بتائیے۔ میں سوت اور پونی کہاں سے لاؤں اور کس طرح چادر بنوں۔''

اس پر ٹھاکر نے لاٹھی تانتے ہوئے ناراض ہو کر کرخت لہجے میں کہا:

"اگر تو میرے لیے چادر نہیں بنے گا تو اس لٹھ سے تجھ کو ٹھیک کر دوں گا۔"

اتفاق سے اسی وقت وہاں ایک شخص آ گیا اور تمام جھگڑے کو سن کر اس نے کہا:

"سوت نہ پونی، کوری سے لٹھا لٹھ۔"

سوت نہ کپاس، جلاہے گھر لٹھم لٹھا

دیکھیے: سوت نہ کپاس، کوری گھر لٹھم لٹھا۔

سوت نہ کپاس، کوری سے گھر لٹھم لٹھا

دیکھیے: سوت نہ کپاس، کوری گھر لٹھم لٹھا۔

سوت نہ کپاس، کوری گھر لٹھم لٹھا

خواہ مخواہ کا جھگڑا، بے بنیاد بات پر فساد۔ جس امر کا سان گمان بھی نہ ہوا اس میں خواہ مخواہ کج بحثی اور جھگڑا کرنے کے محل پر اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بغیر کسی سبب یا بنا کسی بات کے جھگڑا کرنے والوں کے لیے بھی یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح مشہور ہے:

لوک کہانی: ایک کوری اور کورن (ہندو جلاہے کی بیوی) کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنے گھر کے باہر بیٹھے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے۔ اچانک کوری کے دل میں کچھ خیال آیا تو اس نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا:

"یہ جگہ کپاس کے دھنکنے کے لیے موزوں ہے۔ میں اس جگہ کپاس دھنا کروں گا۔"

کورن نے کہا:

"تم اس جگہ کیسے کپاس دھنو گے؟ میں اس جگہ سوت کی انٹیاں بناؤں گی۔ تم اپنی کپاس کسی اور جگہ جا کر دھنو۔"

کوری نے جواب دیا:

"میں تو اسی جگہ کپاس دھنوں گا۔ سوت کی انٹیاں بنانے کے لیے تم کسی اور جگہ کا انتخاب

کرلو۔"

کورن نے پلٹ کر پھر جواب دیا:

"کچھ بھی ہو، میں تو اسی جگہ پر سوت کی انٹیاں بناؤں گی۔"

اب کوری بھی طیش میں آگیا اور کڑک کر کہنے لگا:

"اگر تم نے اس جگہ پر انٹیاں بنائیں تو پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

کورن بھی غصے سے لال بھبوکا ہوگئی اور چیخ چیخ کر کہنے لگی:

"تمہیں جو کچھ کرنا ہو کرلو، میں تو اسی جگہ انٹیاں بناؤں گی۔"

کوری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پاس پڑے ہوئے ڈنڈے کو اٹھایا اور اس کی پیٹھ پر جڑ دیا۔ ڈنڈا کھاتے ہی کورن گھر کے اندر چلی گئی اور وہاں سے لاٹھی لے کر باہر آتے ہی کوری کے جڑ دی۔ اب کیا تھا دونوں میں لٹھم لٹھا شروع ہوگئی۔ اس جھگڑے کو دیکھ کر محلے کے کچھ لوگ اکٹھا ہوگئے اور ان کا بیچ بچاؤ کر دیا۔ بیچ بچاؤ کرنے کے بعد جب لوگوں نے ان دونوں سے اس جھگڑے کا سبب پوچھا اور سبب جاننے کے بعد جب ان لوگوں نے سوت اور کپاس کو دیکھنا چاہا تو پتا چلا کہ کوری کے پاس دھننے کے لیے نہ تو کپاس ہے اور نہ کورن کے پاس انٹیاں بنانے کے لیے سوت ہے۔ اس پر حیران ہو کر طنز بھرے لہجے میں کسی نے کہا:

"سوت نہ کپاس، کوری گھر لٹھم لٹھا۔"

سو سیانوں کی ایک رائے

دیکھیے: سو سیانے ایک رائے۔

سو سیانوں کی ایک عقل

دیکھیے: سو سیانے ایک رائے۔

سو سیانے ایک رائے

ہر ہوشیار شخص کی رائے ایک جیسی ہے۔ کسی مسئلے کے بارے میں تمام دانشور اکثر ایک جیسا ہی سوچتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ لوک کہانی ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی

طرح سے بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک مرتبہ کسی بادشاہ کے دربار میں دانشوروں اور عاقلوں کی رائے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگ اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ وزیر نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''تمام دانشور کسی مسئلے پر عام طور پر ایک جیسا ہی سوچتے ہیں اور اس مسئلے پر ایک رائے ہو جاتے ہیں۔''

بادشاہ نے وزیر کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وزیر نے کہا:

''جہاں پناہ میں اس بات کو بڑی آسانی کے ساتھ ثابت کر سکتا ہوں۔''

بادشاہ نے کہا: ''وہ کیسے؟''

وزیر نے کہا:

''حضور! آپ اپنے ہر درباری کو حکم دیں کہ محل سے ملحق یہ جو سوکھا کنڈ ہے، آج رات کو اپنے اپنے گھر سے ایک ایک لوٹا اصلی دودھ لا کر اس کنڈ میں ڈالیں۔''

بادشاہ نے حکم صادر فرما دیا۔ حکم کے مطابق بادشاہ کے دربار کا ہر درباری اپنے اپنے گھر سے ایک ایک لوٹا دودھ لے جا کر رات گئے اس کنڈ میں ڈال آیا۔ دوسرے دن جب صبح اس کنڈ کو دیکھا گیا تو اس میں پانی ہی پانی تھا۔ دودھ کا کہیں نام تک نہ تھا۔ کنڈ میں دودھ ڈالنے سے پہلے ہر درباری نے یہی سوچا تھا کہ جب اتنے زیادہ آدمی دودھ ڈالیں گے تو میرا ایک لوٹا پانی بھی اس میں کھپ جائے گا۔ اس طرح ہر شخص نے دودھ کے بجائے کنڈ میں ایک ایک لوٹا پانی ہی ڈالا تھا۔ بادشاہ نے جب یہ دیکھا تو نہ صرف وزیر کی رائے سے متفق ہوا بلکہ اس کو انعام واکرام سے نوازا بھی۔

سہ بندی کا پیادہ جس کا آگا پیچھا برابر ہے

ایسا شخص جس کی دوستی اور دشمنی میں کوئی فرق نہ ہو۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی ایسے شخص سے واسطہ پڑ جائے جو ہر طرح سے مضر ہو۔

سہ بندی کا پیادہ اس سپاہی کو کہتے ہیں جو ہر سال چند ماہ کے لیے مال گزاری وصول کرنے کے لیے رکھا جائے اور پھر علیحدہ کر دیا جائے۔ کنایتاً عارضی دولت مند اور چند روزہ حاکم کو بھی کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب مندرجہ ذیل ہے

حکایت: کہا جاتا ہے کہ اودھ میں تحصیل وصول کرنے کیلئے، صرف نو مہینے کی مدت کے لیے سپاہی رکھے جاتے تھے۔ وہ سپاہی سہ بندی کے پیادے کہلاتے تھے۔ سہ بندی کے پیادے کسانوں کے ساتھ تین طریقوں سے پیش آتے تھے جن کو ربط، ضبط اور خبط کہا جاتا تھا۔ پہلے تو یہ لوگ کسانوں سے میل ملاپ بڑھا کر ربط پیدا کرتے تھے اور ان کی پیداوار کا سارا حال معلوم کر لیتے تھے۔ جب کھیتی پکنے پر آتی تو اس وقت ضبط کی نوبت آتی اور آنکھیں بدل کر حکومت جمانے لگتے تھے۔ آخر پر خبط پر اُتر آتے تھے یعنی جو کچھ بھی ملتا اس کو لے بھاگتے تھے اور کبھی کسانوں پر غالب آجاتے۔ غرض کہ ہر صورت سے سرکاری مال گزاری وصول کر کے ہی پیچھا چھوڑتے تھے۔

سیانے کے گو، تین جگہ

دیکھیے: زیادہ ہوشیار تین جگہ چڑے۔

سیف تو پٹ پڑی تھی پر نیچہ کاٹ کر گیا

دیکھیے: سیف تو پٹ پڑی تھی مگر قبضہ کام آگیا۔

سیف تو پٹ پڑی تھی مگر قبضہ کام آگیا

جس پر بھروسا تھا وہ تو کام نہ آیا مگر ایک ادنیٰ شخص سے کام نکل گیا۔ جب کسی بڑے سے کام نہ ہو سکے اور اس سے چھوٹا وہی کام کر دے تو اس موقع پر اس مثل کا استعال کیا جاتا ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب یہ واقعہ ہے:

واقعہ: کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب سیف اللہ خاں اپنے بیٹے کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ دوسری جانب سے ایک آزاد فقیر اپنی دھن میں چلا آ رہا تھا۔ اس نے نواب کو دیکھ کر سوال کیا کہ او بابا سیفو کوئی چنا دلوا۔ نواب نے اس کے سوال پر کوئی توجہ نہیں کی بلکہ اس کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ نواب کے لڑکے کو اس فقیر پر ترس آ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک اشرفی نکالی اور اس فقیر کو دے دی۔ اس پر فقیر نے خوش ہو کر کہا:

''سیف تو پٹ پڑی تھی مگر قبضہ کام آگیا یا سیف تو پٹ پڑی تھی پر نیچہ کاٹ کر گیا۔''

سیکھ واکو دیجیے جاکو سیکھ سہائے
سیکھ نہ دیجیے باندرا جو بئے کا گھر جائے

نصیحت اس کو دینی چاہیے جو اس کا اہل ہو اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے شخص کو نصیحت نہ کرنا چاہیے جو اس کا اثر قبول کرنے کے بجائے برا مانے اور اپنی ناراضگی کا اظہار کرے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک لوک کہانی مشہور ہے جو معمولی فرق کے ساتھ دو طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: مہاوٹ کی رت تھی۔ برفیلی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے، رات ہو چکی تھی، ایک بندر کسی درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا سردی کی وجہ سے کانپ رہا تھا اور رہ رہ کر کیاؤں کیاؤں کی درد بھری آوازیں نکال رہا تھا۔ اسی درخت کی ایک شاخ پر ایک بئے کا گھونسلا تھا۔ وہ حفاظت اور آرام سے اپنے گھونسلے میں سکھ کی نیند سو رہا تھا۔ بندر کی درد بھری آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو بندر پر ترس آ گیا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بئے کے چھوٹے سے گھونسلے میں بندر کا گزر کیوں کر ہو سکتا تھا۔ بئے نے بندر کے ساتھ اظہار ہمدردی کے طور پر کہا:

''بھائی باندرا! آج کی رات تو بڑی کٹھور ہے۔ برفیلی ہوائیں چل رہی ہیں، سردی سے سارا بدن ٹھٹھرا جا رہا ہے۔ ابھی پہاڑ سی رات باقی ہے، میرا دل لرزتا ہے، سورج کی گرمی پھیلنے تک تمہارا کیا حال ہوگا مگر مجھے نہایت افسوس اور ندامت ہے کہ میں تمہاری اس بپتا میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر میرا گھونسلا بڑا ہوتا تو میں تمہیں اپنے گھونسلے میں اندر بلا لیتا کیا کروں؟ اصل بات یہ ہے کہ تمہارا جسم مجھ سے بڑا ہے۔ تمہارے چار ہاتھ پاؤں ہیں، تیز دانت ہیں۔ تم میں طاقت بھی زیادہ ہے اور پھر تم بالکل آدمی سے ملتے جلتے ہو۔ مجھے دیکھو کہ میں ذرا سا ہوں مگر میں نے اپنے رہنے کے لیے کتنا اچھا اور مضبوط گھر بنالیا ہے۔ پانی کی ایک بوند بھی اس کے اندر نہیں آسکتی۔ آندھی کے جھونکے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے اسے ایسی مضبوطی سے پیڑ پر جمایا ہے کہ چاہے اولے پڑیں یا طوفان آئے میرا گھونسلا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ میں ایسی سردی میں بھی اس لیے آرام سے ہوں کہ میں نے پہلے سے انتظام کر لیا تھا مگر تم نے اپنی طاقت اور عقل سے کام نہیں لیا۔ سارا وقت بے کار گنوا دیا۔ اگر تم بھی اپنے لیے کوئی گھر یا ٹھکانہ پہلے سے

بنا لیتے تو اس وقت کیوں تکلیف اٹھاتے۔"
بندر نے بئے کی ان نصیحت آمیز اور ہمدردانہ گفتگو کو سنا تو غصے سے بھڑک اٹھا۔ شاخ سے تمتماتا ہوا کودا اور کہنے لگا:

"تو بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بناتا ہے۔ چھوٹا ہو کر بڑوں کو نصیحت کرتا ہے۔ تجھے بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں تجھے ابھی سلیقہ سکھاتا ہوں اور ایسا سبق دیتا ہوں کہ آج سے بڑھ چڑھ کر باتیں کرنا چھوڑ دے گا۔"

یہ کہہ کر بندر نے بئے کے گھونسلے کو نوچ کر پھینک دیا۔ بیا دیکھتا رہ گیا، وہ کر بھی کیا سکتا تھا، غمزدہ ہو کر اس نے اتنا ہی کہا:

"سیکھ واکو دیجئے جا کو سیکھ سہائے، سیکھ نہ دیجئے باندرا جو بئے کا گھر جائے۔"

دوسری حکایت معمولی فرق کے ساتھ اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۲: کسی درخت پر ایک بندر اور ایک بیا ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ان میں آپس میں دوستی بھی تھی۔ برسات کا موسم آنے والا تھا۔ بئے نے اپنے رہنے اور برسات کے پانی سے بچاؤ کیلئے ایک مضبوط اور محفوظ گھونسلا اسی درخت پر بنا لیا تھا۔ بئے نے ایک روز ازراہ ہمدردی بندر سے کہا:

"بھائی باندرا! برسات آنے والی ہے تم بھی اپنے رہنے اور بارش وغیرہ سے بچنے کے لیے ایک گھر بنا لو۔"

بندر نے جواب دیا:

"مجھے گھر بنانا نہیں آتا ورنہ میں گھر بنا لیتا۔"

بئے نے کہا:

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تمہیں ابھی گھر بنانا سکھائے دیتا ہوں۔"

بئے نے بندر کو گھر بنانے کی جب ساری ترکیب بتا دی تو بندر اٹھا اور اس نے بئے کا گھونسلا اُجاڑنا شروع کر دیا۔ اس کے گھونسلے میں لگے سامان سے اپنے گھر کو بنانا شروع کر دیا۔ بیا ہائے ہائے کرتا رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ادھر سے کوئی جانور گزرا تو اس نے بئے کی افسردہ صورت دیکھ کر حال پوچھا تو بئے نے بس اتنا ہی کہا کہ:

"سیکھ واکو دیجئے، جا کو سیکھ سہائے، سیکھ نہ دیجئے باندرا جو بئے کا گھر جائے۔"

سینگ سڑ پے تو لالا جی کے سنگ گئے، اب تو دیکھو اور کھاؤ

بخیل سے بڑھ کر بخیل، یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی کنجوس کے وارث یا متعلقین اس سے بھی زیادہ کنجوس ہوں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک لالا جی رہتے تھے۔ ان کے پاس اچھی خاصی دولت اور ملکیت تھی مگر وہ تھے بہت کنجوس۔ پیسہ خرچ کرنے میں ان کی جان نکلتی تھی۔ ایک بار لالا جی نے اپنے دل کو مضبوط کر کے گھی خریدا اور اس کو ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ اس کے بعد لالا جی نے گھر کے ہر فرد کو بلا کر حکم دیا:

''کہ تم لوگ جب کھانا کھایا کرو تو اس ڈبے سے اپنے کھانے میں گھی ڈال لیا کرنا۔ یہ گھی تم ہی سب کے لیے ہے مگر دھیان رہے کہ جلدی ختم نہ ہو جائے۔ تم لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں سینگ لے کر اس گھی میں ڈبو لیا کرنا۔ سینگ میں جتنا گھی آ جائے اپنے اپنے کھانوں میں ڈال لیا کرنا۔ اس طرح گھی کچھ دن چل جائے گا۔''

کچھ دن کے بعد لالا جی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب لالا جی کے بڑے بیٹے پر ذمہ داریاں آ گئی تھیں۔ وہ لالا جی سے بھی زیادہ کنجوس نکلا۔ اس نے گھی کے ڈبے میں تالا بند کر دیا اور گھر والوں کو حکم دیا:

''سینگ کا گھی تو لالا جی کے ساتھ گیا اب تم صرف اس ڈبے کو دیکھ کر ہی تسلی کر لیا کرنا۔''

اسی وقت یہ مثل وجود میں آ گئی کہ:

''سینگ سڑ پے تو لالا جی کے سنگ گئے، اب تو دیکھو اور کھاؤ۔''

شک کی ڈائن، بھے کا بھوت

دیکھیے: بھے کا بھوت، شک کی ڈائن۔

شوربا حلال، بوٹی حرام

ایک حصہ جائز دوسرا حصہ ناجائز۔ یہ کہاوت اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی حرام چیز کا ایک حصہ استعمال کر لے اور دوسرے حصہ کو ناجائز سمجھ کر استعمال کرنے سے گریز کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: برٹش حکومت کے زمانے میں ایک مولوی صاحب کی چھوٹی بہن نے عیسائی مذہب قبول کرلیا اور ایک انگریز سے شادی بھی کرلی۔ بزرگ اس کے اس فعل سے بہت برہم ہوئے مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ ان کے دوستوں نے ان کی ذہنی کوفت کو دور کرنے کی غرض سے سمجھایا:

''بھائی! نیا زمانہ ہے، نئی نسل کے نئے خیالات ہیں۔ ان باتوں کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟ سب کو آزادی حاصل ہے۔ ہم لوگ بھی یہ رنگ ڈھنگ دیکھ رہے ہیں۔ مگر کیا کریں؟ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم۔''

اس واقعہ کے چند دن بعد بہن نے بھائی کو کھانے کی دعوت دی تو حضرت پس وپیش میں پڑ گئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد جانے کا من بنالیا۔ لباس زیب تن کیا اور فاتحانہ انداز میں اپنی مخصوص چھڑی لے کر بہن کے یہاں پہنچ گئے۔ میز پر کھانا چنا گیا۔ سالن میں صرف قورما تھا۔ بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔ شوربے ہی میں روٹی کھاتے رہے، بوٹی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بہن نے کہا:

''بھائی صاحب یہ تو ذبیحہ ہے، بوٹیاں بھی کھایئے۔''

بھائی نے آہستہ سے جواب دیا:

''مجھے پتا ہے، تمہارے یہاں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر کئی روز سے میرے مسوڑھوں میں درد ہے۔ ان میں چھن سی ہورہی ہے۔''

خیر، جب وہ کھانا کھاکر اپنے گھر واپس آئے تو ان کے دوست وہاں کا ماجرا سننے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ دوستوں کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا:

''میں تو کرسٹان ہوتے ہوتے بچ گیا۔''

دوستوں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

فرمانے لگے:

''بس میرا علم میرے کام آگیا ورنہ آج تو ایمان ہی چلا گیا تھا۔ کھانے میں سور کے گوشت کا قورما تھا اور ہمارے نزدیک سور کا گوشت حرام ہے۔ کسی کی دل آزاری بھی گناہ ہے۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است میں نے گوشت کی بوٹی کو ہاتھ تک نہیں لگایا صرف شوربے سے روٹی کھاتا رہا۔ اس طرح بہن بہنوئی کی دل جوئی بھی کردی اور اپنا ایمان بھی بچالیا۔''

دوستوں نے طنز بھرے لہجے میں کہا:

''کیا کہنا۔شور با حلال اور بوٹی حرام۔''

شیخ نے کچھوے کو بھی دغا دی ہے

شیخ حد درجہ ہوشیار اور چالاک ہوتے ہیں۔ان کی چالاکی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔بڑے سے بڑے ہوشیار بھی ان سے مات کھا جاتے ہیں۔اس مثل کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح مشہور ہے:

کہانی: ایک شیخ صاحب سفر کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔راستے میں ایک دریا پڑ گیا۔وہ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر پار اترنے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔اتنے میں ایک بڑا کچھوا دریا کے کنارے آیا۔ شیخ صاحب کو فکرمند دیکھ کر اس نے پوچھا:

''آپ کس فکر میں غلطاں ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا:

''مجھے اس پار جانا ہے۔بھائی! دریا پار کرنے کی تدبیر سوچ رہا ہوں۔''

کچھوے نے کہا:

''اگر میں آپ کے کام آسکوں تو خود کو بڑا خوش نصیب سمجھوں گا۔اگر میں آپ کو پار کردوں تو آپ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

شیخ جی فوراً بولے:

''اس شکرانے میں ایک جانور ذبح کروں گا۔تم اس کا گوشت کھا لینا۔''

کچھوا اس شرط پر راضی ہو گیا۔اس نے شیخ کو اپنی پشت پر بٹھایا اور تھوڑی ہی دیر میں دریا کے پار اتار دیا۔اب کچھوے نے شیخ صاحب سے کہا:

''جو میرا کام تھا وہ میں نے کر دیا۔اب آپ اپنا وعدہ ایفا کیجیے۔''

شیخ صاحب نے فوراً اپنے سر میں سے ایک جوں نکال کر چٹ سے ناخن پر رکھ کر مار دی اور یہ کہہ کر چلتے بنے کہ:

''دیکھ میں نے اس جانور کو اپنے وعدے کے مطابق ذبح کر دیا ہے۔''

اسی روز سے اس فقرہ نے کہاوت کی شکل اختیار کر لی۔

شیخ نے کوّے کو بھی دغا دی ہے

اس کہاوت کے معانی، مطالب اور استعمال کا طریقہ بالکل وہی ہے جو" شیخ نے کچھوے کو بھی دغا دی ہے" کہاوت کا دیکھیے: شیخ نے کچھوے کو بھی دغا دی ہے۔

اس کہاوت کے پس منظر میں بھی ایک لوک کہانی اس طرح مشہور ہے:

کہانی: کوا تمام جانوروں میں سب سے زیادہ ہوشیار اور چالاک مانا جاتا ہے۔ لیکن شیخ اس سے بھی زیادہ چالاک ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک شیخ نے کوے کو پکڑنے کے لیے ایک انوکھی تدبیر کی۔ وہ اپنے منہ میں روٹی کا ایک ٹکڑا داب کر، مردہ کی طرح زمین پر لیٹ گیا۔ گھر کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوے نے سوچا کہ یہ شخص روٹی کھاتے کھاتے مرگیا ہے۔ وہ فوراً منڈیر سے اترا اور جوں ہی روٹی لینے کے لیے اپنی چونچ ماری۔ شیخ نے اپنے منہ سے اس کی چونچ کو مضبوطی سے پکڑلیا۔ کوا پھڑ پھڑانے لگا۔ اس نے ایک چال چلی اور شیخ سے پوچھا: "آپ کی ذات کیا ہے؟"

شیخ سمجھ گیا کہ کوا بہت چالاک ہے۔ یہ مجھ سے اس لیے میری ذات پوچھ رہا ہے کہ میں اپنا منہ جیسے ہی کھولوں اور یہ اڑ جائے۔ لہٰذا شیخ نے اپنا منہ بند کیے ہوئے ہی کہا:

"شیخ ہوں شیخ۔"

شیخوں کی شیخی، پٹھانوں کی ٹر

دیکھیے: شیخوں کی شیخی پٹھانوں کی ٹر، یہاں نہ دھوئیں گے، دھوئیں گے گھر۔

شیخوں کی شیخی پٹھانوں کی ٹر، یہاں نہ دھوئیں گے، دھوئیں گے گھر

شیخوں کی ڈینگ اور پٹھانوں کی ٹر مشہور ہے۔ پٹھان ٹرے یا کھرے ہوتے ہیں۔ وہ جس بات پر اڑ جاتے ہیں اسے پورا کر کے ہی رہتے ہیں خواہ اس میں ان کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ اس کہاوت کی حکایت سے پٹھانوں کی عادت وفطرت کا پتا چلتا ہے۔

حکایت: برسات کا موسم تھا۔ کوئی پٹھان ایک گاؤں سے لوٹ کر اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔ جنگل کا راستہ تھا، چلتے چلتے اسے پاخانہ کی حاجت محسوس ہوئی۔ اس نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں

دوڑائیں۔ تھوڑی ہی دور پر اسے ایک تالاب نظر آیا۔ وہ اس تالاب کے قریب پہنچا اور ایک جھاڑ دار درخت کی آڑ میں پاخانہ کرنے کیلئے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد آب دست کے لیے جوں ہی وہ تالاب کے کنارے بیٹھا کہ ایک مینڈک نے ''ٹر'' کر دیا۔ مینڈک کی اس حرکت سے پٹھان کو طیش آ گیا۔ وہ بغیر آب دست کے یہ کہتا ہوا اٹھ کر چل دیا کہ:

''یہاں نہ دھوئیں گے دھوئیں گے گھر۔''

شیطان کا شیرہ رنگ لایا

دیکھیے: شیطان کا لاسہ رنگ لایا۔

شیطان کا لاسہ رنگ لایا

ذرا سی حرکت سے فساد برپا ہو گیا۔ جب کوئی شخص ایسی نامعلوم بات یا حرکت کر کے خود تو الگ ہو جائے اور دوسرے لوگ جس سے پریشانی اور زحمت میں پڑ جائیں تو یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی طرح مشہور ہے:

حکایت: اپنی کارستانی کا مظاہرہ کرنے کیلئے شیطان نے ایک روز فقیر کا بھیس بدلا اور ایک حلوائی کی دوکان پر جا کر بھیک مانگنے لگا۔ صبح کا وقت تھا، حلوائی بیٹھا ہوا جلیبیاں بنا رہا تھا۔ ایک برتن میں رات کی جلیبیوں کا بچا ہوا شیرہ رکھا تھا۔ حلوائی نے بے پروائی کے ساتھ فقیر سے کہا:

''چاہے صبح ہو یا شام ہر وقت فقیروں کا پھیرا رہتا ہے۔ نہ کام دیکھتے ہیں نہ وقت۔ انہیں روٹی بھی چاہیئے اور کھانے کیلئے مٹھائی بھی، چلو آگے بڑھو۔ دوسری دوکان دیکھو۔''

فقیر نے جواب دیا:

''بابا ہم تو آگے بڑھتے ہی رہتے ہیں مگر تم بھٹی پر ہی جمے رہو تو ہم جانیں۔''

حلوائی نے کہا: ''زیادہ ٹر ٹر نہ کر، اپنا راستہ ناپ۔''

فقیر نے فوراً جواب دیا: ''تولنے کا کام تم کرتے ہو اور مجھے ناپنے کا کام بتاتے ہو۔ لاؤ ناپنے کے لیے کچھ دے دو۔''

حلوائی اب تک نہایت جھلا گیا تھا۔ اس نے اس جھلاہٹ میں ایک پتلا ڈنڈا جو کتے بلی مارنے

کے لیے تھا، فقیر کے سامنے ڈال دیا۔ فقیر نے اس ڈنڈے کو اٹھالیا اور جلدی سے شیرے کے برتن میں ڈبو کر حلوائی کی چوکی کے اوپر دیوار پر شیرہ لگا کر ڈنڈے کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ حلوائی نے فقیر کی طرف غصے سے دیکھا اور جلیبی بنانے میں لگ گیا۔ اسی درمیان فقیر نے جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے حلوائی سے کہا:

''لے بابا! راستہ ناپ دیا۔''

فقیر تو وہاں سے چلا گیا لیکن دیوار پر جہاں اس نے شیرہ لگا دیا تھا وہاں مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ کچھ مکھیوں کے تو پر بھی شیرے میں چپک گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک چھپکلی چھت سے کھسک کر مکھیوں کی تاک میں دیوار پر آگئی اور اس نے مکھیوں کا شکار شروع کر دیا۔ اتفاق سے ایک بلی حلوائی کی چوکی کے نیچے بیٹھی تھی۔ چھپکلی کو دیکھ کر اس نے چھلانگ لگا دی اور چھپکلی کو منہ میں داب کر چوکی پر گر پڑی۔ اسی اثنا میں ایک فوجی گرما گرم جلیبی خریدنے کے لیے حلوائی کی دوکان کے سامنے آکر رک گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا پالتو شکاری کتا بھی تھا۔ وہ یکا یک بلی پر جھپٹا۔ بلی اپنی جان بچانے کے چکر میں جلیبی کے کڑھاؤ میں جا پڑی جس سے گرم گرم شیرہ حلوائی کے ہاتھوں اور گھٹنوں پر پڑا۔ گھی اور جلیبیوں کا ستیاناس ہو گیا۔ حلوائی نے غصے میں بھٹی سے جلتی ہوئی لکڑی نکال کر زور سے کتے کے جما دی۔ کتا کیاؤں کیاؤں کرتا ہوا فوجی کے قدموں پر آگرا۔ فوجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ حلوائی کا گریبان پکڑ کر دوکان سے باہر کھینچ لیا اور نیچے گرا کر خوب پٹائی کی۔ یہ منظر دیکھ کر بازار کے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ایک دوسرے سے ہر شخص پوچھ رہا تھا کہ:

''کیا ہوا؟ یہ فساد کیوں برپا ہوا۔''

ایک آزاد منش جو کافی دیر سے تازہ جلیبیاں لینے کے لیے کھڑا تھا، کہنے لگا:

''شیطان کا لاسہ رنگ لایا یا شیطان کا شیرہ رنگ لایا۔''

شیطان نے بھی لڑکوں سے پناہ مانگی ہے

لڑکوں سے شیطان بھی ہار گیا ہے۔ شرارت کرنے میں لڑکے شیطان سے بھی آگے ہوتے ہیں۔

اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی لڑکا اودھم مچائے، اپنی شرارت سے کسی کو پریشان کرے اور کسی طرح بھی نہ مانے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک لوک کہانی کچھ اس طرح مشہور ہے:

کہانی: شیطان جس نے دنیا کے چپے چپے میں فتنہ و فساد برپا کر دیا ہے۔ جس نے جنت میں حوا کو بہکایا۔ جس نے اپنی عیاری اور مکاری کے تیر اللہ کے برگزیدہ بندے پر بھی چلائے۔ اس نے ایک دن

لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کا ارادہ کیا۔ یہ سوچ کر کہ دیکھیں لڑکے اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں گدھے کی شکل میں ان کے بیچ پہنچ گیا۔ لڑکے اپنے بیچ گدھے کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ چار بچے آناً فاناً اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔ دو بچوں نے اس کے کان پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لڑکا جو اس کی پیٹھ پر چڑھ کر سواری کرنا چاہتا تھا، چار لڑکوں کے پہلے ہی سوار ہو جانے کے سبب مایوس ہو گیا کیوں کہ گدھے کی پیٹھ پر بیٹھنے کے لیے اب بالکل جگہ نہ تھی۔ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے پاس پڑے ہوئے بانس کو اٹھایا اور اس کی دم میں باندھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ بانس بندھا ہونے کے سبب دم پیٹھ کی سطح میں ہو گئی تھی۔ لڑکے کے اس پر بیٹھ جانے سے شیطان کی دم میں بہت تکلیف ہونے لگی۔ جب تھوڑی دیر میں تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ ہار مان کر سر پیر رکھ کر رفو چکر ہو گیا۔

طویلے کی بلا بندر کے سر

ایک کی آفت دوسرے کے سر۔ قصور کسی کا اور مارا کوئی جائے۔ ہر ایک بلا اور بہتان بے زبان اور مسکین کے سر جاتی ہے۔ جب کئی لوگوں کی آفت ایک کے سر پڑے، قصور کسی کا ہو اور سزا کسی کو ملے تو اس موقع پر اس مثل کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک عقیدہ ہے:

عقیدہ: اس عقیدہ کے مطابق اگر کسی طویلے (گھوڑوں کا تھان یعنی اصطبل) میں بندر کو باندھ کر رکھا جائے تو طویلہ نظر بد اور آفات سماوی سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے ہر ایک طویلے میں ایک بندر ضرور باندھ کر رکھا جاتا تھا۔

عید بعد ٹر

دیکھیے: عید کے پیچھے ٹر۔

عید پیچھے ٹر

دیکھیے: عید کے پیچھے ٹر۔

عید کے پیچھے ٹر

موقع اور محل نکل جانے کے بعد کسی کام کے کرنے یا محل کسی کام کے کرنے پر اس کہاوت کا

استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب عید کے تیوہار کے بعد پنجاب میں منعقد ہونے والا ایک میلہ ہے۔

حکایت: ٹر پنجاب کا ایک میلہ تھا جو عید کے دوسرے روز باغوں میں جا کر منایا جاتا تھا۔ ایام غدر میں جو سپاہی دہلی میں آئے تو انہوں نے فتح کے بعد دہلی میں بھی یہ میلہ مقرر کر دیا جو نہایت اہتمام اور بڑے دھوم دھام سے ہونے لگا۔ عید کے دوسرے روز شاہی زمانے سے یہ میلہ عیش باغ لکھنؤ میں بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس میلے میں خاص طور سے افیونی، مدکیے، چرسیے وغیرہ اور اسی قسم کے دوسرے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ٹولیوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور داستانِ امیر حمزہ بیان کرتے ہیں۔ افیون، چرس، مدک وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اب اس میلے میں پہلا جیسا زور نہیں رہا۔ دور حاضر میں ٹر کا یہ میلا کانپور اور ہندوستان کے دیگر کئی شہروں میں منایا جانے لگا ہے۔ چوں کہ عید کے تہوار کے دوسرے دن لوگ ٹر کے میلے میں خوشیاں مناتے ہیں اسی لیے اس کا استعمال موقع اور محل نکل جانے کے بعد کام کرنے کیلئے کیا جانے لگا۔

عید کے پیچھے ٹر، برات پیچھے دھونسا

دیکھیے: عید کے پیچھے ٹر۔

غرور کا سر نیچا

غرور کرنے والا ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ گھمنڈی کا گھمنڈ چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص اپنی دولت و ثروت یا طاقت وغیرہ پر ناز کرے اور دوسرے کو ذلیل و حقیر سمجھے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: دو مرغ ایک جگہ رہتے تھے ایک مرغ کچھ کمزور تھا اور دوسرا طاقتور۔ طاقتور مرغ کو اپنی قوت پر حد درجہ غرور تھا۔ وہ ہر وقت گھمنڈ میں نشے میں چور رہتا تھا اور اکثر کمزور مرغ کو پریشان کیا کرتا تھا۔ ایک دن طاقتور مغرور مرغ نے کمزور مرغ کو مار مار کر رہنے کی جگہ سے بھگا دیا۔ اس نے اپنی چونچ مار مار کر اسے کئی جگہ زخمی بھی کر دیا تھا۔ کمزور مرغ مار کھا کر ایک کونے میں اپنے سر کو چھپا کر دبک گیا۔ مغرور مرغ تمکنت کے ساتھ ایک دیوار پر جا بیٹھا۔ اس نے اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا اور فتح مندی کے جذبے میں

زور سے بانگ دی۔ اتنے میں ایک عقاب ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور جھپٹ کر اسے اپنے پنجے میں داب لیا۔ جس وقت عقاب اس کو لے کر اُڑا تو مرغ کی ٹانگیں اس کے پنجے میں تھیں اور سرزمین کی طرف لٹک رہا تھا۔ کمزور مرغ کونے سے نکلا اور مغرور مرغ کو دیکھ کر بولا:

''غرور کا سر نیچا۔''

فارسی ہے تو واہ واہ

بالکل غافل اور انجان۔ جب کوئی شخص کسی چیز کی ناواقفیت پر واقفیت کا فخریہ اظہار کرے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس بات سے خوش ہو کر کہ اس کی ہی مرضی کی بات ہو رہی ہو بھلے ہی وہ اس سے ناواقف ہو تو بھی اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے، جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک بزرگ کے مزار پر عرس ہو رہا تھا۔ بہت سے مریدین، معتقدین وغیرہ جمع تھے۔ قوالیاں ہو رہی تھیں لوگ وجد میں جھوم رہے تھے۔ لوگ قوال کو انعام واکرام سے نواز رہے تھے۔ قوال نے سب سے پہلے حمد پڑھی، امیر بھی تھے غریب بھی، چھوٹے بھی تھے بڑے بھی۔ ہر شخص اپنے علم اور اپنی سمجھ کے مطابق قوال کو داد دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد فرمائشی دور شروع ہوا۔ کسی نے اپنی پسند کی قوالی سننے کی فرمائش کی، کسی نے ہندی زبان کی منقبت سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک صاحب نے فارسی زبان کی قوالی سننے کی فرمائش کی۔ لوگوں کو فرمائش کرتے دیکھ کر ایک ان پڑھ اور نادان مرید نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر میں اس وقت فرمائش نہیں کروں گا تو لوگ مجھے نااہل اور نافہم سمجھیں گے۔ لہٰذا وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر قوال سے کہنے لگا۔ اے بھائی قوال فارسی میں کوئی چیز سنا دو۔ اتفاق سے قوال اس وقت فارسی کی ایک منقبت پڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا: ''حضور والا! میں اس وقت فارسی ہی کی قوالی پڑھ رہا ہوں۔''

یہ سن کر اس شخص نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکالا اور قوال کو دے کر بولا:

''فارسی ہے تو واہ واہ۔''

فائدہ جس میں ہو، وہ کام کرے

اسی کام کو کرنا چاہیے جس میں فائدہ نظر آئے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص

اس وقت تک کوئی کام نہ کرے۔ جب تک اس کو اس کام میں فائدہ نظر نہ آئے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک مرتبہ کسی بنیے نے ایک لڑکے کو گود میں لیا۔ کسی نے بنیے کی ذات برادری والوں سے کہہ دیا کہ جس لڑکے کو اس بنیے نے گود لیا ہے وہ کسی اور ذات کا ہے۔ برادری والوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے طے کیا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ہماری برادری میں چلے گا کیوں نہ اس کو مقدمہ قائم کر کے جدا کرا دیا جائے۔ اس کے بعد برادری کے لوگوں نے عدالت میں مقدمہ قائم کر دیا کہ یہ لڑکا بنیے کا نہیں ہے اس لیے اسے کوئی بنیا گود نہیں لے سکتا۔ حاکم نے مقدمہ کی سماعت کے بعد فیصلہ سنا کر لڑکے سے کہا:

''تم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ تم کو سولی پر چڑھنا منظور ہے کہ پھانسی کے پھندے میں جھولنا۔''

لڑکے نے حاکم سے کہا: ''فائدہ جس میں ہو وہ کام کرو۔''

لڑکے کا یہ جواب سن کر منصف نے اپنے فیصلے کو بدلتے ہوئے کہا:

''ثابت ہو گیا کہ یہ لڑکا بنیے کا ہے، کسی اور کا نہیں۔ کیوں کہ بنیا بے بنیاد ہو یا بنیے کا لڑکا، اپنے ہر کام میں فائدہ ہی دیکھتا ہے۔ بغیر فائدہ کے کوئی کام نہیں کرتا۔ یہ موت کی سزا میں بھی فائدہ تلاش کر رہا ہے۔''

قاضی کی مونج، کبھی نہ چھوڑے پیچھا

بلاوجہ ذمہ داریاں عائد ہونا۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب کسی کے ذمہ ناحق کی پچر لگا دی جائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک واقعہ ہے جو اس طرح ہے:

واقعہ: کہا جاتا ہے کہ شہر کے قاضی کے مکان میں ان کے ایک دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی موضوع پر آپس میں بات چیت ہو رہی تھی۔ کسی سرکاری کام کے لیے اس وقت مونج کی ضرورت ہوئی۔ قاضی جی نے کسی ملازم کو مونج لانے کیلئے بازار بھیجا۔ اتفاقاً تمام بازار میں جب مونج نہ ملی تو اس نے قاضی جی سے آکر کہا۔ قاضی جی کے پاس بیٹھے ان کے دوست نے کہا:

''پریشان نہ ہوئیے، میرے گھر میں مونج موجود ہے، جتنی درکار ہو منگوا لیجئے۔''

چنانچہ قاضی جی نے اپنے ملازم کو ان کے یہاں بھیج کر بقدر ضرورت مونج منگوا لی۔ قاضی کے

مقتدی نے دفتر میں لکھ دیا کہ اس قدر مونج سرکاری کام کے لیے فلاں شخص کے گھر سے منگوائی گئی ہے۔ جب ایک مدت کے بعد اس منصب پر کوئی اور قاضی مامور ہوا اور اس کو سرکاری کام کے لیے مونج درکار ہوئی تو اس نے دفتر سے معلوم کرایا کہ اس سے پہلے مونج کہاں سے منگوائی گئی تھی؟ دفتر والوں نے بتایا کہ فلاں شخص کے یہاں سے مونج منگوائی گئی تھی۔ لہٰذا اس نے بھی اسی شخص کے یہاں سے مونج منگوائی اور اس مونج کا خرچ اس غریب کے ذمہ رہا۔ قاضی بدلتے رہے مگر مونج اسی شخص کے یہاں سے منگوانے کا سلسلہ جوں کا توں رہا۔ جب ہی یہ مثل وجود میں آگئی کہ:

''قاضی کی مونج کبھی نہ چھوڑے پیچھا۔''

قافیہ نہ ملے گا، بوجھ سے تو مرے گا

اوٹ پٹانگ بات، یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص بے تکی، بے سر پیر کی یا احمقانہ بات کہے۔ اس کہانی کے پس منظر میں ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں جاٹ اور تیلی رہتے تھے۔ ان میں آپس میں بہت دوستی تھی اور ہنسی مذاق بھی ہوا کرتی تھی۔ ایک بار کی بات ہے کہ جاٹ اور تیلی ایک ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راہ چلتے بات چیت کرتے ہوئے تیلی نے ایسے ہی جاٹ کو چھیڑنے کے لیے کہہ دیا:

''جاٹ رے جاٹ، تیرے سر پہ کھاٹ۔''

جاٹ نے فوراً پلٹ کر اس سے کہا:

''تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولہو۔''

تیلی نے جواب دیا:

''قافیہ تو ملا نہیں یعنی تک تو ملی نہیں۔''

اس پر جاٹ نے کہا:

''اس سے کیا؟ قافیہ نہ ملے گا بوجھ سے تو مرے گا۔''

قلادہ در گردن شتر

دیکھیے: اونٹ کے گلے میں بلی۔

کابل گئے مغل بن آئے، بولنے لگے بانی
آب آب کر مر گئے، سرہانے دھرا رہا پانی

دیکھیے: آب آب کر مر گئے سرہانے دھرا رہا پانی۔

کابل گئے مغل ہو آئے، بولے اٹ پٹ بانی
آب آب کر مر گئے، سرہانے دھرا رہا پانی

دیکھیے: آب آب کر مر گئے سرہانے دھرا رہا پانی۔

کار بوزینہ نیست نجاری

بندر کا کام آرہ کشی نہیں۔ ہر کام ہر شخص نہیں کر سکتا یعنی جو جس کام میں ماہر ہوتا ہے وہی اسے خوب کرتا ہے، دوسرے نہیں کر سکتے۔ اس مشہور ضرب المثل مصرع میں ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے، جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کسی جگہ ایک بڑھئی ایک موٹی لکڑی پر بیٹھ کر اس کو چیر رہا تھا اس کے پاس دو کیلیں تھیں۔ ایک لکڑی کے شگاف میں ٹھونکتا تا کہ اسے چیرنا آسان ہو جائے اور آرے کے آنے جانے کا راستہ کشادہ ہو جائے۔ اس کے بعد لکڑی چیرنا شروع کر دیتا جب تھوڑی لکڑی چر جاتی تو دوسری کیل ٹھونک دیتا اور پہلی کیل کو نکال لیتا۔ اسی طریقے سے وہ لکڑی کو مسلسل چیر رہا تھا۔ پاس کے درخت پر ایک بندر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی اور حیرت سے بڑھئی کے لکڑی چیرنے کے طریقے کو دیکھ رہا تھا۔ کام کرتے کرتے کسی ضرورت کے تحت لکڑی کو یوں ہی چھوڑ کر بڑھئی کہیں چلا گیا۔ بندر نقل کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ بندر درخت سے اتر کر لکڑی کے پاس آیا اور لکڑی چیرنے کے ارادے سے لکڑی کو ٹھونکا۔ اس نے دوسری کیل ٹھونکے بغیر شگاف سے پہلی کیل نکال لی۔ کیل نکلتے ہی لکڑی کے دونوں پاٹ نہایت ہی سرعت کے ساتھ آپس میں مل گئے اور اس کا پیر لکڑی کے درمیان میں جکڑ گیا۔ بے چارہ بندر درد سے پریشان ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ بندر کی اس حالت کو دیکھ کر جب کچھ لوگ وہاں جمع ہو گئے تو ان کی طرف مخاطب ہو کر بندر

نے رورو کر درد بھری آواز میں کہا:

''میرا کام پھل چننا ہے نہ کہ آرہ کھینچنا۔ میرا پیشہ جنگل کا تماشہ دیکھنا ہے نہ کہ کلہاڑی اور بسولا چلانا۔''

آخر کار تھوڑی دیر کے بعد بندر اپنی اس بیہودہ حرکت کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو گیا۔ اس موقع پر کسی نے کہا:

''کار بوزینہ نیست نجاری یعنی بندر کا کام بڑھئی گیری نہیں ہے۔''

کالی بھلی نہ سیت

دیکھیے: کالی بھلی نہ سیت، دونوں مارو ایک ہی کھیت۔

کالی بھلی نہ سیت، دونوں مارو ایک ہی کھیت

دونوں کو ایک ہی سا سمجھو۔ سگ زرد، برادر شغال، موذی موذی سب برابر۔ مفسد اور جھگڑالو آدمیوں کے لیے اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر دو برے اشخاص یا دو بری چیزوں سے واسطہ پڑ جائے تو دونوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک قصہ ہے جو معمولی فرق کے ساتھ دو طرح سے مشہور ہے:

حکایت ۱: کسی شخص کی دو بیویاں تھیں جن میں نہایت دشمنی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو خوش نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ یہ دونوں ساحرہ یعنی جادوگرنیاں تھیں۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے جادو کے اثر سے ایک بیوی نے اپنے آپ کو کالی چیل بنایا اور دوسری بیوی نے اپنے تئیں سفید چیل کا روپ اختیار کیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے سے جھپٹ جھپٹ کر لڑنے لگیں۔ شوہر ان کو اس روپ میں لڑتے جھگڑتے دیکھ کر حیرت پڑ گیا۔ اس نے ان کو جادوگرنیاں یقین کر کے اور اس خیال سے کہ یہ دونوں کہیں اسے ہی گزند نہ پہنچائیں کالی بھلی نہ سیت، دونوں مارو ایک ہی کھیت کہہ کر دونوں کو ایک ساتھ قتل کر کے قصہ تمام کر دیا۔

اس کہاوت کے پس منظر میں دوسری حکایت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس طرح مشہور ہے:

حکایت ۲: ایک راجا کی دو رانیاں تھیں۔ دونوں بدکردار اور جادوگرنیاں تھیں۔ وہ دونوں ایک

دوسرے سے بغض و عناد رکھتی تھیں۔ ایک دوسرے کو مار ڈالنے کی غرض سے ایک رانی نے کالی چیل کا روپ اختیار کیا اور دوسری نے سفید چیل بن کر خود کو ظاہر کیا۔ چوں کہ دونوں ایک دوسرے کی جان کی دشمن تھیں۔ روپ بدلتے ہی مارنے کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں۔ جس وقت وہ آپس میں لڑ رہی تھیں کہ اچانک راجا وہاں پہنچ گیا۔ راجا کو کسی طرح پتا چل گیا کہ یہ دونوں چیلیں میری رانیاں ہیں۔ جنہوں نے اپنا روپ بدل لیا ہے۔ راجا نے اپنے منتری کو بلایا اور پوری بات بتا کر کہا:

"میری یہ دونوں رانیاں اس وقت میرے سامنے چیل کے روپ میں ہیں۔ اس وقت عورت کو قتل کرنے کا گناہ بھی نہیں لگے گا۔ اب تم بتاؤ کہ میں کسے قتل کروں۔"

منتری نے فوراً کہا:

"کالی بھلی نہ سیت، دونوں مارو ایک ہی کھیت یعنی نہ کالی والی اچھی ہے اور نہ سفید دونوں کو ایک ساتھ قتل کر دینا چاہئے۔"

منتری کی صلاح پر راجا نے دونوں کو ایک ساتھ قتل کر دیا۔

کان پڑی کام آتی ہے

سنی سنائی کبھی نہ کبھی کام آ ہی جاتی ہے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک سبق آموز حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی مسجد کے حجرہ میں دو طالب علم رہتے تھے۔ وہ آپس میں علمی بحث کیا کرتے تھے۔ ان کی بحث و تکرار سے نمازیوں کو پریشانی ہوتی تھی۔ ان کی نمازوں میں خلل پڑتا تھا۔ مسجد میں نماز پڑھنے والوں نے ایک دن ان طلباء سے کہا:

"آپ لوگ کسی تنہائی کی جگہ میں جا کر سبق یاد کیا کریں۔ یہ بحثیں اور تکرار وہیں مناسب ہیں تاکہ ہم لوگوں کی نمازوں میں خلل نہ پڑے۔"

نمازیوں کی بات مان کر وہ دونوں قریب کے ایک جنگل میں جا کر مطالعہ کرنے لگے۔ وہ وہیں آپس میں بحث و مباحثہ بھی کرتے تھے۔ وہاں شکاریوں نے بھی ان پر پابندی لگا دی کہ تم لوگوں کے بولنے سے ہمارا شکار بھاگ جاتا ہے۔

ایک دن ایک شکاری اس جنگل میں آیا تو وہ طالب علم تذکیر و تانیث اور خنثیٰ کی بحث کر رہے تھے۔

چونکہ اس وقت کوئی شکار نہ تھا اس لیے شکاری بھی ان کی بحث سننے لگا۔ کچھ دن کے بعد اس نے مچھلی پکڑنے کے لیے دریا میں جال ڈالا تو ایک عجیب قسم کی مچھلی اس میں آکر پھنس گئی۔ شکاری نے اس مچھلی کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو انعام دینے کا حکم دیا۔ انعام سے نوازا جانا وزیر کو گراں گزرا۔ اس نے بادشاہ کو بہکایا:

''حضور! اگر اس کا جوڑا ہو تو کیا کہنا؟''

بادشاہ نے شکاری سے کہا: ''اس کا جوڑ لاؤ تو انعام ملے گا۔''

شکاری نے فوراً جواب دیا:

''جہاں پناہ! یہ خنثیٰ ہے اس کا جوڑا نہیں ہوتا۔''

شکاری کے جواب سے وزیر حیرت میں پڑ گیا مگر بادشاہ اس جواب سے خوش ہوا۔ اس نے شکاری کو انعام واکرام سے نوازا۔ اس موقع پر طلبا کی بحث شکاری کے کام آئی۔ اس وقت سے اس مثل کا وجود ہوا کہ

''کان پڑی کام آتی ہے۔''

کبڑے لات کام آئی

جب کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں اس کا فائدہ ہو جائے تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی مالک کا نوکر کبڑا تھا۔ وہ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل ہر حال میں کرتا تھا۔ وفاداری میں اپنی مثال آپ تھا۔ مالک کے مزاج میں چڑچڑاپن تھا۔ معمولی سی لغزش یا کوتاہی کے لیے کبڑے نوکر کو ڈانٹتا پھٹکارتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نوکر سے اپنے مالک کا کوئی کام بگڑ گیا تو غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، طیش میں تو تھا ہی کبڑے کی پیٹھ پر کس کر ایک لات ماردی۔ کبڑا درد سے کراہتا ہوا سیدھا ہو گیا اور اس کے بچپنے کا کوبڑ جاتا رہا۔ وہ مالک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے قدموں میں گر پڑا۔

کپوت گیا چوری، چھیڑن لاگا گوری

برا کام کرنے والا احمق۔ جب کوئی شخص برا کام بھی کرے اور اپنی نادانی کے سبب ایسی حرکت کر

بیٹھے جس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہو۔اس کہاوت کا تعلق ایک چھوٹی سی حکایت سے ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک نادان شخص جب روزی روٹی سے پریشان ہو گیا تو اس نے چوری کر کے مال و دولت حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ موقع پا کر رات کے وقت وہ ایک مکان میں گھس گیا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کے ایک کمرے میں ایک حسین دوشیزہ سو رہی ہے۔ دیکھتے ہی اس کی نیت خراب ہو گئی۔ چوری کرنا بھول کر وہ اس سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔ دوشیزہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے شور مچایا۔ گھر کے تمام لوگ جاگ گئے۔ محلے کے لوگوں نے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ چور پکڑا گیا اور اس کی اچھی طرح پٹائی کر کے گھر والوں نے پولیس کے حوالے کر دیا۔ ایک شخص نے یہ دیکھ کر کہا: ''کپوت گیا چوری، چھیٹرن لاگا گوری۔''

کتے خصی میں کون پڑے

بے وجہ کی علت میں کون پڑے۔ جھگڑے میں کون پڑے۔ یہ کہاوت جھگڑے سے الگ رہنے کے موقع پر بولی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک شخص نے کسی بازار سے ایک خوبصورت خصی بکرا خریدا اور اپنے گھر کی طرف لے کر چلا۔ اتنا خوبصورت بکرا دیکھ کر چند ٹھگوں کی نیت خراب ہو گئی۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کسی تدبیر سے اس بکرے کو اپنے قبضے میں کرنا چاہئے۔ وہ اس کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر تھوڑی تھوڑی دور پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ بکرے والا جب پہلے ٹھگ کے قریب سے گزرا تو ٹھگ نے کہا:

''یار یہ کتا نہایت عمدہ ہے۔ اسے کہاں سے لائے ہو۔''

بکرے والے نے جواب دیا:

''یہ تم کو کتا نظر آ رہا ہے۔ اتنا خوبصورت بکرا بازار بھر میں ایک ہی تھا۔ میں اسے مہنگے داموں خرید کر لایا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ جب دوسرے ٹھگ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا:

''بھائی یہ پہاڑی کتا کتنے کو خریدا؟ یہ کتا تو اس ملک کا نہیں معلوم ہوتا اسی لیے ہانپ رہا ہے۔''

بکرے والا اب تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ یہ خصی بکرا ہے اور یہ دونوں لوگ اسے کتا بتا رہے ہیں۔
وہ اسی تشویش میں آگے بڑھا تو تیسرے ٹھگ نے اس سے کہا:

"اتنا بڑا اور خوبصورت کتا تو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ یہ تمہارا معلوم نہیں ہوتا، شاید کسی امیر کا ہوگا۔"

بکرے والے کی تشویش بڑھنے لگی، یقین گمان میں بدلنے لگا۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ چوتھے ٹھگ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے اس کے کان میں کہا:

"یار! یہ کتا چوری کا ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دھرے جاؤ اور ناحق رسوائی و پریشانی ہو۔"

یہ سن کر وہ شخص پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا:

"راستے میں جتنے لوگ ملے ہر ایک نے اس کو کتا بتایا۔ میں نے تو بکرا خریدا تھا، میری نظر کو کیا ہو گیا، شاید میں دھوکا کھا گیا ہوں۔ جب اتنے لوگ اسے کتا بتا رہے ہیں تو ضرور کچھ نہ کچھ اصلیت ہے۔ یہ بکرا نہیں کتا ہی ہے۔"

اس نے یہ کہتے ہوئے بکرے کو چھوڑ دیا کہ:

"کتے خصی میں کون پڑے۔"

کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے

کسی امر کا تمہیں خیال ہو اور کسی بات کا ہمیں۔ ہمارا تمہارا لیکھا جوکھا برابر ہے۔ ہم تم برابر ہیں۔
جب دو اشخاص ایک دوسرے کی نیت یا اندرونی معاملات کو بھانپ لیں تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کوئی مسافر اپنے سر پر ایک گٹھری رکھے ہوئے پیدل سفر کر رہا تھا۔ گٹھری میں روپے اور زیورات تھے۔ گٹھری بھاری تھی اور وہ چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ کچھ آرام کرنے کے لیے وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے ایک سوار کا گزر ہوا۔ مسافر نے سوار سے پوچھا:

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

سوار نے کہا: "میں فلاں گاؤں جا رہا ہوں۔"

مسافر نے پھر کہا:

’’مجھے بھی اس گاؤں جانا ہے۔ بہت دور سے آرہا ہوں۔ دھوپ تیز ہے، بہت تھک گیا ہوں۔ ابھی منزل بھی دور ہے۔ اگر آپ میری یہ گٹھری گاؤں تک لیتے چلیں تو بہت احسان ہوگا۔ میں وہاں پہنچ کر اپنی گٹھری آپ سے حاصل کرلوں گا۔‘‘

سوار نے پوچھا:

’’اس گٹھری میں کیا ہے؟‘‘

مسافر نے جواب دیا:

’’اس میں روپیہ پیسہ اور زیور وغیرہ ہیں۔‘‘

سوار نے کہا:

’’روپے پیسے کا معاملہ ہے، نہ بھئی نہ، میں اس جوکھوں میں نہیں پڑتا۔‘‘

یہ کہہ کر سوار آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس کی نیت میں فتور آگیا۔ اس نے سوچا:

’’افسوس گٹھری کو لے کر گھوڑا کیوں نہ بھگا دیا۔ مفت میں کھرے ہو جاتے۔ چھمی خود بخود میرے پاس آگئی تھی لیکن میں نے اسے ٹھکرا دیا۔‘‘

ادھر اس مسافر کو خیال آیا:

’’اگر وہ میری گٹھری کو لے کر غائب ہو جاتا تو میں تو برباد ہو گیا ہوتا۔ اچھا ہوا جو اس نے لے جانے سے انکار کر دیا۔‘‘

کچھ دیر کے بعد سوار اسی جگہ واپس آگیا اور مسافر سے کہنے لگا:

’’تھوڑی دور جانے کے بعد مجھے تم پر ترس آگیا۔ تم واقعی بہت تھک گئے ہو۔ لاؤ تمہاری گٹھری کہاں ہے؟ میں اسے منزل تک پہنچا دوں گا۔‘‘

مسافر نے جواب دیا:

’’کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے۔ وہ وقت گیا، وہ بات گئی۔ اب گٹھری نہیں ملے گی۔‘‘

کچھ دال میں کالا کالا ہے

دیکھیے: کچھ دال میں کالا ہے۔

کچھ دال میں کالا ہے

کوئی سبب ضرور ہے، کوئی مشتبہ امر ہے، کوئی راز ہے، کچھ نہ کچھ عیب ضرور ہے، کوئی خاص اور اہم بات ضرور ہے، کوئی معاملہ ہے۔ کسی پوشیدہ بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہ مثل بولتے ہیں یعنی بظاہر تو کچھ نہ ہو لیکن باطن میں کوئی نہ کوئی معاملہ یا عیب ضرور ہو۔ اس مثل کا تعلق ایک دلچسپ حکایت سے ہے:

حکایت: ایک سوداگر بچہ تجارت کی غرض سے کسی شہر میں گیا۔ جاتے وقت اس کے دوستوں نے آگاہ کر دیا تھا کہ:

''جہاں جا رہے ہو وہاں کے لوگ انتہائی فن کار، عیار، جھگڑالو اور کٹھ حجتی ہوتے ہیں، ان سے ہوشیار رہنا۔''

سوداگر بچہ نے اس شہر میں پہنچ کر ایک سرائے میں قیام کیا اور چند دنوں کے لیے ایک خدمت گار کو بھی ملازم رکھ لیا۔ اگلے دن ایک کانے آدمی نے اس سوداگر بچے سے آ کر کہا:

''غالباً آپ کے والد انتقال کر گئے ہیں جب ہی ان کی جگہ آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ وہ بے چارے جب بھی اس شہر میں تشریف لاتے تھے تو اسی سرائے میں مقیم ہوا کرتے تھے۔''

سوداگر بچہ اس شخص کی باتوں سے سمجھ گیا کہ اب یہ کوئی دغابازی کرنے والا ہے، اس لیے وہ ہوشیار ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کانے نے کہا:

''آپ کے والد آنکھوں کی تجارت کرتے تھے۔ میں ان کے پاس اپنی ایک آنکھ گروی رکھ کر کچھ روپیہ لے لیا تھا۔ اب آپ مجھ سے وہ روپے لے لیں اور میری آنکھ مجھے واپس کر دیں۔''

سوداگر بچہ یہ سن کر بہت گھبرایا۔ اس نے کل کا وعدہ کر کے اس کو ٹال دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ملازم سے کہا:

''اس شہر میں اگر کوئی دانشمند رہتا ہو تو اس کا پتا لگا کر مجھے بتاؤ چلتے وقت میں اس کے عوض تم کو ضرور کچھ دوں گا۔''

ملازم نے پتا لگا لیا، سوداگر بچہ دانشمند کے پاس گیا اور اس کی فیس ادا کر کے مشورہ طلب کیا۔

دوسرے روز جب وہ کانا آدمی اس کے پاس آیا تو سوداگر بچہ جواب دینے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے کانے سے کہا:

"میرے پاس والد مرحوم کی رکھی ہوئی سینکڑوں آنکھیں ہیں۔ میں ان آنکھوں میں رات بھر تمہاری آنکھ تلاش کرتا رہا مگر تمام کوشش کے بعد بھی نہیں مل سکی۔ اب صرف یہی طریقہ ہے کہ تم مجھے اپنی دوسری آنکھ بھی دے دو تا کہ میں اس کے جوڑ کی آنکھ ڈھونڈ کر تمہارے حوالے کر دوں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی خیال ہے کہ کہیں دوسرے کی آنکھ بدل نہ جائے۔"

کانا اس جواب سے سمجھ گیا کہ یہاں دال گلنا دشوار ہے۔ وہ سوداگر بچہ سے اپنی جان چھڑا کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ سوداگر بچہ جب اس شہر سے تنگ ہو کر چلنے لگا تو اس نے اپنے ملازم کو تنخواہ کے روپے دینے چاہے۔ ملازم نے روپے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

"حضور نے مجھ سے کہا تھا کہ چلتے وقت کچھ دیں گے، روپے دینے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس لیے مجھے روپے نہیں بلکہ "کچھ" چاہیے۔"

سوداگر بچہ فکر مند ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد آخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ ہی گئی۔ اس نے ملازم کو کسی بہانے بازار بھیج کر اس وقت ٹال دیا۔ اس کے بعد اس نے پکی ہوئی دال ایک کوزے میں بھری پھر باریک کٹی ہوئی کالی مرچیں اوپر سے ڈال کر کوزے کو ایک طاق میں رکھ دیا۔ ملازم جب واپس آیا تو سوداگر بچے نے اس سے کہا:

"دیکھو طاق میں کیا رکھا ہے؟"

ملازم نے کوزے کو دیکھ کر کہا: "حضور! اس میں دال ہے۔"

سوداگر بچہ نے پھر پوچھا: "دال میں کیا ہے؟"

ملازم نے دال دیکھ کر جواب دیا:

"کچھ کالا کالا ہے۔"

سوداگر بچے نے پھر پوچھا:

"کالا کالا کیا ہوتا ہے؟"

ملازم نے کہا: "کچھ ہے۔"

یہ سن کر سوداگر بچہ فوراً بولا:

"جس کچھ دینے کا وعدہ میں نے کیا تھا۔ وہ یہی تھا۔ اس کو لے لو اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر کا راستہ ناپو۔"

اس طرح سوداگر بچہ نے اس شہر کے فن کار لوگوں سے اپنی جان چھڑائی۔

کچھ موسل نہیں بدلانا ہے

کچھ غرض نہیں ہے۔ کچھ تعلقات نہیں رکھنا ہے۔ کوئی رشتہ داری نہیں کرنا ہے۔ جب آدمی کی غرض نکل جاتی ہے تو وہ کسی کی بات نہیں سنتا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی سے کوئی تعلق رکھنا مقصود نہ ہو۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک مسافر کو بہت سی اشرفیاں لے کر کہیں جانا تھا۔ جنگل کا راستہ تھا۔ راستے میں رہزنوں اور لٹیروں کا ڈر تھا۔ اس لیے مسافر نے ایک موسل میں اشرفیاں بھر لیں تاکہ لٹیروں کو اشرفیوں کا پتا نہ چل سکے۔ وہ اسے صرف موسل ہی سمجھیں۔ موسل لے کر اس نے سفر کرنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے رات ہو گئی۔ وہ ایک بڑھیا کے مکان میں ٹھہر گیا۔ جب وہ کھا پی کر سو گیا تو بڑھیا نے مسافر کا اچھا موسل دیکھ کر اپنے موسل سے بدل لیا۔ صبح جب مسافر کو پتا چلا تو اس نے راز کھل جانے کے ڈر سے کچھ نہیں کہا۔ بڑھیا ہی کا موسل لے کر وہ اپنی منزل کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے کئی نئے اور اچھے موسل خریدے اور ان کو لے کر اسی گاؤں آیا جہاں بڑھیا کا گھر تھا۔ بھیس بدل کر اس نے آواز لگانا شروع کر دی:

"جسے نئے موسل سے پرانا موسل بدلانا ہو، مجھ سے بدل لو۔"

اس کی آواز سن کر بہت سے لوگ آئے اور اپنا اپنا موسل بدل لے گئے۔ بڑھیا کو بھی جب اس کی خبر ملی تو وہ بھی مسافر والا موسل لے کر دوڑی آئی اور اس موسل سے نیا موسل بدل کر مسافر سے کہنے لگی:

"بیٹا رات ہو گئی ہے، اب کہاں جاؤ گے۔ راستے میں لٹیروں کا خوف ہے۔ میرے گھر بسر کر لو۔"

مسافر نے جواب دیا:

"ٹھہر کر کچھ موسل نہیں بدلانا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا۔

کرتو ڈر، نہ کرتو خدا کے غضب سے ڈر

جو شخص برا کام کرے اس کو برے کام کے لیے خدا سے ڈرنا چاہئے اور جو شخص برا کام نہ کرے اسے بھی خدا کے غضب سے خوف کھانا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو ہمیشہ خدا کے غضب سے ڈرنا چاہئے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک سبق آموز حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی جگہ دو درویش رہتے تھے۔ آپس میں ان کی دوستی بھی تھی۔ ایک درویش نے دوسرے درویش سے کہا:

''کرتو ڈر، نہ کرتو خدا کے غضب سے ڈر۔''

دوسرے درویش نے جواب دیا:

''اگر میں کوئی گناہ نہ کروں تو پھر خدا کے غضب سے کیوں ڈروں؟''

کچھ دن کے بعد کسی چور نے بادشاہ کے محل سے ایک قیمتی ہار چوری کرلیا۔ وہ ہار لے کر جونہی فرار ہوا۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ پکڑے جانے کے ڈر سے چور نے اس کو دوسرے درویش کی گردن میں ڈال دیا۔ درویش کو اس کی خبر نہیں ہوئی، کیوں کہ وہ آنکھ بند کیے ہوئے خدا کی یاد میں محو تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد چور کو ڈھونڈتے ہوئے سپاہی درویش کی کٹیا تک آگئے۔ درویش کے گلے میں ہار دیکھ کر سپاہیوں نے درویش کو پکڑلیا اور بادشاہ کے حضور میں پیش کردیا۔ درویش نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر بادشاہ کو یقین نہ ہوا۔ اس نے درویش کو چور سمجھ کر پھانسی کا حکم دیا۔ جب جلاد اسے پھانسی دینے کے لیے لے جارہے تھے تو راستے میں پہلا درویش ملا۔ اس نے اس درویش سے کہا:

''جب تو نے چوری نہیں کی تو تجھے پھانسی کی سزا کیوں دی جارہی ہے؟ اسی لیے تو میں کہتا تھا کہ ''کرتو ڈر، نہ کرتو خدا کے غضب سے ڈر'' مگر تو مانتا ہی نہ تھا۔''

کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، ناحق چوٹ جلاہا کھائے

جو شخص اپنا کام چھوڑ کر فضول کاموں کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ کہاوت ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص دوسروں کی ریس کرکے بے فائدہ اپنا نقصان کرے یا تکلیف اٹھائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک گاؤں کسی چھوٹی ندی کے کنارے آباد تھا۔ موسم باراں میں جم کر بارش ہونے کی وجہ سے ندی میں باڑھ آگئی۔ گاؤں کے لوگ باڑھ کا منظر دیکھنے جا رہے تھے۔ کسی جلاہے کے دوست نے اس سے کہا:

''چلو ہم لوگ بھی سیلاب کا منظر دیکھ لیں۔''

جلاہا جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر دوست کے بار بار اصرار کرنے پر وہ اپنا کام چھوڑ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ جس راستے سے وہ لوگ جا رہے تھے۔ اس راستے کے کنارے پر ایک پرانا مکان تھا جو بارش ہونے کے سبب اور بھی خستہ ہو گیا تھا۔ جب وہ دونوں اس مکان کے کنارے سے ہو کر گزر رہے تھے کہ اچانک اس کی دیوار راستے کی طرف گر گئی۔ دوست تو بچ گیا مگر جلاہا اس سے دب گیا۔ بہ مشکل تمام بے ہوشی کی حالت میں اس کو نکالا گیا۔ جسم پر کئی جگہ گہری چوٹیں بھی آئیں۔ یہ منظر دیکھ کر ایک شخص نے جو تمام باتوں سے واقف تھا، کہا:

''کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، ناحق چوٹ جلاہا کھائے۔''

بعض لوگ اس حکایت میں سیلاب کی جگہ تماشہ کا ذکر کرتے ہیں یعنی جلاہے کا دوست جلاہے کو ایک تماشہ دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا کہ راستے میں ایک مکان کی دیوار اس پر گر پڑی۔

کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، ناحق مار جلاہا کھائے

دیکھیے: کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، ناحق چوٹ جلاہا کھائے۔

کرگھا چھوڑ جُلاہا جائے، ناحق چوٹ بچارہ کھائے

دیکھیے: کرگھا چھوڑ تماشہ جائے، ناحق چوٹ جولاہا کھائے۔

کرم کی ڈھولکی باجے

قسمت بگڑنے پر چھپے راز بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی خوش نصیب کے دن برے آنے پر وہ برائیاں بھی ظاہر ہو جائیں جو اب تک پردۂ اخفا میں تھیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک بار ایک چور کسی ڈھولک بیچنے والے کے مکان میں موقع پا کر چوری کی نیت سے رات کے وقت گھس گیا۔ بہت دیر ڈھونڈنے پر جب اسے مال و دولت نہ ملی تو اس نے ایک ڈھولکی چرا لی۔ جوں ہی وہ اسے لے کر بھاگا کہ مالک کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چور کا پیچھا کیا۔ چور ڈر کے مارے ڈھولکی کے ساتھ کپاس کے ایک کھیت میں گھس گیا اور چھپ کر اس میں بیٹھ گیا۔ مالک بھی پیچھا کرتے کرتے کھیت تک آ گیا۔ کھیت کی مینڈ پر کھڑا ہو کر وہ غور کرنے لگا کہ چور کس طرف گیا ہو گا کہ اتنے میں اچانک تیز ہوا چلی۔ کپاس کے پیڑ زور زور سے ہلنے لگے اور کپاس کے پھلوں کے لگنے سے ڈھولکی بجنے لگی۔ مالک ڈھولکی کی آواز سن کر سمجھ گیا کہ چور اسی کھیت میں چھپا ہے۔ اس نے کھیت میں گھس کر چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور یہ کہتا ہوا اس کو باہر لایا:

"کیا خوب کرم کی ڈھولکی باجے"۔

کس برتے پر تتا پانی؟

کس بھروسے پر گرم پانی کی فرمائش ہے۔ کس حوصلے اور امکان پر شیخی مارتے ہو۔ کس مقدور اور حقیقت پر غرور ہے۔ کس بات پر یہ دم دعویٰ ہے۔ یہ کہاوت اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب کوئی شخص اپنی حیثیت سے زیادہ کوئی چیز طلب کرے۔ ماں اپنے نکھٹو بیٹے کے لیے بھی اس کہاوت کا استعمال کرتی ہے۔ عورت اپنے نامرد شوہر کے لیے بھی کہتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک شخص کی بڑے دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ دلہن کو بڑے اہتمام کے ساتھ گھر لایا گیا۔ دلہن نہایت حسین تھی، ساس، نند اور دیگر رشتہ کی عورتیں اسے دیکھ دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ سہاگ رات کا انتظام کیا گیا۔ دلہن کو پہلے ہی حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد دولہا کو بھی چھیڑتے ہوئے دلہن کے کمرے میں کر دیا گیا۔ تمام رات یوں ہی گزر گئی۔ دلہن کے ارمانوں پر پانی پھر گیا۔ دولہا شرمندہ ہو کر سو گیا۔ صبح ہونے پر جب دولہا کی ماں نے دلہن کے نہانے کے لیے غسل خانے میں گرم پانی رکھ کر دلہن سے نہانے کے لیے کہا تو دلہن نے اس سے کہا:

"کس برتے پر تتا پانی؟ نامرد بیٹے کے ساتھ میری شادی کر کے میری قسمت ہی پھوڑ دی اور اب کس برتے پر تتا پانی غسل کے لیے لائی ہو؟"

کمائیں میاں خان خاناں، اڑائیں میاں فہیم

اعلیٰ دولت پیدا کرے اور ادنیٰ کے صرف میں آئے۔ غیر مال سے بہرہ مند ہوں اور حقدار محروم رہیں۔ کوئی کمائے کوئی لٹائے۔ باپ کمائے بیٹا اڑائے، مالک کمائے نوکر اڑائے۔ دوسرے کے مال پر گل چھرّے اڑانے والے کی نسبت بولتے ہیں۔ اس مثل کے پس منظر میں یہ واقعہ مشہور ہے:

واقعہ: میاں فہیم ایک راجپوت کے بیٹے اور عبدالرحیم خان خاناں کے غلام تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں جو بیرم خان خاناں کا بیٹا اور اکبری نورتن کا ایک اعلیٰ رکن تھا۔ اس نے اپنی اولاد کی طرح بڑے لاڈ اور پیار سے اپنے غلام میاں فہیم کی پرورش کی تھی۔

اپنی ذاتی فیاضی اور سخاوت کے علاوہ میاں فہیم کو بھی اس کی بہادری، خدمت گزاری اور جاں نثاری کے سبب اپنے جیسا ہی فیاض، سخی اور شاہ خرچ بنا دیا تھا۔ خان خاناں کی سرکار میں اس کو رسوخ بھی حاصل تھا۔

ان کے مال میں سے وہ جتنا چاہتا داد و دہش میں خرچ کر ڈالتا۔ یعنی خان خاناں کا جتنا بھی مال تھا وہ سب میاں فہیم کے اختیار میں تھا۔ فہیم نے جس طرح چاہا خان خاناں کے کمائے ہوئے مال کو خرچ کیا۔ اسی وجہ سے یہ مثل مشہور ہوگئی۔ خان خاناں کی طرف داری میں مہابت خاں سے مقابلہ کرتے ہوئے میاں فہیم مارے گئے۔ ہمایوں کے مقبرے کے پاس دہلی میں ان کا مقبرہ ہے۔

کمری ہی نہیں چھوڑتی

دیکھیے: کمل ہی نہیں چھوڑتا۔

کملی ہی نہیں چھوڑتی

دیکھیے: کمل ہی نہیں چھوڑتا۔

کمل نے پکڑ لیا

دیکھیے: کمل ہی نہیں چھوڑتا۔

کمل ہی نہیں چھوڑتا

جان ہی نہیں چھوٹتی، پیچھا ہی نہیں چھوٹتا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی چیز یا معاملہ اس طرح کسی کے پیچھے پڑ جائے کہ اس سے جان چھڑانا مشکل ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: دو دوست کسی ندی کے کنارے کھڑے ہوئے اس کے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ندی میں کمبل (کمل، کملی، کمری) جیسی چیز تیر رہی ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ یہ کہیں سے بہتا ہوا آ گیا ہے یا کسی نہانے والے شخص کا ہوگا۔ ان میں سے ایک دوست کمبل کو حاصل کرنے کے لیے ندی میں کود پڑا۔ جوں ہی اس نے کمبل کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا کہ اس کمبل نے اسے دبوچ لیا۔ دراصل وہ کمبل نہیں بھالو تھا جس کے پانی کے اوپر نظر آ رہے بالوں کو وہ لوگ کمبل سمجھے تھے۔ بھالو کے پکڑ لینے سے وہ پانی میں ڈبکیاں لگانے لگا۔ ندی کے کنارے کھڑے دوست نے اس کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر کہا: ''کمبل چھوڑ دے اور چلا آ۔''

دوسرے دوست نے ڈبکیاں کھاتے ہوئے جواب دیا:

''میں نے تو کمبل چھوڑ دیا ہے مگر کمبل ہی نہیں چھوڑتا۔''

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نے جواب دیا کہ:

''کمری ہی نہیں چھوڑتی یا کملی ہی نہیں چھوڑتی یا کمل نے پکڑ لیا۔''

کمین کو لوٹا ملا، پانی پی پی کر مرا

نااہل کو اس کی حیثیت سے زیادہ مل جانا۔ جب کسی بے مقدور کو کوئی اہم چیز مل جائے اور وہ اس کا ناجائز یا بے جا استعمال کرنے لگے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں ایک نادار شخص تھا۔ وہ روزی روٹی سے پریشان رہتا تھا۔ اس کے گھر میں نہ تو کھانے پینے کے برتن تھے اور نہ تن پر پہننے کے لیے اچھے کپڑے۔ ایک بار وہ کسی تقریب میں گیا۔ اس تقریب میں جتنے لوگ شامل تھے سب کو ایک ایک لوٹا پیش کیا گیا۔ یہ لوٹا پا کر بہت خوش ہو گیا۔ لوٹا لے

کر خوشی خوشی اپنے گھر آیا اور آتے ہی مارے خوشی کے لوٹا بھر پانی پی گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر لوٹا بھر پانی پیا۔ غرض سارا دن اسی طرح لوٹے سے پانی پیتا رہا۔ جس سے اس کا پیٹ بہت پھول گیا۔ پیٹ چڑھنے سے اس کو تکلیف ہوئی۔ قے کے ساتھ دست ہونے لگا۔ تمام علاج کے باوجود بھی وہ اچھا نہ ہو سکا اور آدھی رات کے بعد مر گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر کسی واقف کار نے کہا:

''کمین کو لوٹا ملا، پانی پی پی کر مرا۔''

کنواں بیچا ہے، کنویں کا پانی نہیں بیچا

بے فائدہ تکرار اور خواہ مخواہ حجت کا اقرار۔ فضول تکرار، ناجائز دلیل اور خلاف عقل شرائط پر اس مثل کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس مثل کے تعلق سے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کوئی شخص ایک کنویں کا مالک تھا۔ اس نے ایک خریدار کے ہاتھوں اس کنویں کو فروخت کر دیا اور اس کی قیمت اپنے قبضے میں کر لی۔ ایک روز خریدار کنویں سے پانی بھرنے گیا تو کنواں بیچنے والے نے خریدار کو پانی بھرنے سے منع کرتے ہوئے کہا:

''میاں! میں نے کنواں بیچا ہے، کنویں کا پانی نہیں بیچا۔''

خریدار نے قاضی شہر کی عدالت میں فریاد کی۔ قاضی کے پوچھے جانے پر بیچنے والے نے وہی جملہ دہرا دیئے کہ: ''حضور! میں نے کنواں بیچا ہے، کنویں کا پانی نہیں بیچا۔ یہ دیکھیے بیع نامہ میں صاف صاف لکھا ہوا ہے۔''

اس کے بعد قاضی نے اس سے کہا:

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن تم نے اب تک کنویں سے اپنا پانی کیوں نہیں نکالا۔ آج ہی اپنا کل پانی نکال لے ورنہ جرمانہ کے علاوہ کنویں میں پانی رکھنے کا کرایہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔''

مجبوراً اس کو اپنا دعویٰ واپس لینا پڑا جس کے لیے اس نے قاضی کی عدالت میں راضی نامہ داخل کر دیا۔

کوا چھپر پر چڑھ تو گیا، دیکھیں کیسے اترتا ہے؟

بے وقوفی کی باتیں کرنا۔ جب کوئی شخص خلاف عقل یا نادانی کی بات کرے تو یہ کہاوت کہتے ہیں۔

اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک واقعہ ہے جو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

واقعہ: کسی گاؤں میں ایک احمق شخص رہتا تھا۔ اس کے گھر میں ایک چھپر تھا اور چھپر میں دیوار کے سہارے ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ ایک دن اس شخص نے دیکھا کہ ایک کوا سیڑھی کے ایک ڈنڈے پر بیٹھا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اوپر والے دوسرے ڈنڈے پر جا بیٹھا۔ پھر تیسرے، چوتھے اور پانچویں ڈنڈے پر بیٹھ بیٹھ کر اسی طرح چھپر تک پہنچ گیا اور چھپر پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے سوچا کوا سیڑھی کے ذریعہ چھپر تک تو پہنچ گیا ہے اگر میں سیڑھی کو ہٹا دوں تو یہ کس طرح چھپر سے اترے گا۔ فوراً اس نے سیڑھی ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دی۔ اس کے بعد اس نے اپنے کسی ساتھی سے کہا:

''کوا چھپر پر تو چڑھ گیا، دیکھیں کیسے اترتا ہے؟''

کچھ دیر کے بعد کوے نے اپنے پر تولے اور پھر سے اڑ گیا۔ یہ دیکھ کر وہ نادان شخص نہایت شرمندہ ہوا۔

کوا کان لے گیا

بغیر سوچے سمجھے کسی کی بات سن کر مکمل یقین کر لینا۔ جہاں کوئی شخص جھوٹی بات کی پیروی کیے جائے اور تحقیق کی طرف متوجہ نہ ہو، وہاں یہ مثل بولی جاتی ہے۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کوئی بیوقوف کسی کام سے کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اس کے سر کے اوپر سے اڑتا ہوا ایک کوا نکل گیا۔ ایک دوسرا ہوشیار شخص جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، احمق شخص سے کہنے لگا:

''کوا تیرا کان لے گیا۔''

یہ سنتے ہی وہ جھپٹ کر کوے کے پیچھے دوڑا اور دوڑتے دوڑتے بہت دور نکل گیا۔ کچھ لوگوں نے جب اس سے کوئے کے پیچھے دوڑنے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا:

''کوا کان لے گیا۔ اس لیے اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔''

اس شخص نے کہا:

''تمہارے تو دونوں کان ہیں۔ تیسرا کان کہاں تھا جسے کوا لے گیا۔ تب اس نے اپنے دونوں کان اپنے ہاتھ سے ٹٹولے تو بہت شرمندہ ہوا۔

بعض لوگ کان کے بجائے ناک کہتے ہیں یعنی کوا ناک لے گیا۔

کوا ناک لے گیا، ناک کو نہیں دیکھتے، کوے کے پیچھے دوڑے جاتے ہیں

دیکھیے: کوا کان لے گیا۔

کوے سے چتر بچہ

کوے کی چالاکی مشہور ہے مگر کوے سے بھی زیادہ چالاک اس کا بچہ ہوتا ہے۔ یہ مثل اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی ہوشیار باپ کا بیٹا اپنے باپ سے بھی زیادہ ہوشیار اور چالاک ہو۔ اس مثل کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک کوے نے اپنے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"جب کوئی شخص اینٹ اٹھا کر تمہیں مارنے کے لیے دوڑے تو تم فوراً اڑ جانا، ورنہ چوٹ لگ جائے گی۔"

اس کے جواب میں بچے نے کہا:

"آپ نے ٹھیک کہا مگر ایک بات بتایئے کہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ میں پہلے ہی سے اینٹ چھپائے ہو تو میں کیسے سمجھ سکوں گا؟"

کوے نے اپنے بیٹے کی دلیل سن کر کہا:

"تو، تو مجھ سے بھی زیادہ چتر نکلا۔"

اسی حکایت سے یہ مثل وجود میں آ گئی کہ: "کوے سے چتر بچہ۔"

کوے کا بچہ، اس کی نظر میں سب سے اچھا

ہر شخص کو اپنی ہی اولاد اور اپنی ہی عقل سب سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی راجا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بادشاہ تو کسی نہ کسی طرح دربار اور سلطنت کے کاموں

میں خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا مگر رانی کو رات دن اولاد کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنی طبیعت کو بہلانے کے لیے بچوں کے کپڑے سیتی، کھلونے بناتی اور چھوٹے بچوں کے استعمال کا سامان خرید کر ان عورتوں کے پاس بھجوا دیتی جن کی گود میں چھوٹے بچے ہوتے۔ ایک روز کی بات ہے کہ رانی نے اپنے ہاتھ سے موتیوں کی ایک چھوٹی ٹوپی بنائی اور اپنی خادمہ کو بلا کر کہا:

''اس شہر میں جو لڑکا سب سے زیادہ خوبصورت ہو، اسے میرے پاس لے آؤ، میں یہ ٹوپی اسے پہنادوں گی۔''

خادمہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے بدصورت لڑکے کو لے آئی اور رانی سے آ کر کہنے لگی:

''اس سے خوبصورت لڑکا میری نظر میں شہر بھر میں نہیں۔''

رانی نے مسکرا کر بس اتنا کہا:

''سچ ہے کوے کا بچہ، اس کی نظر میں سب سے اچھا۔''

کہاں راجا بھوج، کہاں گنگوا تیلی

ادنیٰ کو اعلیٰ سے کیا نسبت؟ کہاں یہ کہاں وہ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک؟ دو چیزوں یا دو اشخاص میں زیادہ فرق ہونے کے محل پر اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک تاریخی واقعہ ہے جو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

واقعہ: مالوا اور گجرات کے راجا بھوج کی حکومت میں گنگوا نامی ایک غریب اور بوڑھا تیلی رہتا تھا۔ اس کا لڑکا علم موسیقی میں اس قدر ماہر تھا کہ راگ اور راگنیاں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں۔ راجا بھوج بھی سنگیت پریمی تھا۔ ایک مرتبہ کی بات ہے کہ گنگوا تیلی کے لڑکے نے دیپک راگ گا کر راجا بھوج کے محل کے تمام چراغ روشن کر دیئے۔ اس سے خوش ہو کر راجا بھوج نے اپنی لڑکی کا بیاہ گنگوا تیلی کے لڑکے کے ساتھ کر دیا۔ اسی وقت سے یہ کہاوت مشہور ہو گئی:

''کہاں راجا بھوج، کہاں گنگوا تیلی۔''

مراٹھی بھاشا کے مہاراشٹر واک سمپردائے کوش کے مرتبین کی تحقیق کے مطابق گنگوا تیلی دراصل گنگ راج تیلپ (۹۷۳ء تا ۹۹۷) ہے۔ جس نے پرمار خاندان کے راجا منج کا قتل کر کے اس کی گدی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی منج راجا کو غلطی سے راجا بھوج سمجھ لیا گیا۔

کہاں گنگوا تیلی، کہاں راجا بھوج

دیکھیے: کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی۔

کہوں تو ماں ماری جائے، نہ کہوں تو باوا کتا کھائے

دیکھیے: کہوں تو ماں ماری جائے، نہیں تو باپ کتا کھائے۔

کہوں تو ماں ماری جائے، نہیں تو باپ کتا کھائے

ایسی بات جس کے کہنے اور نہ کہنے دونوں میں خرابی واقع ہو۔ ہر طرح سے مشکل ہی مشکل۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ کہنا بھی مشکل نہ کہنا بھی مشکل۔ یہ مثل اس جگہ بولتے ہیں جب کوئی ایسی مصیبت میں پڑ جائے جس میں کوئی راستہ نہ ہو اور ہر طرح سے اپنی ہی خرابی یا نقصان ہو۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک مشہور حکایت سے ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۱: ایک بار ایک شخص بازار سے گوشت خرید کر لایا اور اپنی بیوی کو پکانے کیلئے دیا۔ عورت نے اس گوشت کو کہیں رکھ دیا۔ اتفاق سے ایک کتا اسے کھا گیا۔ عورت کو جب معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائی کیونکہ اس کا شوہر نہایت سخت مزاج کا تھا۔ اسے بات بات پر غصہ آتا تھا۔ عورت نے سوچا اگر شوہر کو پتا چل گیا تو وہ اس کی پٹائی کردے گا۔ اس نے فوراً ایک کتے کو ذبح کیا اور اس کا گوشت پکا کر سالن تیار کر دیا۔ لیکن اس کے بیٹے نے ماں کی اس حرکت کو دیکھ لیا۔ اب بیٹا پس و پیش میں پڑ گیا کہ وہ کیا کرے۔ اگر وہ والد کو بتا دے کہ یہ کتے کا گوشت ہے تو اس کی ماں کی پٹائی ہو جائے گی اور اگر وہ چپ رہے تو اس کے باپ کو کتے کا گوشت کھانا پڑے گا جو حرام ہے۔ وہ جتنا ماں کو چاہتا تھا اتنا ہی باپ کو چاہتا تھا۔ اسے نہ تو ماں کی پٹائی گوارا تھی اور نہ باپ کا کتے کا گوشت کھانا۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ بڑبڑا اٹھا:

"کہوں تو ماں ماری جائے، نہیں تو باپ کتا کھائے۔"

یہ حکایت معمولی ترمیم و تبدیلی کے ساتھ اس طرح بھی بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۲: ایک شخص نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی اور بیوی کو کچھ روپے دیئے کہ وہ عمدہ گوشت منگوا کر قورمہ بنا لے۔ بیوی لالچی تھی، اس نے ایک کتا کاٹ کر اس کے گوشت کا قورمہ بنا لیا اور

روپے خود رکھ لئے۔ جب مہمان آئے تو دستر خوان بچھایا گیا اور وہی قورمہ رکھا گیا۔ اس کا شوہر بھی کھانے میں شریک تھا۔ چھوٹے لڑکے نے ماں کی ساری حرکت دیکھ لی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا باپ کتے کا گوشت کھائے جو ناجائز ہے، وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ماں کی حرکت کو اپنے والد کے سامنے عیاں کر دے کیونکہ باپ غصہ کا تیز تھا۔ وہ ذرا دیر میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اپنی بیوی کے کرتوت کا علم ہونے پر وہ اس کی جم کر پٹائی کر دیتا جس سے مہمانوں کے سامنے رسوائی ہوتی۔ لڑکا پس و پیش میں پڑ گیا کہ وہ کیا کرے۔ کہے تو مشکل نہ کہے تو مشکل۔ آ کر کار اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ:

''کہوں تو ماں ماری جائے، نہ کہوں تو باپ کتا کھائے۔''

کیا کرے گا دولا، جسے دے مولا

خدا ہی سب کو دیتا ہے اس میں دولا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہی رزاق و رحمٰن ہے، وہ ہی داتا ہے۔ اس کے دینے میں اگر کوئی خلل پیدا کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا اور اگر خدا نہ دے تو کسی میں یہ طاقت و وصف نہیں کہ اس سے دلا سکے۔ اس مثل کے پس منظر میں کوئی حکایت تو نہیں مگر پنجاب کے گجرات ضلع میں سترہویں صدی میں دولا نامی ایک مشہور درویش ہوئے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اگر کوئی شخص کچھ طلب کرتا تو وہ فرمایا کرتے: ''کیا کرے گا دولا، جسے دے مولا۔''

کھائیں بھیم، ہگیں شکنی

قصور کوئی کرے سزا کسی کو ملے۔ کرے کوئی بھگتے کوئی۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی کے جرم کی سزا کسی اور کو بھگتنا پڑے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: بھیم نے جب اپنی ریاضت و عبادت سے کسی دیوتا کو خوش کر لیا تو اس نے بھیم سے کہا:

''میں آج تجھ سے خوش ہوں۔ تیرے دل کی ایک مراد بر آئے گی۔ تجھے جو بھی طلب کرنا ہو طلب کرے۔''

بھیم نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

''مجھ میں ایسا وصف آ جائے کہ میں جو کچھ بھی کھاؤں، اسے نگل یا شکنی کو ہگنا پڑے۔''

دیوتا نے وصف عطا کرتے ہوئے کہا: ''جا ایسا ہی ہوگا۔''

اب کیا تھا بھیم نے خوب مرچیں کھانا شروع کردیں۔ جس کے اثر سے جب نگل یا شکنی پاخانہ کرتے تو نہ صرف پاخانہ بڑی مشکل سے ہوتا بلکہ اس مقام پر مرچیں لگنے سے بہت تکلیف بھی ہوتی۔

کھائیں بھیم، ہگیں نگل

دیکھیے: کھائیں بھیم، ہگیں شکنی۔

کھچڑی کھاتے پہونچا اترا

ناحق کی اور جھوٹی نزاکت دکھانا۔ کمال نازک ہونا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص اپنے آپ کو بہت زیادہ نازک ثابت کرنے کی کوشش کرے یا پھر معمولی حرکت سے کوئی بڑا نقصان ہوجائے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک واقعہ سے ہے جو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

واقعہ: نواب بدل بیگ خاں کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عیسیٰ خاں تھا اور دوسرے کا نام موسیٰ خاں تھا۔ دونوں پہلوان اور بڑے شہ زور تھے۔ ہر ایک خوش خوراک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں بیس، بیس، پچیس پچیس سیر غذا ایک وقت میں کھا جاتے تھے۔ ایک روز گرم گرم کھچڑی کا بھرا ہوا لگن رکھا تھا۔ عیسیٰ خاں نے اپنا ہاتھ ڈال کر کھچڑی مٹھی میں نکال لی لیکن وہ گرم تھی۔ اس وجہ سے ہاتھ جلنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر جوں ہی کھچڑی کو لگن میں ڈالا تو ان کا پہونچا اُتر گیا۔ اس وقت سے جھوٹی نزاکت کے لیے یہ کہاوت مشہور ہوگئی۔

کھرا کھیل فرخ آبادی

فرخ آبادی روپیہ کا معاملہ سب سے کھرا ہے کیوں کہ وہ کھوٹا نہیں ہوتا۔ خوش معاملگی اچھی ہے۔ ادھر دام دیئے ادھر کام لیا۔ فوراً اور جلدی کام کو بجالانا۔

حکایت: ایک زمانہ میں فرخ آباد ٹکسال گھر تھا اور وہاں کے برابر کسی کا کھرا سکہ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ وہاں کا روپیہ ہمیشہ اچھے داموں بکتا تھا۔ پس اس وجہ سے یہ مثل مشہور ہوگئی۔ عوام اس کو ''کھرا کھیل فرخ آبادی'' کہنے لگی۔

کھڑا کھیل فرخ آبادی

دیکھیے: کھرا کھیل فرخ آبادی۔

کھو گئے گھوڑے رتھ بھی جلا، سفر نہ پھر بھی بند ہوا

باہمی اتحاد سے بگڑا ہوا کام بھی بن جاتا ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں دوست رہتے تھے۔ ان دونوں کے پاس بہترین گھوڑے اور رتھ تھے۔ اک دن وہ دونوں اپنے اپنے رتھوں میں گھوڑے جوت کر سفر کے لیے نکل پڑے۔ راستے میں ایک گاؤں کے قریب رات ہوگئی تو وہ اس گاؤں میں ٹھہر گئے۔ اتفاق سے اس گاؤں میں کسی طرح آگ لگ گئی جس کی وجہ سے ایک دوست کا رتھ جل گیا اور دوسرے دوست کے گھوڑے کہیں بھاگ گئے۔ صبح ہونے پر ان دونوں نے آپس میں صلاح کی کہ ابھی ہم لوگوں کو بہت سفر طے کرنا ہے۔ کیوں نہ جل جانے سے بچے ہوئے رتھ میں ان محفوظ گھوڑوں کو جوت کر اپنے سفر کو جاری رکھیں۔ اس طرح ایک دوست کے رتھ میں دوسرے دوست کے گھوڑے جوتنے سے سفر کا سلسلہ قائم رہا۔

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا، آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا

بڑی محنت اور جتن سے چرخہ جلا کر کھیر بنائی، کتا آیا اور کھا گیا۔ اب تاسف کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب کسی کام کو محنت اور جتن سے کرنے کے بعد کیے کرائے کام پر پانی پھر جائے تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس انمول کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آبِ حیات میں تحریر کیا ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک مرتبہ امیر خسرو کہیں جا رہے تھے۔ راستہ چلتے چلتے انہیں پیاس لگی۔ وہ ایک کنویں پر پہنچے جہاں چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو نے ان سے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک پنہاری امیر خسرو کو پہچانتی تھی۔ اس نے دوسری پنہاریوں سے کہا: ”دیکھو! کھسرو یہی ہے۔“

اس کے بعد ان چاروں نے پوچھا: ”تو خسرو ہے جس کے ہم سب گیت گاتے ہیں، پہیلیاں،

مکرنیاں اور انمل سنتے ہیں۔ تم ہمارے لیے پہلے کوئی شعر کہہ دو تو ہم پانی پلا دیں گے۔"

ایک پنہاری بولی: "مجھے کھیر کی بات کہہ دے"

دوسری نے چرخہ کا نام لیا، تیسری نے کتا کہا اور چوتھی نے ڈھول کی فرمائش کی تھی۔ امیر خسرو نے کہا: "مارے پیاس کے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ پہلے پانی تو پلا دو۔"

وہ بولیں: "جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا، ہم پانی نہیں پلائیں گے۔"

امیر خسرو نے اسی وقت یہ شعر کہہ دیا:

"کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا، آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا" لا پانی پلا۔

کھیل بتاشوں کا مینہ

بے سر کی بات، ناممکن واقعہ۔ یہ کہاوت اس جگہ بولی جاتی ہے جب کوئی شخص غیر معین زمانہ بتائے یا کسی ایسے واقعہ کا ذکر کرے جو ممکن ہی نہ ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں ایک شیخ چلی رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کسی مالدار کے یہاں چوری کی۔ چوری کے مال کو اس نے اپنے گھر میں لا کر رکھا۔ اس کی ماں کو یہ اندیشہ ہوا کہ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے چوری کا مال چھپا نہیں سکے گا۔ لہٰذا اس نے مال کو تو کہیں چھپا دیا اور کھیل بتاشے اس طرح دور تک بکھیر دیئے کہ شیخ چلی نے سمجھا کہ یہ آسمان سے گرے ہیں۔ چوری کے مال کی تحقیق ہونے پر شیخ چلی پکڑا گیا، اس نے چوری کرنے کا اقبال بھی کر لیا لیکن چوری کا دن اس طرح بتایا کہ جس روز کھیل بتاشوں کا مینہ برسا تھا۔ میں نے اس روز چوری کی تھی۔

کھیلوں بتاشوں کا مینہ

دیکھیے: کھیل بتاشوں کا مینہ۔

گانگو کا ہنگا ہو گیا

نہایت سست، نہایت کاہل۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص نہایت سستی سے یا

بہت دیر میں کام کرے۔اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک کسان کے یہاں گانگو نامی ایک ملازم تھا جو کام کرنے میں بہت سست تھا۔کاتک کے مہینے میں ربیع کی بوائی ہو رہی تھی۔کسان نے گانگو سے کہا: "گھر جا کر ہینگا یعنی پاٹا لے آؤ۔"

کسان نے اس سے یہ بھی کہا: "دیکھو جلدی آنا بوائی کرنا ہے۔"

گانگو ہینگا لینے کے لیے گھر چلا گیا مگر ہینگا لے کر اس وقت واپس آیا جب فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ اس نے آتے ہی کسان سے کہا:

"مالک! جب اتنی جلدی کا کام ہو تو میرے بجائے کسی اور سے وہ کام کرایا کریں۔

اتنی دیر میں آنے کے بعد بھی گانگو، سمجھ رہا تھا کہ وہ بہت جلدی واپس آ گیا ہے۔

گُربہ کُشتن روزِ اوّل

بلی کو پہلے ہی دن مارنا چاہئے۔رعب پہلے ہی دن خوب بیٹھتا ہے۔یہ مثل ایسے موقعوں پر بولی جاتی ہے جب یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ رعب پہلے ہی دن سے جمانا چاہئے یا موذی کو سزا دینے میں تساہلی نہیں کرنا چاہئے۔یہ ایک قصہ کی طرف تلمیح ہے جو کئی طرح سے مشہور ہے:

حکایت ۱: ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ پانچ یاروں نے مل کر عہد کیا تھا کہ ہم شادی ایک ساتھ ہی کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔چند روز کے بعد باری باری سے پانچوں دوستوں نے اپنی اپنی بیویوں کی عادات، اطوار اور خصلتیں بیان کرنا شروع کیں۔اتفاق سے چار کی بیویاں نہایت بدمزاج اور خاوندوں پر غالب رہنے والی نکلیں۔جب کہ ایک کی بیوی نہایت فرمانبردار، مطیع اور شوہر پرست نکلی۔ چاروں دوستوں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا:

"جب اول روز ہی ہم دونوں میاں بیوی کھانا کھانے بیٹھے تو ایک بلی دسترخوان پر آ بیٹھی۔میں نے کہا: "چلی جا" وہ نہ گئی تب میں نے اسے فوراً اٹھ کر مار ڈالا۔اس روز سے بیوی پر ایسا رعب چھایا کہ وہ ہر بات سے ڈرنے لگی۔وہ سوچتی ہوگی کہ جس نے ذرا سے بات نہ ماننے پر بلی کو مار ڈالا تو خدا جانے وہ میرا کیا حال کرے گا؟"

اس کے بعد ان چاروں دوستوں نے بھی اس پر عمل کیا مگر چوں کہ عرصہ گزر گیا تھا۔بیویاں ان کی

عادتوں سے اچھی طرح واقف اور مزاجوں پر حاوی ہو چکی تھیں۔ اس سبب سے کچھ پیش رفت نہ کی گئی۔ اس دوست نے ان کا حال سن کر کہا:

''بھائی گربہ کشتن روز اول، بعد کا رعب جمانا کام نہیں دیتا۔''

دوسری حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت۲: دو ہم نوالہ و ہم پیالہ دوستوں نے ایک ہی دن اپنی اپنی شادیاں کیں۔ دونوں کی بیویاں انتہائی بدمزاج اور سگی بہنیں تھیں۔ ایک دوست کی بیوی تو شوہر پر غالب آ گئی اور دوسری اپنے شوہر کے رعب میں آ کر فرماں بردار بن گئی۔ پہلے دوست کو تعجب تھا کہ دوسرے کی بیوی کس طرح راہ راست پر آئی۔ دوسرے دوست نے بتایا کہ:

''اس نے پہلے ہی دن اس پر رعب جما لیا تھا۔ جب ہم دونوں میاں بیوی کھانا کھا رہے تھے تو ایک بلی کہیں سے آ کر ہمارے دستر خوان پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک بار بلی کو بھگایا جب وہ نہیں بھاگی تو فوراً ہی اٹھ کر تلوار سے اسے قتل کر دیا۔ میری بیوی نے جب میرا یہ غصہ دیکھا تو سہم گئی اور پھر ہمیشہ کیلئے مطیع و فرماں بردار بن گئی۔''

دوسرے دوست نے بھی گھر جا کر اسی نسخہ پر عمل کیا اور دستر خوان پر بیٹھی ہوئی اپنی پالتو بلی کو قتل کر دیا۔ اس کی بیوی پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا کیوں کہ وہ اپنے شوہر کی عادتوں سے بخوبی واقف ہو چکی تھی۔ یہ ماجرا سن کر پہلے دوست نے کہا:

''عمل بہت دیر میں ہوا کیوں کہ ''گربہ کشتن روز اول نہ کہ بعد۔''

تیسری حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت۳: دو شخص بڑے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے یہ عہد کیا کہ ہم ایک ساتھ اور ایک ہی گھرانے میں شادی کریں گے ورنہ زندگی بھر شادی کا نام نہ لیں گے۔ بڑی تلاش کے بعد ایک گھرانے کا حال معلوم ہوا کہ وہاں دو خوبصورت کنواری بہنیں ہیں مگر شادی کی یہ شرط ہے کہ وہ اس شخص سے شادی کریں گی جو ہر صبح اٹھ کر بیوی کو جھک کر سلام کرے۔ ایک روز دونوں دوستوں کی ان دونوں بہنوں سے شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد صبح کو جب ایک دوست اٹھا تو تیوری چڑھائے ہوئے پلنگ سے اٹھ کر تلوار لیے باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے ایک بلی ادھر سے گزری تو اس نے فوراً تلوار سونت کر بلی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ بیوی اس واقعہ کو دیکھ کر سہم گئی اور شوہر کی تابع فرمانی کرنے لگی۔ دوسرا دوست جب صبح کو اٹھا تو

ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ اس کی بیوی نے تیور بدل کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً پلنگ سے اتر کر کھڑا ہو گیا اور بیوی کو جھک کر سلام کرنے لگا۔ جب دونوں ملے تو ان کو ایک دوسرے کا حال معلوم ہوا۔ ادھر دونوں بہنوں نے بھی ایک دوسرے سے آپ بیتی کہی۔ بیوی کو جھک کر سلام کرنے والے دوست نے دوسرے دن بلی مارنے کی نقل کی۔ اس نے صبح کو اٹھتے ہی غصہ دکھایا۔ نیام سے تلوار نکالی۔ اتفاق سے اس وقت بلی بھی گزری تو اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ بیوی پر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ وہ تو اس کو سوانگ سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا:

''اس بے زبان کو مارنے سے کیا حاصل۔ نقل کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ گربہ کشتن روزِ اول۔''

اس مثل کے تعلق سے چوتھی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۴: پرانے زمانے میں ماں باپ کی رضامندی ہی سے شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ لڑکے لڑکی کا مشورہ اور پسند اتنی اہم نہ تھی۔ ایک لڑکی کے حسن و جمال کی بہت شہرت تھی مگر یہ بھی مشہور تھا کہ وہ انتہائی ضدی، شوخ اور چنچل بھی تھی۔ اس کی شادی ایک ماں کے اکلوتے بیٹے سے طے ہو گئی۔ اس کے دوستوں میں ہنسی مذاق شروع ہو گیا۔ کوئی کہتا:

''بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے۔''

کسی نے کہا:

''طور کا جلوہ ہے۔''

ایک دوست نے پھبتی اڑائی:

''میں ہوں ہنوز تو ہے مقطع۔ میرا تیرا میل نہیں ہے۔''

ایک صاحب ذرا شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے۔ گویا ہوئے:

''دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔''

ان باتوں کا لڑکے پر نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ اس کے ذہن میں الجھن پیدا ہو گئی کہ اگر عروسِ نو نے نئی زندگی سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا تو مجھے سب ''زن مرید'' کہنے لگیں گے۔ اس کے دوست بھی اس کی ذہنی خلش کو سمجھ گئے۔ آخرکار اس کی عدم موجودگی میں دوستوں نے مشورے کیے اور یہ طے پایا کہ اپنے حلقہ احباب میں عنایت خاں اس معاملہ میں سب سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ ان سے رجوع کیا جائے۔ لڑکے نے اپنی

پریشانی کا اظہار عنایت خاں سے کیا۔ وہ بولے:

''تدبیر میں بتادوں مگر عمل کرنا تمہارا کام ہے، تیر بہدف نسخہ ہے۔''

عنایت خاں نے لڑکے کے کان میں کچھ کہا تو وہ اچھل پڑا۔ شادی ہونے کے بعد لڑکی رخصت ہو کر گھر آئی۔ لڑکے کے شادی کی رات کو چھپر کھٹ سے ایک بلی باندھ دی اور ایک تلوار کھونٹی میں ٹانگ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد میاؤں میاؤں کی آواز نکالی۔ لڑکے نے کہا:

''بیوی ذرا دیکھنا تو یہ بلی کہاں بول رہی ہے؟''

بیوی شرمیلی تو تھی نہیں۔ فوراً بولی:

جسے کتے بلی کا شوق ہے وہ خود دیکھ لے۔''

لڑکا سمجھ گیا کہ بڑا سخت معرکہ ہے۔ ادھر میاں بیوی جونہی گفتگو میں مصروف ہوئے بلی نے میاؤں میاؤں کرنا شروع کیا۔ چھپر کھٹ کے نیچے جھانک کر لڑکے نے بلی سے کہا:

''بولنا بند کردے ورنہ مرمت کردوں گا۔''

لڑکی ہنسنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بلی نے پھر میاؤں میاؤں کرنا شروع کیا۔ لڑکے نے تیز آواز سے کہا:

''دوسری دفعہ اور ضبط کر رہا ہوں۔ اگر اب بولی تو تیری خیر نہیں۔''

لڑکی نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

''خوب سمجھ لیا۔''

اب ذرا دیر ہی گزری تھی کہ بلی نے پھر میاؤں میاؤں شروع کردی۔ لڑکے نے بھرا کر کہا:

''بس اب حد ہوگئی۔ تیرے بُرے دن آگئے۔ اب تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تین دفعہ تجھے معاف کیا ہے۔ اب سلامتی چاہتی ہے تو چپ چاپ سوجا۔''

لڑکی نے کہا:

''ایک دفعہ میری طرف سے بھی معاف کردینا''

اور یہ کہہ کر چھپر کھٹ کے نیچے جھانک کر کہا:

''کیا سوگئی؟''

بلی نے پہلے سے بھی زیادہ میاؤں میاؤں کی رٹ لگادی۔لڑکی نے مسکرا کرلڑکے کی طرف دیکھا۔ لڑکا اٹھا،تلوار میان (نیام) سے نکالی اور غصہ سے بولا: "نہیں مانتی۔"

یہ کہہ کر تلوار کا ایک وار کیا اور بلی کی گردن الگ جا پڑی۔لڑکی یعنی دلہن سہم گئی۔اپنے جی میں کہنے لگی۔بڑے ظالم مرد سے پالا پڑا ہے۔وہ پہلے ہی روز سے رعب میں آ گئی۔اس نے اور اس کے دوستوں نے عنایت خاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"سچ ہے گربہ کشتن روزِ اول۔"

گربہ کشتن روزِ اول نہ کہ بعد

دیکھیے: گربہ کشتن روزِ اول

گرو کہیں سو کیجئے، جو کریں سو کریئے ناہیں

اندھی تقلید پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔بغیر سوچ سمجھے کسی کی پیروی نہ کرنا چاہئے۔استاد یا مرشد جس کام کو کرنے کے لیے کہیں اس کام کو تو کرنا چاہئے مگر جس کام کو وہ خود کریں اور اپنے شاگردوں سے کرنے کے لیے نہ کہیں اسے قطعی نہ کریں۔جب کوئی شاگرد بے سوچے سمجھے اپنے استاد کی نقل کرتا ہے تو اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کوئی شاگرد اپنے استاد کی نقل کیا کرتا تھا یعنی جو کام استاد کرتے تھے۔وہی کام شاگرد کرتا تھا۔استاد اپنے شاگرد کی اس حرکت سے خوش نہیں تھے۔سبق سکھانے کی غرض سے ایک مرتبہ استاد اپنے شاگرد کو لے کر بازار گئے۔ایک میخانے میں جا کر انہوں نے شراب پی۔شاگرد نے جب استاد کو شراب پیتے دیکھا تو خود بھی پینے لگا۔شراب پینے کے بعد جب وہ آگے بڑھے تو کسی حلوائی کی دوکان میں ایک بڑی کڑھائی میں تیل کھول رہا تھا۔استاد اس تیل کی کڑھائی میں کود پڑے۔شاگرد چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔استاد نے شاگرد کی طرف دیکھ کر کہا: "اب تو میری تقلید کیوں نہیں کرتا؟"

شاگرد نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "ہمت نہیں ہوتی۔"

اس پر استاد نے کہا: "گرو کہیں سو کیجئے، جو کریں سو کریئے ناہیں۔"

گنجا دھوپ سے بچنے گیا، سر پر بیل گرا

ایک آفت سے بچنے کی تدبیر کی اس سے بڑی دوست آفت میں مبتلا ہو گئے۔ الٹے لینے کے دینے پڑے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص عافیت کی امید میں مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک چھوٹی سی حکایت سے ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک گنجا شخص کسی سنسان جنگل سے گزر رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت اپنے شباب پر تھی۔ دور دور تک کوئی سایہ دار درخت نہ تھا۔ دھوپ کی تمازت سے گنجے کی کھوپڑی کا حال دگرگوں تھا۔ وہ سایہ دار درخت کی تلاش میں تھا کہ دور ایک بیل کا پیڑ نظر آیا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے وہ جوں ہی اس پیڑ کے نیچے جا کر کھڑا ہوا۔ بیل کا ایک بڑا پھل اس کے سر پر آ گرا جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور وہ لہولہان ہو گیا۔ ایک شخص جو اس راستے سے گزر رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھ کر کہا:

''گنجا دھوپ سے بچنے گیا، سر پر بیل گرا۔''

گنگا کو آنا تھا، بھاگیرتھ کے سر جس ہوا

ایک بات ہونے والی تھی مگر قسمت نے مفت میں ناموری کسی اور کو دے دی۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی شخص کی شہرت اور ناموری ایسے کام کے لیے ہو جس کا ہونا لازمی تھا۔ اس کہاوت کی نسبت مشہور ہے کہ:

حکایت: جب کپل کی بد دعا سے سگر کے ساٹھ ہزار بیٹے جل کر بھسم ہو گئے تو ان کی نجات کے لیے سگر خاندان کے راجاؤں نے گنگا ندی کو جنت سے زمین پر لانے کی بہت کوشش کی مگر ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ پنڈتوں نے سگر خاندان کے راجاؤں سے کہا تھا کہ اگر وہ لوگ گنگا جل لائیں اور پنڈ چڑھائیں تو ان کے اسلاف کی نجات ہو سکتی ہے اور وہ جنت کو جا سکتے ہیں۔ جنت کو زمین پر لانے کی کوشش میں جب سبھی راجا ناکام ہو گئے تو آخر میں بھاگیرتھ نے گنگا کو زمین پر لانے کا عہد کر کے سخت ترین عبادت کرنا شروع کی۔ اس کی عبادت مقبول ہوئی اور بشنو نے خوش ہو کر مراد پوری کر دی۔ جب گنگا نے جنت سے روانہ ہونے اور زمین پر آنے کا قصد کیا تو زمین اس خوف سے کانپنے لگی کہ اگر گنگا کی تیز دھار اس پر پڑی تو وہ شق ہو جائے گی۔ اس نے شیو جی سے منت کی۔ شیو جی نے ترس کھا کر گنگا کی تیز دھار کو اپنی جٹا

میں لے لیا اور جٹا سے ایک قطرہ کنڈل یعنی کچکول میں ڈال کر بھاگیرتھ کو دیا وہ سوروں کے درّے اُسے رکھ کر گھر گیا کہ باجے گاجے اور دھوم دھام سے گنگا کو لے کر جائے گا۔ بھاگیرتھ کے گھر روانہ ہونے کے تھوڑی دیر کے بعد ایک گڈریا اپنی گنگا نامی گائے کو پکارتا ہوا وہاں پہنچا۔ گنگا سمجھی کہ بھاگیرتھ ہی اسے بلا رہا ہے۔ لہٰذا بہہ نکلی۔ جب بھاگیرتھ وہاں آیا تو بہت متفکر ہوا۔ تھوڑی دیر میں اسے گنگا کی آواز سنائی دی کہ جب میرا بہاؤ سوروں کی طرف ہوگا تو تیرا کام ہو جائے گا فکر مند مت ہو۔

ایک اعتقاد کے مطابق جب گنگا کی تیز دھار جنت سے زمین کی طرف بڑھی تو اس کی تیزی کو کم کرنے کی غرض سے شیو جی نے اس کو اپنی جٹا میں الجھا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی جٹا سے چند قطرے زمین پر ڈالے۔ زمین پر گرتے ہی گنگا بھاگیرتھ کے ساتھ گنگا ساگر کی طرف، جہاں کپل نے سگر کے ساٹھ ہزار بیٹوں کو جلا کر خاک کر دیا تھا، جا رہی تھی کہ راستے میں جنہ رشی نے اسے پی لیا۔ بھاگیرتھ کے بہت منت سماجت کرنے کے بعد انہوں نے اسے اپنے زانو سے نکالا۔ پران کے مطابق گنگا کی تین دھاریں ہیں۔ ایک دھار جنت میں ہے جسے آکاش گنگا کہتے ہیں، دوسری زمین پر ہے اور تیسری پاتال یعنی تحت الثریٰ میں ہے۔ غرض گنگا کو تو زمین پر آنا تھا مگر بھاگیرتھ سبب ہوا اسی وجہ سے یہ مثل مشہور ہوگئی کہ:

''گنگا کو آنا تھا، بھاگیرتھ کے سر جس ہوا۔''

گواہی ایک خرگوش کی

بگڑے ہوئے کام کو عقل مندی سے سنوارنا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص اپنی بگڑی ہوئی بات یا اپنی ناکامی کو نہایت ہوشیاری سے بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک لوک کہانی سے ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک بنیے کو اپنی تجارت کی غرض سے پردیس کا سفر کرنا پڑا۔ جب وہ ایک سنسان جنگل کے راستے سے گزر رہا تھا تو اسے وہاں کچھ ٹھگوں نے گھیر لیا۔ بنیا بہت گھبرایا لیکن اس کا وہاں سے بچ نکلنا مشکل تھا۔ موقع کی نزاکت کو بھانپ کر بنیے نے فوراً ایک دری بچھائی۔ روپیوں کی تھیلی اور بہی کھول کر اس پر بیٹھ گیا۔ ٹھگوں نے اس سے کہا:

''سیٹھ جی ہمیں روپیوں کی بہت ضرورت ہے، براہِ مہربانی ادھار دے دیجیے۔''

بنیے نے کہا:

''ٹھیک ہے جتنے روپیوں کی ضرورت ہو لے لو لیکن کسی گواہ کا انتظام کرو۔''

اتفاق سے اسی وقت وہاں سے ایک خرگوش نکلا۔ ٹھگوں نے اسے پکڑ لیا اور کہا:

''لیجئے سیٹھ جی گواہ کا بھی انتظام ہو گیا۔ اب ہم کو ہماری ضرورت کے روپے دے دو اور گواہی میں خرگوش کا نام لکھ لو۔''

ناچار سیٹھ کو ایسا ہی کرنا پڑا۔ گواہی میں خرگوش کو لکھا کر اور سیٹھ سے روپے اینٹھ کر ٹھگ نو دو گیارہ ہو گئے۔ بنیا ہاتھ ملتا ہوا گھر لوٹا۔ بنیا موقع کی تلاش میں تھا کہ ایک دن وہی ٹھگ شہر میں نظر آئے۔ بنیے نے ان کو پکڑوا کر راجا کے سامنے پیش کرایا۔ بنیے نے راجا سے کہا:

''مہاراج! انہوں نے مجھ سے جنگل میں روپے ادھار لیے تھے مگر اب تک واپس نہیں کیے۔''

ٹھگوں نے کہا: ''حضور! ہم نے اس سے کبھی روپے ادھار نہیں لئے، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر ہم نے روپے لیے ہیں تو یہ ثبوت پیش کرے اور گواہ کا نام بھی بتائے۔''

بنیے نے اپنی بہی کھول کر دیکھا اور کہا:

''مہاراج انہوں نے ایک لومڑی کے سامنے روپے لیے تھے اور لومڑی ہی کی گواہی لکھائی تھی۔''

اتنا سنتے ہی ایک ٹھگ بول اٹھا۔ کیوں جھوٹ بولتا ہے، وہاں کوئی لومڑی نہیں تھی صرف ایک خرگوش تھا۔ اتنا سنتے ہی راجا سمجھ گیا۔ اس نے بنیے کو نہ صرف اس کے روپے دلوائے بلکہ ٹھگوں کو کڑی سزا بھی دی۔

گود میں بیٹھ کر ڈاڑھی کھسوٹے

دیکھیے: جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی کھونٹے۔

گود میں بیٹھ کر ڈاڑھی کھونٹے

دیکھیے: جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی کھونٹے۔

گود میں بیٹھ کر ڈاڑھی نوچے

دیکھیے: جس کی گود میں بیٹھے، اس کی ڈاڑھی کھونٹے۔

گونوجھا کا لڑکا

نہایت نکما، بالکل ناکارہ، جو کسی کام کا نہ ہو۔ یہ کہاوت ایسے شخص کے لیے مستعمل ہے جو کھائے پیے تو بہت مگر کام بالکل نہ کرے اور کسی لائق نہ ہو۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی جگہ گونوجھا نامی ایک شخص رہتا تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا:

"گونوجھا! آپ کے کتنے لڑکے ہیں۔"

اس نے جواب دیا:

"لڑکا تو ایک ہی ہے مگر وہ دو آدمیوں کا کھانا اکیلے ہی کھا جاتا ہے۔ تین آدمیوں کی جگہ گھیر کر سوتا ہے اور کام ایک آدمی کا بھی نہیں کرتا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرا ایک بھی لڑکا نہیں ہے۔"

گونوجھا کی بلی

نہایت چالاک اور ہوشیار شخص۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص نہایت ہوشیاری کے ساتھ لاگوں کو بیوقوف بنائے اور خود زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی راجا کے دربار میں بہت سے درباری تھے۔ ان میں گونو نامی درباری بھی تھا جو نہایت ہوشیار اور چالاک تھا۔ ایک روز راجا نے اپنے تمام درباریوں کو ایک ایک بلی اور ایک ایک بھینس دی اور کہا:

"آپ لوگ ایک سال تک اپنی اپنی بھینسوں کا دودھ اپنی اپنی بلی کو پلائیں۔ جس کی بلی سب سے زیادہ موٹی اور تندرست ہوگی اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔"

تمام درباریوں نے گھر جا کر بلی کو بھینس کا دودھ پلانا شروع کر دیا اور رات دن اپنی اپنی بلی کی خدمت کرنے لگے تمام درباریوں نے اپنی اپنی بلی کو دودھ پلا پلا کر موٹا اور تندرست کر دیا۔ ہر درباری خوش تھا کہ انعام واکرام کا حق دار وہی ہوگا۔ گونو جھا نے بھینس کے دودھ کو ایک برتن میں گرم کیا اور اپنی بلی کے منہ کو اس میں ڈبو دیا۔ پھر کیا تھا بلی ٹھنڈے دودھ کو دیکھ کر ڈرنے لگی۔ گونو جھا سال بھر تک بھینس کا دودھ خود پیتا رہا۔ سال پورا ہونے پر جب تمام درباری اپنی اپنی بلی کو لے کر دربار میں پہنچے تو اسی وقت اپنی دبلی پتلی بلی کو لے کر گونو جھا بھی وہاں پہنچا۔ گونو جھا کی لاغر بلی کو دیکھ کر تمام درباری ہنسنے لگے۔ راجا نے گونو جھا سے پوچھا: ''تمہاری بلی سب سے زیادہ دبلی کیوں ہے؟''

گونو جھا نے نہایت عاجزی سے جواب دیا:

''مہاراج! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ بلی دودھ نہیں پیتی بلکہ دودھ کو دیکھ کر بھاگ جاتی ہے۔ اس لیے دبلی ہے۔''

راجا نے ایک برتن میں دودھ منگوایا اور جوں ہی بلی کے سامنے پینے کے لیے رکھوایا، بلی دودھ کو دیکھتے ہی وہاں سے بھاگ گئی۔ راجا اور درباری سمجھے کہ گونو جھا کا بیان صحیح ہے۔ لہٰذا راجا نے خوش ہو کر گونو جھا کو انعام واکرام سے نوازا۔

گونو جھا کی لاٹھی

بیوقوفی کا کام۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی ایسا شخص کام کرے جس سے فائدے کے بجائے نقصان ہو۔ محنت زیادہ نتیجہ کچھ نہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ گونو جھا نامی ایک شخص کسی لکڑی کو چھیل کر لاٹھی بنا رہا تھا۔ وہ اس لکڑی کے ایک سرے کو کم چھیلتا تو دوسرے کو زیادہ۔ پھر کم چھیلے گئے کنارے کو چھیلنا شروع کر دیتا اور چھیلتے چھیلتے زیادہ چھل جاتا۔ زیادہ چھل جانے پر پھر پہلے سرے کو چھیل کر برابر کرنے کی کوشش کرتا اور اپنی دھن میں دوسرے سرے سے زیادہ چھیل جاتا۔ غرض اسی عمل کو دونوں کناروں پر باری باری سے کرنے پر وہ پوری لکڑی ہی چھیلتے چھیلتے ختم ہوگئی مگر لاٹھی نہیں بن سکی۔ اس لیے نا سمجھی سے کام کرنے والے کے لیے اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔

گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی

ایک کام سے عذر کیا دوسرا کام اور سپرد ہو گیا۔ اُلٹے لینے کے دینے پڑے۔ ایک آفت سے بچنے کی تدبیر میں دوسری بڑی آفت سر پڑی۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر میں کسی دوسری مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: ایک شخص کسی مولوی کا معتقد تھا اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز مولوی صاحب نے اس سے کہا:

''تم روزے رکھا کرو۔ اسی میں تمہاری بھلائی اور بہتری ہے۔''

اس نے مولوی صاحب کے حکم کی تعمیل میں روزے رکھنا شروع کر دیئے مگر جلد ہی وہ روزوں سے تنگ آ گیا۔ وہ روزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے کہا:

''میرے روزے معاف کر دیجئے۔''

مولوی صاحب نے جواب میں کہا:

''روزوں کے ساتھ ساتھ پابندی سے نمازیں بھی پڑھا کرو تا کہ دوسرا فرض بھی ادا ہو۔''

ناچار اس کو مولوی کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ اسی وقت سے مثل مشہور ہو گئی کہ گئے تھے روزے بخشوانے نماز گلے پڑی۔

گئے تھے نماز کو روزے گلے پڑے

دیکھیے: گئے تھے روزے بخشوانے نماز گلے پڑی۔

اس کہاوت کے تعلق سے جو حکایت بیان کی جاتی ہے وہ معمولی تحریف و ترمیم کے ساتھ اس طرح ہے:

حکایت: کسی شخص نے مولوی صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے نمازیں پڑھنا شروع کر دیں۔ جب وہ پابندی وقت اور نماز سے پریشان ہو گیا تو نمازیں معاف کرانے کی غرض سے مولوی صاحب کی

خدمت میں حاضر ہوا۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا نمازوں کے ساتھ روزے بھی رکھا کرو تا کہ دونوں فرض ادا ہو سکیں۔

گھر جل گیا تب انگوٹھی پوچھی

دیکھیے: گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں۔

گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں

کام بگڑ جانے کے بعد خیریت پوچھنا۔ یہ کہاوت ایسے موقعوں پر بولی جاتی ہے جب کسی شخص کا حال دریافت کیا جائے۔ اس کہاوت سے تعلق سے ایک حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک احمق عورت رہتی تھی۔ خوش قسمتی سے اس نے ایک بار نئی چوڑیاں پہنیں۔ اب اس سے جس کی ملاقات ہوتی، اس سے ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرتی تا کہ اس کی نظر چوڑیوں پر پڑ جائے اور وہ اس کی چوڑیوں کی تعریف کرے۔ چوڑیوں کی تعریف کرنا تو دور، جب ان کی طرف کسی نے دیکھا بھی نہیں تو اس نے گھر آ کر اپنے چھپر میں آگ لگا دی۔ جب آگ کی لپٹیں بلند ہونے لگیں تو محلے کے لوگ دوڑے۔

آگ بجھانے کی کوشش کرتے وقت کسی نے اس عورت سے پوچھ لیا کہ آگ کیسے لگی تو اس نے اپنے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہنا شروع کر دیا:

"آگ ادھر لگی، ایسے لگی، یوں لگی۔"

اسی وقت ایک دوسری عورت کی نظر اس کی نئی چوڑیوں پر پڑ گئی۔ اس نے کہا:

"بہن! یہ بتاؤ کہ یہ چوڑیاں کس دُکان سے خریدی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔"

جواب میں اس احمق عورت نے کہا:

"گھر جل گیا تو چوڑیاں پوچھیں۔"

یہ حکایت معمولی ترمیم کے ساتھ اس طرح بھی مشہور ہے کہ اس احمق عورت نے نئی چوڑیوں کے بجائے نئی انگوٹھی پہنی تھی۔ اس لیے یہ کہاوت یوں بھی کہی جاتی ہے:

"گھر جل گیا تب انگوٹھی پوچھی۔"

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

راز دار کی دشمنی بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ اکثر محرم اسرار ہی گھر کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ یہ کہاوت اس محل پر بولتے ہیں جب کوئی راز دار کچھ فساد اٹھائے۔ یہ کہاوت اس وقت بھی بولی جاتی ہے جب گھر والوں ہی میں پھوٹ پڑ جائے اور لاکھ احتیاط برتنے کے باوجود فساد برپا ہو جائے اور دشمن کو اس نفاق سے فائدہ پہنچے۔

اس کہاوت میں رام چندر جی اور لنکا کے راجا راون کے بھائی وبھیشن کے قصہ کی طرف تلمیح ہے۔

تلمیح: جب راجا رام چندر جی اپنے بھائی لچھمن اور اپنی بیوی سیتا کے ساتھ جنگل میں بن باس کی مدت گزار رہے تھے۔ اسی دوران لنکا کا راجا راون سیتا جی کو اکیلا پا کر اٹھا لے گیا۔ رام چندر جی کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے بندروں کی فوج کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کر دی تا کہ سیتا جی کو روان کی قید سے چھڑا سکیں۔ زمانۂ جنگ میں راون کے بھائی وبھیشن سے رام چندر جی کو بہت مدد ملی۔ وبھیشن کو یہ وردان ملا تھا کہ اس سے کوئی غلط کام سرزد نہ ہوگا۔ ایماندار اور راکھششوں کا مخالف رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس سے اور راون سے ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔ راون نے اپنی طاقت کے زور سے وبھیشن کو حکومت کی تمام مراعات سے محروم کر دیا تھا۔ وبھیشن اڑ کر کیلاش پہاڑ پر گیا اور شیو جی کی ہدایت پر واپس آ کر اس نے رام چندر جی کا ساتھ دیا۔ اس نے رام چندر جی کو لنکا کے وہ تمام راز بتائے جن کے بغیر لنکا کو فتح کرنا دشوار تھا۔ راون کی شکست اور موت کے بعد لنکا کی حکومت رام چندر جی نے وبھیشن کے حوالے کر دی تھی۔ اسی وقت سے یہ مثل مشہور ہوئی کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کہاوت کا تعلق ہنومان سے ہے جو روان کا بھانجا اور رام چندر جی کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ کیوں کہ اس نے رام چندر جی کو لنکا کے ان بہت سے بھیدوں سے واقفیت کروائی تھی جن کے بغیر لنکا کو فتح کرنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ اس نے رام چندر جی کی خبریں سیتا جی کو اور سیتا جی کی خبریں رام چندر جی کو برابر پہنچائی تھیں۔

گھڑی میں گھڑیاں باجے

آدمی کے مرنے میں کیا رکھا ہے۔ مرتے دیر نہیں لگتی۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ گھڑی میں کچھ ہے تو دم بھر میں کچھ۔ زمانہ کا حال دگرگوں ہوتے دیر نہیں لگتی۔

یہ مثل ہندوؤں کی رسم میت سے متعلق ہے کیوں کہ جب ان میں کوئی بوڑھا یا خاص آدمی مرجاتا ہے تو اسے باجے گاجے سے گھنٹے بجاتے اور مورچھل کرتے ہوئے نذرِ آتش کرنے کے لیے شمشان لے جاتے ہیں۔ اس لیے اس سے غرض یہ ہے کہ عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ ابھی تو یہ زندہ تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے مرگھٹ کی تیاری ہوگئی۔ دنیا کا بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔ گھڑی میں گھڑیال بجوادیتی ہے۔

لالچ بُری بلا ہے

طمع یا حرص سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں۔ لالچ بہت بری چیز ہے۔ لالچ کا انجام خراب ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے کئی لوک کتھائیں بیان کی جاتی ہیں۔ جن میں سے یہ تین بہت مشہور ہیں۔

حکایت ۱: ایک کتا کئی روز سے بھوکا تھا۔ وہ کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا کہ اسے کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ وہ اسے کسی ایسی جگہ لے جاکر کھانا چاہتا تھا جہاں دوسرے بھوکے جانوروں سے محفوظ رہے۔ یہ سوچ کر وہ کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں چل پڑا۔ وہ روٹی کے ٹکڑے کو منہ میں دبائے ہوئے ندی کے ایک پل کے اوپر سے گزر رہا تھا کہ اس کو پانی میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ وہ سمجھا کہ یہ کوئی دوسرا کتا ہے جو اپنے منہ میں روٹی کا ٹکڑا دبائے ہوئے ہے۔ کیوں نہ اس کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین کر اپنا پیٹ بھرلیا جائے یہ سوچ کر بھونکنے کے لیے اس نے جوں ہی اپنا منہ کھولا کہ اس کی روٹی کا ٹکڑا پانی میں گرگیا۔ غرض لالچ کی وجہ سے وہ اپنی چیز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

دوسری حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۲: کسی شہر میں ایک برہمن رہتا تھا۔ کسی کام سے وہ ایک گاؤں میں گیا۔ جب وہ وہاں سے لوٹنے لگا تو اس کے ایک دوست نے دودھ سے بھرا ہوا ایک برتن بطور تحفہ دیا۔ وہ اسے لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جنگل سے ہوکر گزرنا تھا۔ راستے میں اسے ایک سانپ نظر آیا جو اس کا راستہ روک کر پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ پنڈت خوف سے لرزنے لگا! اس نے دودھ کا برتن سانپ کے آگے رکھ دیا۔ سانپ نے سارا دودھ پی لیا۔ دودھ پینے کے بعد سانپ اپنے بل میں گیا اور منہ میں ایک اشرفی دابے ہوئے لوٹا۔ اس نے وہ اشرفی دودھ کے برتن میں ڈال دی اور وہاں سے چلا گیا۔ پنڈت بہت خوش ہوا۔ اب وہ روزانہ دودھ لے کر سانپ کے پاس آنے لگا۔ سانپ تبھی اسے روزانہ ایک اشرفی دینے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں برہمن بہت مالدار ہوگیا۔

ایک روز برہمن بیمار پڑ گیا۔ وہ سانپ کو دودھ پلانے نہ جا سکا۔ اس نے اپنے بیٹے کو دودھ دے کر سانپ کے پاس بھیجا۔ برہمن کے بیٹے نے دودھ کا برتن سانپ کے آگے رکھ دیا۔ سانپ نے دودھ پیا اور اپنے بل کے اندر جا کر ایک اشرفی لے آیا۔ اس نے اشرفی کو دودھ کے برتن میں ڈال دی۔ برہمن کے لڑکے نے اشرفی اٹھالی اور خوشی خوشی گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ سوچنے لگا کہ سانپ کے پاس بہت سی اشرفیاں ہیں جو اس کے بل میں پڑی ہونگی۔ کیوں نہ سانپ کو مار کر تمام اشرفیاں ایک ساتھ حاصل کر لی جائیں۔

دوسرے دن برہمن کا لڑکا پھر سانپ کو دودھ پلانے کے لیے آیا۔ بل کے پاس پہنچ کر اس نے دودھ کا برتن رکھ دیا۔ سانپ بل سے نکل آیا اور دودھ پی کر پھر بل میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک اشرفی لے کر لوٹ آیا۔ برتن میں اشرفی ڈال کر وہ جوں ہی بل کی طرف مڑا۔ موقع پا کر برہمن کے لڑکے نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور سانپ کے پھن پر دے مارا۔ نشانہ چوک گیا پتھر سانپ کی دم پر لگا۔ سانپ غصے سے پھنکارتا ہوا برہمن کے لڑکے کی طرف بڑھا اور لڑکے کو ڈس لیا۔ لڑکا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جب شام تک برہمن کا لڑکا گھر نہیں لوٹا تو برہمن کو تشویش ہوئی۔ وہ اس کو ڈھونڈتا ہوا سانپ کے بل تک آیا۔ سانپ پہلے ہی سے طیش میں تھا۔ برہمن کو دیکھتے ہی وہ اس پر بھی جھپٹا اور اسے بھی ڈس لیا۔ برہمن بھی دیکھتے دیکھتے وہیں مر گیا۔ لالچی بیٹے کی وجہ سے برہمن کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

تیسری حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت ۳: کسی گاؤں میں ایک نہایت غریب شخص رہتا تھا۔ وہ روزی روٹی سے پریشان تھا۔ ایک روز اپنے دروازے پر وہ اسی غم میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں سے ایک بزرگ کا گزر ہوا جن کے ہاتھ میں ایک مرغی تھی۔ انہوں نے اس مرغی کو اسے دیتے ہوئے کہا:

"لے اس کے ذریعہ تیری غریبی دور ہو جائے گی۔"

اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس مرغی کو لے لیا۔ دوسرے دن مرغی نے ایک سونے کا انڈا دیا۔ وہ اسے بیچ کر گھر کا سامان لایا۔ تیسرے دن مرغی نے پھر ایک سونے کا انڈا دیا۔ اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا کہ مرغی روزانہ ایک سونے کا انڈا دیتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نادار شخص مالدار ہونے لگا۔ اس کی زندگی عیش و عشرت سے گزرنے لگی۔ ایک دن اس کے دل میں خیال آیا کہ مرغی کے پیٹ میں بہت سے انڈے بھرے ہیں۔ کیوں نہ تمام انڈوں کو ایک ساتھ نکال کر حاصل کر لیا جائے۔ انڈوں کو بیچ کر عظیم الشان محل

تعمیر کروایا جائے اور ضروریات زندگی کا سامان لایا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے مرغی کے پیٹ کو ایک تیز چھری سے چاک کر دیا مگر اس کے پیٹ سے ایک بھی انڈا برآمد نہیں ہوا اور مرغی کی جان بھی گئی۔ وہ کف افسوس مل کر رہ گیا۔ سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔

لال کتاب اٹھ بولی یوں، تیلی بیل لڑایا کیوں
کھلی کھلا کر کیا مسٹنڈ، بیل کا بیل اور ڈنڈ کا ڈنڈ

دیکھیے: جانور ہی تو ہے۔

لالا جی آج مر گئے، بڑی بہو کو بھیج دو

یہ کہاوت ایسے رمی خط کے لیے طنزاً کہی جاتی ہے جس میں لکھا کچھ جائے اور پڑھا کچھ جائے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک سیٹھ جی رہتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنی بڑی بہو کے گھر ایک چٹھی بھیجی۔ جس میں انہوں نے لکھا کہ "لالا جی اجمیر گئے، بڑی بہو کو بھیج دو۔" کسی پڑھنے والے نے جب یہ چٹھی پڑھی تو اس نے اس جملہ کو اس طرح پڑھا:

"لالہ جی آج مر۔ گئے، بڑی بہو کو بھیج دو۔"

یہ سننا تھا کہ بڑی بہو روتی، پیٹتی اپنی سسرال آ گئی۔ لالہ جی سلامت و زندہ تھے۔ جب اس نے چٹھی دکھائی تو بات صاف ہوئی۔

لیکوے کا نہیں، ٹپکوے کا ڈر ہے

دیکھیے: ٹپکے کا ڈر ہے۔

لٹے کو ماریں شاہ مدار

دیکھیے: مرتے کو ماریں شاہ مدار۔

لڑکوں سے شیطان بھی ہار گیا ہے

دیکھیے: شیطان نے بھی لڑکوں سے پناہ مانگی ہے۔

لکھیں عیسٰی، پڑھیں موسٰی

لکھے موسٰی، پڑھے خدا۔

لکھے موسٰی، پڑھے خدا - لکھیں موسا پڑھیں خود آ

ایسا باریک یا بد خط لکھنا کہ جسے اپنے سوا دوسرا نہ پڑھ سکے۔ موسٰی پیغمبر کا لکھا خدا کے سوا، جو اس کا ہم راز تھا، دوسرا نہیں پڑھ سکتا۔ چوں کہ موسٰی علیہ السلام خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور اکثر راز کی باتیں اشاروں اور کنایوں میں ہم ادا ہوا کرتی تھیں۔ اس سبب سے طنزاً ایسے بد خط کو کہنے لگے کہ وہ جس کا خط وہی پڑھ سکے جسے القا ہو۔ صاحب فرہنگ آصفیہ رقم طراز ہیں کہ اول معنی میں ''مو'' بمعنی ''بال کی مانند'' اور ''خود آ''، یعنی ''آپ آ کر سمجھنا چاہئے'' اور دوسرے میں ''موسٰی پیغمبر'' اور ''خدا'' کی طرف اشارہ خیال کرنا چاہئے مگر املا دوسرے معنی کے موافق رواج ہے اور زیادہ تر لوگ اسی طرح تلمیح کرتے ہیں پس اس وجہ سے یہی املا لکھا گیا ورنہ اس طرح لکھنا غلط تھا۔

اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت بھی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک سپاہی کو اپنے گھر سے آئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک کایستھ کے پاس گیا اور اس سے ایک چٹھی لکھنے کی گزارش کی۔ کایستھ نے کہا:

''میرے پیروں میں شدید درد ہو رہا ہے اس لیے میں چٹھی نہیں لکھ سکتا۔''

سپاہی نے حیرت سے کہا: ''چٹھی تو ہاتھ سے لکھی جاتی ہے نہ پاؤں سے۔''

کایستھ نے جواب دیا: ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن جب میں کسی کے لیے چٹھی لکھتا ہوں تو مجھے ہی وہاں جا کر اس چٹھی کو پڑھنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ میرا لکھا ہوا کوئی دوسرا نہیں پڑھ سکتا۔ پیروں میں درد ہونے کی وجہ سے میں چل پھر نہیں سکتا۔ اس لیے چٹھی لکھنے سے معذور ہوں۔''

للو کا باپ جگ دھر

ایرا غیرا۔ فلاں ابن فلاں۔ امکا ڈھمکا۔

یہ فقرہ اصل میں یوں تھا کہ ڈِھی کائڑاں مرادے للو کا باپ جگدھر یعنی ہم کو للو اور اس کے باپ جگدھر سے کچھ کام نہیں۔ یہ قصہ بیوہ کی شادی کرنے پر مبنی ہے جس کی وجہ اس طرح زبان زدِ خلائق ہے کہ آگرہ میں سیٹھ للو جگدھر نے بیوہ کی دوسری شادی کی تجویز پیش کی۔ اسی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے اس نے شہر کے معزز حضرات کی ایک سبھا کی جس میں بیوہ کی شادی نہ کرنے کی رسم کو ختم کر دینا چاہا۔ اثنائے تقریر میں ایک شخص نے خفا ہو کر کہا: "للو کا باپ جگدھر"

اور سبھا سے اٹھ کر چلا گیا یعنی ہم کو نہ اس سے مطلب ہے اور نہ اس سے۔ جب سے یہ مثل بن گئی۔

لنکا میں جسے دیکھا، وہ باون گز کا

دیکھیے: لنکا میں سب باون گز کے۔

لنکا میں جو چھوٹا، سو باون ہی گز کا

دیکھیے: لنکا میں سب باون گز کے۔

لنکا میں جو چھوٹا، سو باون گز کا

دیکھیے: لنکا میں سب باون گز کے۔

لنکا میں سب باون گز کے

یہ کہاوت ایسے مقام یا مجلس کے حق میں بولی جاتی ہے جہاں سب کے سب شیخی باز، لاف زن، مغرور، متکبر یا نہایت مفسد، شریر، فتنہ انگیز، فتنہ پرداز اور آفتِ روزگار ہوں یا یوں کہو کہ جن کا بچہ بچہ فسادی، متفنی ہو، ان لوگوں کی نسبت بولتے ہیں۔

چونکہ لنکا کے راجا راون کے دس سر تھے۔ اس کا قد بہت لمبا چوڑا تھا اور لنکا ہمیشہ سے دیوتاؤں اور جنوں کا مقام مانا گیا ہے۔ اس سبب سے وہاں کے لوگ بڑے بڑے قد کے اور ان کے بچے باون باون گز کے خیال کیے گئے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ ایسے مقام کا چھوٹے سے چھوٹا بھی دوسری جگہوں کے بڑوں سے بھی بڑا یعنی سب گنوں پورا ہوتا ہے۔

لیتے کچھ اور، دیتے کچھ اور

جب کوئی شخص کسی سے کوئی چیز لیتے وقت خوشامد کرے اور دیتے وقت بہانہ کرے تب یہ مثل کہتے ہیں۔ یہ مثل اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی سے کوئی چیز لے تو سوایا کر کے لے مگر جب دے تو کم دے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک نہایت چالاک اور ہوشیار بنیا رہتا تھا۔ اس نے ایک لڑکے کو اپنے یہاں نوکر رکھا۔ بنیے نے اس لڑکے کے دو نام رکھے۔ ایک نام لبا اور دوسرا دبا۔ بنیا جب کسی سے مال خریدتا تو لڑکے کو لبا کہہ کر پکارتا۔ جس کا مطلب ہوتا کہ مال لینا یعنی خریدنا ہے۔ لبا کا لفظ سن کر لڑکا سیر کے بجائے سوا سیر کا بانٹ لے کر آ جاتا اور بنیا اس باٹ سے تول کر مال خریدتا۔ اسی طرح بنیے کو اپنا مال فروخت کرنا ہوتا تو اپنے اسی نوکر کو دبا کہہ کر پکارتا جس کا مطلب ہوتا کہ مال بیچنا یا فروخت کرنا ہے۔ دبا کی آواز سن کر وہ سیر کے بجائے تین پاؤ کا بانٹ اٹھا لاتا اور بنیا اسی بانٹ سے مال تول کر فروخت کرتا۔ غرض جب بنیا کسی سے مال خریدتا تو سیر کا سوا سیر تول کر لیتا اور جب کسی کو مال بیچتا تو سیر کا تین پاؤ ہی تول کر دیتا۔ ایک زمانہ تک وہ اسی طرح بے ایمانی کرتا رہا۔ ایک دن جب کوئی شخص بنیے کی اس چالاکی کو تاڑ گیا تو اس نے کہا:

"لیتے کچھ اور دیتے کچھ اور۔"

لیکھا جوکھا جوں کا توں، سارا کنبہ ڈوبا کیوں؟

حساب کتاب تو ٹھیک ہے مگر پورا خاندان کیوں غرق آب ہو گیا۔ حساب ٹھیک ہونے کے باوجود کام کیوں بگڑ گیا۔ یہ کہاوت ایسے شخص کے لیے طنزاً کہی جاتی ہے جو خود کو نہایت ہوشیار اور عقل مند خیال کرے مگر اس کے کام احمقانہ ہوں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کسی گاؤں میں ایک کایستھ رہتا تھا۔ جو علم ریاضی میں ماہر تھا مگر تجربات میں بالکل کورا۔ ایک مرتبہ اسے اپنے خاندان یا لڑکوں کے ساتھ کسی دوسری جگہ جانے کا اتفاق ہوا۔ راستے میں ایک دریا تھا جسے پار کرنے کے لیے پانی سے گزرنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ اس دریا کو پار کرنے کے لیے کوئی پل نہیں تھا۔ دریا کی گہرائی کہیں کم تھی اور کہیں زیادہ۔ کایستھ نے دریا کو پار کرنے کے لیے علم ریاضی کی مدد لی۔ اس نے سب سے پہلے دریا کی اوسط گہرائی کی پیائش کی۔ اس کے بعد کنبے کے تمام افراد یا تمام لڑکوں کی لمبائی ناپ کر اوسط لمبائی نکالی۔ دریا کی گہرائی کنبہ کے تمام افراد یا تمام لڑکوں کی اوسط لمبائی سے کم تھی۔ اس لیے اس نے سب کو دریا پار کرنے کا حکم دے دیا۔ دریا پار کرنے پر تمام افراد اس میں ڈوب گئے کیوں کہ دریار کی گہرائی زیادہ تھی اور افراد کی اپنی اپنی لمبائی کم۔ کایستھ ان کو ڈوبتا ہوا دیکھ کر ہاتھ ملتا رہ گیا اور بار بار زبان سے کہتا جاتا تھا:

''لیکھا جوکھا جوں کا توں، سارا کنبہ ڈوبا کیوں۔''

یا لیکھا جوکھا چاہیں، لڑکے ڈوبے کا ہیں۔ سچ ہے کتابی علم اور عملی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تجربات کے بغیر علم مکمل نہیں ہوتا۔

لیکھا جوکھا چاہیں، لڑکے ڈوبے کاہیں؟

دیکھیے: لیکھا جوکھا جوں کا تیوں، سارا کنبہ ڈوبا کیوں؟

لینا ایک نہ دینا دو

حاصل نہ حصول۔ فائدہ نہ غرض۔ ناحق مصیبت۔ مفت کی علت میں پھنس جانا۔ نہ کسی سے ایک لیں گے نہ دو دیں گے۔ اس کہاوت کی نسبت سے کئی چھوٹی چھوٹی لوک کہانیاں مشہور ہیں جن میں سے دو بہت مشہور ہیں۔

کہانی: پہلی کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک مینڈک اور ایک مور کی آپس میں دوستی ہوگئی۔ دونوں اکثر ساتھ ساتھ رہتے اور جنگل کی سیر کرتے۔ مور روزانہ اپنے دوست مینڈک کو باغ کی سیر کراتا۔ معمول کے مطابق ایک دن مور مینڈک کو باغ کی سیر کرا رہا تھا۔ جب کافی دیر ہوگئی تو مینڈک نے مور سے کہا:

''یار میں تو آج بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے میرے گھر پہنچادو۔''

مور نے مینڈک کو اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر جھٹ دریا کے کنارے پہنچا دیا۔ اس کے بعد جب وہ اپنے مقام پر واپس آیا تو اس وقت تک ایک چڑی مار نے دانے ڈال کر پرندوں کو پھنسانے کے لیے جال پھیلا دیا تھا۔ مور جوں ہی دانے کی لالچ میں جال کے پاس گیا تو اس میں پھنس گیا۔ مور نے چڑی مار سے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا:

''تم نے مجھے کیوں پکڑا ہے؟''

چڑی مار نے جواب دیا:

''پیسوں کی لالچ میں تم کو پکڑا ہے۔ تمہیں بیچ کر کچھ نہ کچھ رقم مل جائے گی۔''

مور نے کہا:

''اگر تم کو پیسوں کی ہی ضرورت ہے تو میرے ساتھ دریا کے کنارے چلو وہاں ایک میرا دوست رہتا ہے میں تم کو اس سے کچھ نہ کچھ دلوادوں گا۔''

چڑی مار مان گیا۔ مور اسے مینڈک کے پاس لایا اور اس سے کہا:

''یار! میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ چڑی مار نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ اسے کچھ دے کر مجھے آزاد کراؤ۔''

مینڈک نے کہا:

''اچھا۔''

اور یہ کہہ کر اس نے دریا میں غوطہ لگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد منہ میں ایک لعل لیے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس نے وہ لعل چڑی مار کے حوالے کر دیا۔ چڑی مار نے لعل لے کر کہا:

''میں تو اس کی رہائی کے عوض دو لعل اور لوں گا۔''

مینڈک نے کہا:

''ٹھیک ہے تم پہلے مور کو تو چھوڑ دو، میں ابھی دوسرا لعل لا کر تم کو دیتا ہوں۔''

چڑی مار نے دوسرے لعل کی لالچ میں مور کو رہا کر دیا اور دوسرے لعل کا انتظار کرنے لگا۔ رہا ہوتے ہی مینڈک نے اپنے دوست مور سے کہا:

''یار! اچھا موقع ہے فوراً اڑ جاؤ۔ اب تو لینا ایک نہ دینا دو۔''

یہ کہہ کر اس نے پانی میں غوطہ لگایا اور مور اڑ گیا۔

دوسری حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت ۲: کسی امیر کے بچے نے ایک دن ایک کچھوے کو تالاب سے پکڑ کر گھر لایا۔ وہ روزانہ اس سے کھیلا کرتا تھا۔ ایک دن بچے نے اس کو مکان کی آب چک میں ڈال دیا۔ امیر نے کچھوے پر ترس کھا کر اپنے نوکر کو حکم دیا کہ:

''کچھوے کو دریا میں ڈال آؤ۔''

نوکر نے کچھوے کو لے جا کر دریا میں ڈال دیا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ کچھوا تھوڑی دیر میں دریا سے نکل آیا۔ اس کے منہ میں ایک نایاب موتی تھا۔ اس نے وہ موتی نوکر کو دے دیا۔ موتی دیکھ کر نوکر کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس کے دل میں لالچ پیدا ہوا۔ اس نے فوراً کچھوے کو پکڑ لیا اور کہنے لگا:

''اگر تو اس کے جوڑ کا ایک موتی مجھے اور دے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا ورنہ نہیں۔''

کچھوے نے کہا:

''دریا میں بہت سے موتی ہیں۔ جن کا مالک میں ہوں۔ اگر تم مجھ کو یہ موتی دے دو تو میں اس کے جوڑ کا دوسرا موتی تم کو دریا سے نکال کر لا دوں۔''

نوکر نے وہ موتی کچھوے کو دے دیا اور اسے چھوڑ دیا۔ کچھوے نے فوراً دریا میں غوطہ لگایا اور یہ کہہ کر نظر سے غائب ہو گیا:

''لینا ایک نہ دینا دو۔''

یعنی تمہیں لینا ایک نہیں، مجھے دینے دو نہیں۔

ماتھ منڈائے فضیحت بھئے، ذات پانت دونوں سے گئے

ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ دونوں طرف سے مارے گئے۔ نقصان ہی نقصان اٹھایا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص فائدہ کی امید میں اپنے اصول یا راستے سے منحرف ہو جائے اور جب فائدہ نظر نہ آئے تو پھر اپنے اصول یا پرانے راستے کو اپنائے مگر وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک شخص رہتا تھا جو روزی روٹی سے پریشان تھا۔ ایک دن اس نے سوچا

دیگر کام کاج کے مقابلے بھیک مانگنا آسان ہے۔اس سے روزی روٹی کا مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے سر کے بال بنوائے اور بھکاری جیسے کپڑے پہن کر بھکاری کا روپ اختیار کیا۔لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ بھیک مانگنے سے تنگ آ گیا۔ روزی روٹی کمانے کا یہ راستہ اسے راس نہ آیا۔لہٰذا اس نے پھر سے اپنی ذات برادری میں شمولیت چاہی مگر اس کی برادری والوں نے اسے اپنی ذات پات میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔اس طرح وہ بھیک مانگنے سے بھی گیا اور اپنی ذات سے بھی اسے ہاتھ دھونا پڑا۔اس کی یہ حالت دیکھ کر کسی نے کہا:

''ماتھ منڈائے فضیحت بھئے، ذات پات دونوں سے گئے۔''

(مزید دیکھیے: پانڈے دونوں دین سے گئے۔)

مار سے بھوت بھاگتا ہے

دیکھیے: مار کے آگے بھوت بھاگے۔

مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے

دیکھیے: مار کے آگے بھوت بھاگے۔

مار کے آگے بھوت بھاگے

مار کے آگے سبھی دب جاتے ہیں۔ مار کے آگے سب سرکشی اور شرارت دور ہو جاتی ہے۔ مار ہی سے شریر اور سرکش درست ہوتے ہیں۔اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی شخص کی بیوی غصہ کی تیز اور جلاد تھی۔ وہ اکثر اپنے شوہر سے لڑتی جھگڑتی رہتی۔ بات بات پر جوتیوں سے اس کی مرمت کرتی۔ روز روز کے لڑائی جھگڑے اور مار دھاڑ سے تنگ آ کر شوہر نے ایک دن جنگل کی راہ لی۔ بیوی کو تو لڑنے جھگڑنے اور جوتیاں چلانے کی عادت تھی۔شوہر تنگ آ کر جنگل چلا گیا تھا۔اس لیے اس نے گھر کے آنگن میں اگے ہوئے پیپل کے درخت کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور روزانہ زور زور سے جوتیاں لگانے لگی۔ اس پیڑ پر ایک جن رہتا تھا۔ وہ جوتیاں اس جن کے پڑنے

لگیں۔ برا بھلا سننے اور جوتیاں پڑنے سے وہ گھبرانے لگا۔ چوں کہ وہ پیڑ اس کا مسکن تھا اس لیے وہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر کار اسے ایک دن ایک ترکیب سوجھی۔ وہ جنگل گیا اور اس عورت کے شوہر کو ڈھونڈ کر اور منا کر واپس لایا۔ شوہر نے جن سے کہا:

''مجھے اپنی بیوی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مار مار کر اس نے میرے جسم کو ادھ مرا کر دیا ہے۔''

جن نے کہا:

''میں تمہیں ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں جس سے تمہاری بیوی اب تمہیں کبھی نہیں مارے گی بلکہ تمہارے قابو میں آجائے گی۔ دیکھو میری ترکیب کو غور سے سنو اور اس پر عمل کرو۔ اس ملک کے وزیر کی بیٹی بہت حسین ہے۔ میں اس پر آجاتا ہوں۔ اس ملک کے بڑے بڑے ملا، سیانے اور ہوشیار ناکام ہو جائیں تو تم جن اتارنے کا دعویٰ کر دینا۔ تم جیسے ہی جھوٹ موٹ جھاڑ پھونک کرو گے میں ویسے ہی وزیر کی بیٹی کا پیچھا چھوڑ دوں گا۔ اس طرح تمام ملک میں تمہاری شہرت ہو جائے گی۔ بادشاہ کے در میں عزت بڑھ جائے گی۔ وزیر تعظیم و توقیر سے پیش آئے گا اور تمہاری بیوی بھی تم سے دبنے لگے گی۔''

ایک دن وزیر کی بیٹی کے سر جن آگیا۔ اس شخص نے جن کی ترکیب پر عمل کیا۔ وزیر کی بیٹی اچھی ہو گئی۔ بادشاہ نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ اب کیا تھا اس کی بیوی بھی اس سے دب کر رہنے لگی۔ وہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگا۔ ادھر جن بھی آرام سے پیپل کے درخت پر رہنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد جنوں کے بادشاہ کے حکم پر پیپل کا وہی جن شہزادی کے سر پر سوار ہو گیا۔ ملک کے نامور ملا، سیانے اور ہوشیار جھاڑ پھونک کے لیے بلائے گئے۔ بہت علاج کرایا لیکن جن کو شہزادی کے سر سے نہ ٹلنا تھا نہ ٹلا۔ آخر کار اسی شخص کو جن اتارنے کے لیے بلایا گیا جس نے وزیر کی بیٹی کے سر سے جن کو چٹکی بجاتے ہی اتار دیا تھا۔ وہ بھوتوں اور جنوں کو سر سے اتارنے کے علم سے بالکل ناواقف تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً شہزادی کو ایک کمرے میں لے گیا اور جن کی منت سماجت کرنے لگا کہ شہزادی کا پیچھا چھوڑ دے مگر جن کسی طرح بھی نہ مانا۔ آخراُسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ مایوس ہونے کی اداکاری کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد تیزی سے اندر گھبراتا ہوا آیا اور جن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''بھاگو، بھاگو میری بیوی غصے میں ہے اور جوتی لے کر آرہی ہے۔''

یہ سنتے ہی مار کے ڈر سے جن فوراً شہزادی کو چھوڑ کر وہاں سے چمپت ہوگیا۔ جن کے چمپت ہوتے ہی وہ شخص کہہ اٹھا: ''سچ ہے مار کے آگے بھوت بھاگے۔''

مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے

دیکھیے: مار کے آگے بھوت بھاگے۔

مار کے آگے بھوت ناچے

دیکھیے: مار کے آگے بھوت بھاگے۔

مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے

محافظ دشمن سے قوی ہوتا ہے۔ خدا محافظ ہو تو کوئی دشمن کچھ نہیں کر سکتا۔ دشمن اگر قوی ست، نگہبان قوی تر است۔ یہ کہاوت اس موقع پر بولتے ہیں جب دشمن بڑائی یا ہلاکت میں پوری کوشش کر چکے اور خدا کی مہربانی سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ کہاوت راج کمار سدھارتھ کے ایک مشہور واقعہ کی تلمیح ہے جو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

واقعہ: راج کمار سدھارتھ کپل وستو کے سلطان سدھودھن کے پسر تھے۔ ایک مرتبہ وہ موسم بہار میں شاہی باغ میں ٹہل رہے تھے۔ کچھ ہنس آسمان کی کھلی فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ دوسری طرف سدھارتھ کا چچیرا بھائی دیودت تیر کمان لیے ہوئے شکار کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ اس نے اڑتے ہوئے ایک ہنس پر تیر چلا دیا۔ ہنس زخمی ہو کر سدھارتھ کے قریب زمین پر گر پڑا۔ سدھارتھ نے ترس کھا کر اس زخمی ہنس کی مرہم پٹی کر کے اس کی جان بچائی۔ دیودت نے اپنا دعویٰ پیش کرتے ہوئے کہا:

''یہ ہنس میرا ہے، میں نے اسے شکار کیا ہے، اس ہنس کو میرے سپرد کر دیجیے۔''

سدھارتھ نے اس کی بات سے انکار کرتے ہوئے کہا:

''یہ ہنس میرا ہے۔ میں نے اس کی مرہم پٹی کی ہے، میں تمھیں نہیں دے سکتا۔''

آخر میں مقدمہ شاہی دربار میں گیا۔ بادشاہ نے دونوں کے دلائل سننے کے بعد حکم دیا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ہنس سدھارتھ کے حوالے کر دیا جائے۔

مارنے والے سے جلانے والا بڑا ہوتا ہے

دیکھیے: مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔

مرتے کو ماریں زندہ شاہ مدار

دیکھیے: مرتے کو ماریں شاہ مدار۔

مرتے کو ماریں شاہ مدار

غریب ہی کو ہر شخص ستاتا ہے۔ مصیبت پر مصیبت آتی ہے۔ مصیبت میں اور کوئی ناگہانی آفت نازل ہونا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی تکلیف یا مصیبت میں گرفتار ہو جائے اور اس پر کوئی نئی مصیبت وارد ہو جائے یا اس پر کوئی ظلم کیا جائے۔ جب کسی شخص کو ایک کے بعد دوسری مصیبت یا اپنے پے در پے آفتوں کا سامنا کرنا پڑے تو لوگ کہتے ہیں: ''مرتے کو ماریں شاہ مدار۔''

مگر اس کے معانی، مضمرات اور متعلقات سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

حکایت: مشہور ہے کہ حضرت بدیع الدین زندہ شاہ مدارؒ جن کا مزار مبارک قصبہ مکن پور ضلع کانپور، یوپی میں واقع ہے، کو یہ قدرت حاصل تھی کہ جو صوفی مرتبہ فنا میں ہوتے تھے آپ اپنی ریاضت اور کمال سے ان کو اس مقام سے نکال کر فناء الفنا میں پہنچا دیتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ فقرہ کہ: ''مرتے کو ماریں شاہ مدار'' زبان زدِ خاص و عام ہو کر ضرب المثل بن گیا۔

مرے کو ماریں شاہ مدار

دیکھیے: مرتے کو ماریں شاہ مدار۔

ماں اور مادرِ وطن جنت سے بھی پیارے ہوتے ہیں

ماں اور وطن سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اپنی ماں اور اپنے وطن سے ہر شخص پیار کرتا ہے۔ یہ سنسکرت کی مشہور و مقبول کہاوت کا ترجمہ ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت

ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: بھگوان وشنو کی سواری کرن نامی پرندہ ہے۔ دونوں جنت میں رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ کرن کو اپنے وطن کی بہت یاد آئی۔ جنت میں رہتے رہتے اس کا دل اچاٹ ہوگیا۔ اس نے بھگوان وشنو سے اپنے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ وشنو جی نے اسے بہت سمجھایا کہ

"جنت میں رہ کر جس قدر چاہو عیش و آرام کرتے رہو۔ جو مسرت و انبساط یہاں ہے وہ تمہارے اجاڑ وطن میں کہاں نصیب ہوگی۔"

کرن نے کہا:

"کچھ بھی ہو مجھے اپنے وطن کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ مجھے اگر آپ اجازت دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

وشنو بھگوان نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی اور وہ خوشی خوشی اپنے گھر چلا گیا۔ ایک دن بھگوان وشنو روپ بدل کر کرن کے گھر گئے کہ دیکھیں جنت میں عیش و آرام کرنے والے پرند کا بے کیف مقام میں کیا حال ہے۔ انہوں نے وہاں جا کر دیکھا کہ کرن ایک پرانے برگد کے کوٹر میں رہ رہا ہے۔ وہ کبھی اس شاخ سے اُس شاخ پر اور کبھی اُس شاخ سے اس شاخ پر اڑ کر بیٹھ رہا ہے اور خوشی کے مارے اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کرن سے پوچھا:

"کہو کرن جنت چھوڑ کر اس سنسان اور ویران مقام میں تمہیں کیا سکھ مل رہا ہے۔"

کرن نے جواب دیا:

"کیا آپ نہیں جانتے کہ ماں اور مادرِ وطن جنت سے بھی پیارے ہوتے ہیں۔"

مردوہ جو ایک دنتا ہوئی

ایسے بوڑھے آدمی کے لیے طنز ہے جس پر بوالہوسی غالب ہو۔ ایسا شخص جو بڑھاپے میں جوانوں کی سی حرکت کرے۔ یہ کہاوت اس وقت طنزاً کہی جاتی ہے جب کسی پر بڑبھس سوار ہو۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک بوڑھا سپاہی جب اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوگیا اور اسے پنشن ملنے لگی تو اس نے سوچا باقی عمر تنہا کیسے گزرے گی کیوں نہ کسی دوشیزہ سے عقد کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے احباب

کے ذریعہ کہیں اپنی شادی کر لی۔ جب وہ اپنی بیوی کو ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لا رہا تھا تو اسے راستے میں اپنی بیوی سے بات کرنے کی خواہش ہوئی۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی بیوی اسے بوڑھا سمجھ کر اپنی نگاہوں سے گرا دے۔ اس لیے بہت سوچ سمجھ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا:

''مردوہ ہی جو ایک دنتا ہوئی یعنی مرد وہ جس کے منہ میں ایک دانت ہو۔''

بیوی نے اپنا گھونگھٹ کھول کر فوراً جواب دیا:

''ناری روپ وتی وہ ہی، جا کے منہ میں دنت نہ ہوئی۔''

یعنی وہی عورت حسین ہے جس کے منہ میں ایک بھی دانت نہ ہو۔ بوڑھا سپاہی یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس کی عورت بھی اس ہی کی طرح بوڑھی اور بغیر دانتوں کی ہے۔

مرغے کی ایک ہی ٹانگ

دیکھیے: وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔

مرنے کے پہلے قبریں کھودیں

مرض لاحق ہونے سے پہلے علاج کرنا۔ مسائل سے پہلے تدارک کرنا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی حادثے یا واقعے سے پہلے اس کے ازالہ کی تدبیر کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب یہ واقعہ ہے:

واقعہ: کہا جاتا ہے کہ اکبر اعظم کے زمانے میں متھرا کے چوبے بیکاری اور مفلسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اکبر نے ترس کھا کر اُن سے کہا:

''جو مسلمان مر جائیں ان کی تدفین کے لیے تم لوگ قبریں کھود کر تیار کیا کرو۔ اس کے لیے تم کو مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔''

اکبر کے حکم کی تعمیل میں چوبوں نے قبرستان میں جا کر ہزاروں قبریں کھود ڈالیں۔ دیکھنے والے حیرت زدہ تھے۔ کسی نے اکبر کے پاس جا کر کہا:

''جہاں پناہ! چوبوں نے تو ہزاروں قبریں کھود ڈالی ہیں اور میت ایک بھی نہیں ہے۔''

اکبر نے چوبوں کو فوراً طلب کیا اور ان سے سبب دریافت کیا۔ جواب میں چوبوں نے ہاتھ جوڑ کر

کہا: ''مہابلی کا اقبال بلند ہو۔ ہم نے تو آپ ہی کے حکم کی تعمیل میں قبریں کھودی ہیں۔ حضور غور فرمائیں، ایک نہ ایک دن تو سبھی مسلمانوں کو مرنا ہی ہے اور قبریں کھودنے کا کام بھی ہم ہی لوگوں کو کرنا ہے۔ اس لیے ہم لوگوں نے پیشگی ہی کر ڈالا۔'' اس حاضر جوابی سے اکبر خوش ہوئے اور انعام و اکرام سے نواز نے کے بعد انہیں اس کام سے سبکدوش کر دیا۔ اسی وقت یہ مثل وجود میں آگئی: ''مرنے کے پہلے قبریں کھودیں۔''

ملا کی دوڑ مسجد تک

ہر شخص کی کوشش اس کے حوصلے اور مقدور تک ہوتی ہے۔ جہاں تک آدمی کی دسترس ہو، اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ ہر شخص کی رسائی وہاں تک ہوتی ہے جہاں سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک ملاجی رہتے تھے۔ وہ اکثر اپنی بیوی اور اپنے گھر والوں سے لڑتے رہتے تھے۔ لڑائی کے دوران ان کا ایک ہی تکیہ کلام ہوتا:

''اگر تم لوگوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا تو میں پردیس چلا جاؤں گا اور تم لوگوں کو کبھی اپنا منہ نہ دکھاؤں گا۔''

ایک دن اپنی بیوی سے لڑتے ہوئے انہوں نے یہی کلمہ دہرایا۔ بیوی نے ناک بھوں سکوڑ کر کہا:

''روز روز کہتے ہو کہ پردیس چلا جاؤں گا، پردیس چلا جاؤں گا، تو چلے کیوں نہیں جاتے۔''

ملاجی کو بات لگ گئی۔ انہوں نے کہا:

''میں طعنے سننے کا عادی نہیں، لو میں جاتا ہوں۔ اب تم اکیلے عیش کرنا۔''

یہ کہہ کر ملاجی طیش میں گھر سے روانہ ہو کر نزدیک کی ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ بیوی کو جب پتا چلا کہ ملاجی پردیس کی بجائے محلے کی مسجد میں جا بیٹھے ہیں تو وہ وہاں پہنچ گئی اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:

''واہ! میرے پردیس جانے والے، کیا ہوا، بس ملا کی دوڑ مسجد تک۔''

ملا کی ڈاڑھی تبرک ہی میں گئی

دیکھیے: ملا کی ڈاڑھی ثواب ہی ثواب

ملا کی ڈاڑھی تبرک ہی تبرک میں گئی

دیکھیے: ملا کی ڈاڑھی ثواب ہی ثواب۔

ملا کی ڈاڑھی ثوابوں ہی میں گئی

دیکھیے: ملا کی ڈاڑھی ثواب ہی ثواب۔

ملا کی ڈاڑھی ثواب ہی ثواب

ملا کی ڈاڑھی ان کی تعریف کرنے ہی میں ختم ہوگئی۔ جھوٹی تعریف میں دولت کو برباد کردینا۔ اگر کوئی شخص اپنی جھوٹی تعریف سن کر خوش ہو اور اپنی دولت بے دریغ خرچ کرڈالے تو یہ مثل کہی جاتی ہے۔ بے فائدہ اور بے سود خرچ ہونے کے موقع پر بھی اس مثل کو کہتے ہیں جیسے گوری کا جوبن چٹکیوں میں گیا۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک مشہور حکایت ہے جو معمولی تعریف و ترمیم کے ساتھ کئی طرح سے بیان کی جاتی ہے۔ ایک حکایت اس طرح ہے:

حکایت ۱: کوئی میاں یا ملا کسی نیک تقریب میں شیرینی تقسیم کررہا تھا۔ اسی دوران کسی مسخرے نے تبرکاً ملاجی کی ڈاڑھی کا ایک بال نوچ کر گرہ میں باندھ لیا اور لوگوں کو مخاطب کرکے کہنے لگا:

''اس بال سے مقدس اور متبرک دوسری کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔''

مجمع کے لوگوں کو اس مسخرے کی بات سمجھ میں آگئی کہ واقعی ملاجی کی ڈاڑھی مقدس و متبرک ہے، اس کے سامنے شیرینی کی کیا حقیقت و حیثیت ہے۔ لہٰذا ان سب نے ملاجی کی ڈاڑھی کا ایک ایک بال نوچنا شروع کردیا اور اس وقت تک نوچتے رہے جب تک اس غریب کی ڈاڑھی کا صفایا نہ ہوگیا۔ جب سے یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا۔

دوسری حکایت معمولی فرق کے ساتھ اس طرح مشہور ہے:

حکایت ۲: ایک مرتبہ ایک ملا اپنے شاگردوں کو اپنی نشانی اور یادگار کے طور پر کوئی تحفہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو اکٹھا کرکے کہا:

''میں تم لوگوں کو کوئی ایسی چیز دینا چاہتا ہوں جس سے میری یاد قائم رہے اور وہ چیز ہمیشہ

تمہارے کام آئے۔"

ملاجی کے شاگردوں میں ایک مسخرہ بھی تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا:

"حضور آپ کی ڈاڑھی ہم لوگوں کو ہمیشہ آپ کی یاد دلاتی رہے گی۔ اگر ہم کو آپ کی ڈاڑھی کا ایک بال ہی مل جائے تو اس سے مقدس و متبرک ہمارے لیے کوئی چیز نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ملاجی کی ڈاڑھی کے دو بال اکھاڑ لئے۔ یہ دیکھ کر ان کے تمام شاگرد ڈاڑھی کے بال اکھاڑنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ ملاجی کے لاکھ منع کرنے پر بھی تھوڑی ہی دیر میں پوری ڈاڑھی کے بال اکھاڑ ڈالے۔

من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا

اگر دل درست اور اعتقاد پکا ہے تو ہر جگہ خدا ہے۔ اگر من پاک وصاف ہے تو ہر چیز پاک وصاف ہے۔ اگر کوئی صاف باطن شخص خدا کا معتقد ہے مگر مفلسی کے سبب مقدس مقامات کی زیارت کرنے سے قاصر ہے یا کوئی ایسا نیک کام نہیں کر سکتا جس میں دولت کا خرچ ہو تو اس کے لیے یہ مثل کہی جاتی ہے۔ اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو معمولی فرق کے ساتھ کئی طرح سے مشہور ہے۔ پہلی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۱: گرو رامانند کے شاگردوں میں ریداس نامی ایک شخص بھی تھا جو ذات کا ادنیٰ اور نہایت غریب تھا۔ ایک بار گنگا اشنان کے لیے کچھ لوگ جا رہے تھے۔ ریداس نے انہیں کچھ کوڑیاں دیں اور ان سے کہا:

"یہ کوڑیاں گنگا جی کو اس وقت دے دینا جب وہ اپنے اصل روپ میں ظاہر ہو جائیں۔"

اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ گنگا جی نے اس کے عوض ایک سونے کا کنگن دیا اور کہا:

"اسے ریداس کو دے دینا۔"

اس شخص نے کنگن ریداس کو نہ دے کر راجا کے حوالے کر دیا۔ راجا بہت خوش ہوا اور اسے اپنی رانی کو دے دیا۔ رانی نے اس کنگن کی جوڑی ملانا چاہی مگر جب کہیں نہیں ملی تو آخر میں بادشاہ ریداس کے پاس گیا اور معافی مانگتے ہوئے ریداس سے گزارش کرنے لگا:

"میری رانی کو اس کنگن کی جوڑی مطلوب ہے۔"

ریداس نے قصور معاف کرتے ہوئے اپنی کٹھوتی میں بھرے ہوئے پانی کو گنگا جل مان کر اس میں ہاتھ ڈالا اور اس کنگن کی جوڑی نکال کر راجا کے حوالے کر دی اور راجا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''من چنگا تو من کٹھوتی میں گنگا۔''

اس کہاوت کے تعلق سے دوسرا قصہ اس طرح مشہور ہے:

حکایت۲: ایک برہمن گنگا اشنان کے لیے جا رہا تھا۔ راستے میں اس کا جوتا پھٹ گیا۔ وہ ریداس نامی چمار کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا:

''میرے اس جوتے کو جلدی سے گانٹھ دے۔ مجھے نہانے کے لیے گنگا جی جانا ہے۔''

ریداس نے اس سے کہا:

''میں جو چیز تجھے دوں تو وہاں گنگا کو اس وقت دے دینا جب وہ ہاتھ پسارے ظاہر ہو۔ اگر تجھے یہ شرط منظور ہے تو میں سب سے پہلے تیرا جوتا گانٹھ دوں گا۔''

برہمن نے یہ شرط منظور کر لی۔ ریداس نے اس کے جوتے کو گانٹھ کر فوراً ہی اس کے حوالے کر دیا۔ برہمن نے گنگا میں پہنچ کر جوں ہی پانی میں غوطہ لگایا تو ریداس کی شرط اسے یاد آ گئی۔ اس نے اپنی تھیلی سے وہ کوڑیاں نکالیں جو ریداس نے گنگا جی کو دینے کے لیے اس کے حوالے کی تھیں۔ برہمن نے جیسے ہی کوڑیوں کو گنگا کے پانی میں ڈالنا چاہا کہ پانی کے اندر سے ایک نسوانی ہاتھ نکلا۔ اس ہاتھ نے فوراً ان کوڑیوں کو لے لیا اور اپنی طرف سے ریداس کے لیے ایک جڑاؤ بیش قیمت کنگن دے دیا۔ جب برہمن وہ کنگن لے کر ریداس کے پاس آیا تو اس کی خبر کسی طرح وہاں کے راجا کو ہو گئی۔ راجا نے وہ کنگن ریداس سے طلب کر کے اپنی رانی کو دے دیا۔ رانی نے راجا سے کہا:

''جب تک اس کے ساتھ کا دوسرا کنگن نہ ہو، یہ میرے کسی کام کا نہیں۔''

پھر کیا تھا راجا کہ حکم سے ریداس پر مار پڑی اور اسے کہا گیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو دوسرا کنگن بھی بہم پہنچا۔ ریداس نے یہ فقرہ کہہ کر کہ:

''من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا۔''

جیسے ہی پانی سے بھری کٹھوتی میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس کے ہاتھ میں اسی جڑاؤ بیش قیمت کنگن کی جوڑی تھی۔ یہ دیکھ کر راجا ریداس کا معتقد ہو گیا اور ریداس نے بھی شہرت حاصل کی۔

سنت روی داس کے معتقد اس کہاوت سے متعلق یہ حکایت بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت گنگا

میں نہانے کے لیے گئی۔ اس نے جیسے ہی گنگا میں غوطہ لگایا کہ اس کے ہاتھ کا طلائی کنگن گنگا کے پانی میں گر کر ڈوب گیا۔ وہ پریشان حال سنت روی داس کے پاس آئی اور اپنی پریشانی کو ان کے سامنے بیان کیا۔ سنت روی داس نے اس عورت سے کہا:

''بیٹی پریشان نہ ہو۔''

اور پانی سے بھری اپنی کٹھوتی میں ہاتھ ڈال کر اس طلائی کنگن کو نکال کر عورت کے حوالے کر دیا اور اس سے کہا:

''من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا۔''

یعنی اعتقاد درست ہے تو ہر جگہ خدا ہے۔ تب سے کہاوت مشہور ہو گئی۔

موکو نہ تو کو چولہے میں جھونکو

نہ میرے کام کا نہ تمہارے کام کا، ایسی چیز کا کیا رونا، دور کرو۔ اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی چیز کے دو فریق دعویدار ہوں اور آپس میں جھگڑ رہے ہوں تو کہتے ہیں یعنی دونوں فریق نزاعی چیز سے دست بردار ہو جائیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: کسی ایسی چیز کو لے کر دو فریقین کے درمیان بحث و مباحثہ شروع ہو گیا جو موقع پر موجود ہی نہیں تھی۔ بحث و تکرار دھیرے دھیرے لڑائی جھگڑے میں تبدیل ہو گئی۔ گاؤں کے لوگوں نے آکر بیچ بچاؤ کیا۔ معاملہ پنچائت کے حوالے کیا گیا۔ دور دور سے چودھری اور سرپنچ بلائے گئے۔ پنچوں کے لیے دیگوں میں کھانا پکوایا گیا۔ کئی روز تک پنچائت ہوتی رہی مگر معاملہ طے نہ ہوا۔ پنچائت میں بیٹھے سینکڑوں لوگوں کے لیے روزانہ کھانا پکتا رہا۔ تین چار دن کے بعد ایک مسافر کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے پنچائت دیکھ کر معاملہ جاننا چاہا جب اس کو پورے معاملے کا علم ہوا تو اس نے کہا:

''بس اتنی سی بات ہے۔''

اس نے دونوں فریقوں کو بلایا اور کہا:

''اگر آپ لوگ میری بات مانیں تو معاملہ دو منٹ میں ختم ہو سکتا ہے۔''

دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس شخص نے زمین پر بچھے ہوئے ایک کپڑے کے دو دو کونے

فریقین کو پکڑوائے اور ان سے کہا:

''اسے اس جلتے ہوئے چولہے میں جا کر جھونک دو۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم لوگ لڑ رہے ہو جب کہ یہ چیز کسی کے کام کی نہیں یعنی موکو نہ تو کو چولہے میں جھونکو۔''

دونوں فریقین نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد باہم گلے سے لگ گئے۔

موکو نہ تو کو، لے بھاڑ میں جھونکو

دیکھیے: موکو نہ تو کو چولہے میں جھونکو۔

مول دیا نہ بٹا، مر گیا ہٹا کٹا

دیکھیے: میو موا تب جانئے، جب وا کا تیجہ ہوئے۔

گرو جی! مجھے چھیڑو گے

آپ ایسا کریں گے، آپ ایسا ضرور کریں گے۔ کسی شخص کو ایسے کام کے لیے آمادہ کرنا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ یہ کہاوت اس محل پر بھی بولتے ہیں جب کسی شخص کی بات یا فعل سے دوسرے شخص کو اس کے ساتھ کوئی نامناسب برتاؤ کرنے کی ترغیب ملے۔ اس مثل کے تعلق سے ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک گرو کو کسی کام سے ایک گاؤں جانا پڑا۔ انہوں نے اپنے ساتھ ایک چٹائی، ایک لوٹا اور اپنا ایک پیارا کبوتر ساتھ لیا۔ گرو جی ایک ہاتھ میں لوٹا لئے، دوسرے ہاتھ میں کبوتر پکڑے اور بغل میں چٹائی دابے ہوئے جوں ہی شہر کے کنارے آئے۔ وہاں ان کو ایک نوجوان عورت ملی۔ اس نے گرو جی سے کہا:

''آپ شاید اس گاؤں جا رہے ہیں۔ مجھے بھی اس گاؤں جانا ہے، سنسان راستہ ہے، عورت ذات ہوں۔ اکیلے جاتے ہوئے ڈر رہی ہوں۔ اسی انتظار میں یہاں بہت دیر سے کھڑی تھی کہ شاید کوئی ساتھی مل جائے۔ خدا نے آپ جیسے نیک اور شریف انسان کو بھجوا دیا۔ اگر اجازت ہو تو میں آپ کے ساتھ چلوں۔''

گرو نے کہا:

"ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ چل سکتی ہو۔"

وہ دونوں جب شہر سے تھوڑی دور نکل گئے تو عورت نے گرو سے کہا:

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

گرو جی نے کہا: "ڈرنے کی کیا بات ہے، میں تو ساتھ ہوں۔"

عورت نے جواب دیا:

"گرو جی! مجھے آپ ہی سے ڈر لگ رہا ہے کیوں کہ آپ مجھے چھیڑو گے۔"

گرو جی نے کہا:

"لاحول ولاقوۃ کیسی باتیں کرتی ہو۔ بس خاموشی سے میرے ساتھ چلی چل۔"

تھوڑی دور چلنے کے بعد اس عورت نے پھر کہا:

"گرو جی! آپ مجھے چھیڑو گے۔"

گرو جی نے کہا:

"چل پگلی میں تجھے کیسے چھیڑوں گا۔ میرے ایک ہاتھ میں لوٹا ہے، دوسرے میں کبوتر اور بغل میں چٹائی دبی ہے اس لیے چھیڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

عورت نے ادھر اُدھر دیکھا، راستہ سنسان تھا دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ وہ گرو کو کسی پیڑ کی اوٹ میں لے گئی اور بغل سے ان کی چٹائی کھینچ کر کہنے لگی:

"آپ پہلے اس چٹائی کو اس زمین پر بچھائیں گے۔ پھر اس لوٹے کو اس طرح زمین پر رکھ دیں گے اور دوسرے ہاتھ کے کبوتر کو اس طرح اڑا کر اس چٹائی پر مجھے لٹا دیں گے۔ اس کے بعد مجھے خوب جی بھر کر چھیڑیں گے۔"

گرو نے ایسا ہی کیا۔ بعد میں عورت نے گرو سے کہا:

"دیکھیے میں بار بار اس لیے کہتی تھی کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ گرو جی! مجھے چھیڑو گے۔"

مولوی مدن کی سی بات کہاں

حق گوئی، بے باکی اور بے خوفی کہاں۔ اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنی حق گوئی اور بے خوفی کے ڈنکے پیٹے مگر اس کو ٹھیک سے نباہ نہ سکے۔ یہ کہاوت ایک تاریخی واقعہ کی

تلمیح ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: مولوی مدن جن کا اصلی نام سید شاہ مدن تھا وہ صحیح النسب سید تھے۔ اپنی حق گوئی کے لیے مشہور ہیں۔ وہ کسی زمانے میں سلطنت اودھ میں بڑا رسوخ رکھتے تھے۔ وہ نواب شجاع الدولہ کے سفیر کی حیثیت سے حافظ رحمت خاں، والیٔ روہیل کھنڈ سے مل کر مراٹھوں کے خلاف مدد کے طالب ہوئے تھے۔ اس وقت انہوں نے نواب شجاع الدولہ کے ایما پر حافظ رحمت خاں سے وعدہ کرلیا تھا کہ اس مدد کے بدلے میں حافظ رحمت خاں کو ایک اقرار نامہ جس کی رو سے انہیں نواب شجاع الدولہ کو چالیس لاکھ روپے ادا کرنے تھے، واپس کردیا جائے گا۔ مراٹھوں کی بلا سر سے ٹلنے کے بعد شجاع الدولہ نے اس وعدے سے مکرنا چاہا لیکن مولوی مدن نے بھرے دربار میں رحمت خاں کے سفیروں کے سامنے بڑی جرأت و ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا:

''میں نے آپ کے ارشاد کے بموجب حافظ الملک سے پکا وعدہ کرلیا تھا کہ تمسک انہیں لوٹا دیا جائے گا۔''

اس حق گوئی کی پاداش میں ان کی تمام جاگیر، مال و منال اور اسباب وغیرہ ضبط کرکے انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں مشقت جھیلتے جھیلتے ان کا انتقال ہوگیا۔ اسی وقت سے اس کہاوت کا وجود ہوا کہ مولوی مدن کی سی بات کہاں؟

اکبرؔ الہٰ آبادی کے اس شعر سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مولوی مدن اپنی ڈاڑھی کی وجہ سے مشہور ہوں گے اور ان کا نام مدن ہوگا۔ حالانکہ ان کا نام سید شاہ مدن تھا:

اگرچہ شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

مونڈ منڈا یو سارا گاؤں، کس کس کا لیجے ناؤں

جب گاؤں کے تمام لوگوں نے سر منڈالیا تو پھر کس کس کا نام لیا جائے۔ ایک احمق ہو تو کہا جائے جہاں تمام لوگ ہی بے وقوف ہوں تو وہاں کسی کا نام لینے سے کیا فائدہ۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب سب کے سب بے وقوفی کے کام کریں۔ اس کہاوت کا تعلق ایک دلچسپ لوک کہانی سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں ایک دھوبی رہتا تھا۔ اس نے اپنے گدھے کا نام گندھروسین رکھا تھا۔ ایک دن وہ گدھا مر گیا تو دھوبی اس کا نام لے لے کر زور زور سے رونے لگا۔ اس کو روتا اور چھاتی پیٹتا دیکھ کر اس کے رشتہ دار، عزیز اور محلے والے اکٹھا ہو گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ اس کا کوئی بہت خاص اور عزیز شخص مر گیا ہے اسی لیے وہ اس قدر رو پیٹ رہا ہے۔ لہٰذا ان میں سے کئی لوگوں نے اپنے سر منڈوا لئے۔ اس کے بعد جب کوئی ان میں سے کسی سے سر منڈانے کا سبب پوچھتا تو وہ جواب دیتا:

''کیا آپ کو معلوم نہیں، گندھروسین نہیں رہے۔''

وہ شخص یہ سمجھ کر کہ گندھروسین کوئی معزز شخص تھے اپنا سر منڈوا لیتا۔ اسی طرح لوگوں کو سر منڈاتا دیکھ کر کوتوال نے کوتوال کو دیکھ کر وزیر نے وزیر سے سن کر راجا نے بھی اپنے سروں کو منڈوا لیا۔ جب رانی نے راجا سے سر منڈانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا:

''گندھروسین مر گئے ہیں اسی لیے اپنے سر کو منڈوایا ہے۔''

رانی نے کہا: ''گندھروسین سے آپ کا کیا رشتہ تھا۔''

راجہ نے جواب دیا:

''میں اسے نہیں جانتا، مجھے تو وزیر نے بتایا تھا۔''

جب وزیر سے پوچھا گیا کہ وہ کون تھا تو اس نے کہا:

''مجھے نہیں معلوم مجھ سے کوتوال نے کہا تھا کہ وہ ایک معزز شخص تھا۔''

اسی طرح کوتوال اور اس کے بعد پوچھتے پوچھتے آخر میں پتا چلا کہ گندھروسین کوئی معزز شخص نہیں بلکہ دھوبی کے گدھے کا نام تھا۔ یہ سن کر سب ہی لوگ نادم ہوئے۔ اسی وقت یہ کہاوت مشہور ہو گئی کہ:

''مونڈ منڈایو سارا گاؤں کس کس کا لیجئے ناؤں۔''

مونڈ منڈائے فضیحت بھئے، ذات پانت دونوں سے گئے

دیکھیے: ماتھ منڈائے فضیحت بھئے، ذات پانت دونوں سے گئے۔

میاں کی دوڑ مسجد تک

دیکھیے: ملا کی دوڑ مسجد تک۔

میاں کی ڈاڑھی واہ واہ ہی میں گئی

دیکھیے: ملا کی ڈاڑھی ثواب ہی ثواب۔

میاؤں کا ٹھور کون پکڑے!

مشکل کام کون کرے گا۔ ظالم سے بچاؤ کے انتظام کی ہمت کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب لوگ کسی کام کے لیے لمبی چوڑی تجاویز پیش کریں مگر خطرے کے وقت چپ سادھ لیں اور چوہے کی طرح دبک جائیں۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے (ملاحظہ فرمائیں کہاوت: بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟)

کہانی: چوہوں کی سبھا میں جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہم سب چوہوں کی جان بلی سے اس طرح بچ سکتی ہے کہ اس کے گلے میں ایک گھنٹی باندھ دی جائے تاکہ جب وہ آئے تو ہم لوگ گھنٹی کی آواز سن کر ہوشیار ہوجائیں۔ کسی چوہے نے کہا: ''گلے میں گھنٹی باندھنے کے لیے میں بلی کے پیر پکڑلوں گا''

کسی نے کہا: ''میں دم پکڑلوں گا''

کسی نے کہا: ''میں کان پکڑلوں گا۔''

اسی طرح سبھی چوہے اپنی بہادری دکھانے لگے۔ آخر میں ایک بوڑھا اور تجربہ کار چوہا بولا: ''ٹھیک ہے آپ لوگ گھنٹی باندھنے کے لیے بلی کو پکڑلیں گے مگر یہ تو بتاؤ میاؤں کا ٹھور کون پکڑے گا۔''

یہ سن کر سبھی چوہے ڈر کر بھاگ گئے اور ہر ایک کی بہادری کی پول کھل گئی۔

میر بھچڑی کی کڑھائی، ہوگیا ہجڑا جس نے کھائی

دیکھیے: پیر بھچڑی کی کڑھائی، ہوگیا ہجڑا جس نے کھائی

میر بھوجی کی کڑھائی، ہوگیا ہجڑا جس نے کھائی

دیکھیے: پیر بھچڑی کی کڑھائی، ہوگیا ہجڑا جس نے کھائی۔

میرا بیل منطق نہیں پڑھا

سیدھے سادھے آدمی اپنے کام سے غرض رکھتے ہیں، فضول جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ یہ کہاوت اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب کوئی شخص غیر ضروری حجت کرے اور بلا وجہ میخ نکالے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی تیلی کے بیل کا مقدمہ ایک منصف کے سامنے پیش ہوا۔ بحث کے دوران منصف نے تیلی سے پوچھا کہ تم لوگ بیل کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھتے ہو۔ تیلی نے جواب دیا:

''جب ہم اپنے کام پر نہیں رہتے یعنی کولھو کے پاس موجود نہیں ہوتے تب بھی گھنٹی کی آواز سے معلوم ہو جاتا ہے بیل اپنا کام کر رہا ہے کہ نہیں''۔

اس پر منصف نے کہا:

''اگر بیل کام نہ کرے اور کھڑے کھڑے اپنی گردن کو ہلاتا رہے تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ بیل اپنا کام کر رہا ہے؟''

یہ سن کر تیلی نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''حضور! میرا بیل منطق نہیں پڑھا''۔

میرے بیل نے وکالت نہیں پڑھی

دیکھیے: میرا بیل منطق نہیں پڑھا۔

میں مروں تیرے لئے، تو مرے اس کے لئے

میں تیرے لیے مرتا ہوں اور تو میری پروا نہ کر کے دوسروں پر جان چھڑکتا ہے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کو ٹوٹ کر چاہے مگر وہ شخص اس کی پرواہ نہ کر کے کسی اور کو چاہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کے تعلق سے ایک لوک کہانی بیان کی جاتی ہے جو نہایت دلچسپ ہے:

کہانی: ایک روز کسی برہمن کو کہیں سے ایک امر پھل مل گیا۔ اس نے اس پھل کو راجا بھرتری کی خدمت میں پیش کیا۔ راجا اپنی بیوی رانی پنگلا کو بہت پیار کرتا تھا اس لیے اس نے وہ پھل رانی کو دے

دیا۔ رانی شہر کے کوتوال سے پھنسی تھی۔ اس لیے اس نے وہ پھل کوتوال کو دے دیا۔ کوتوال شہر کی ایک مشہور طوائف کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ اس نے وہ پھل اس طوائف کو بطورِ تحفہ دے دیا۔ طوائف کی آشنائی راجا سے تھی۔ اس نے ایک دن وہی پھل راجا بھرتر ہری کی نذر کیا۔ پھل دیکھ کر راجا کو اس قدر حیرت ہوئی کہ اس نے اپنی انگلی دانت میں دبالی اور اپنے دل میں یہ کہتا ہوا کہ: ''میں مروں تیرے لیے تو مرے اس کے لئے'' راج پاٹ چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گیا۔

میں بھی ہوں پانچوں سواروں میں

بڑوں یا معزز اشخاص میں اپنا شمار کرنا۔ جب کوئی شخص اپنا شمار ایسے لوگوں کے ساتھ کرے جو اس سے اونچے درجہ کے ہوں تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک چھوٹی سی حکایت سے ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ چار سوار ہتھیار باندھے ہوئے نہایت سج دھج کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ ایک غیر مسلح آدمی اپنے مریل ٹٹو پر ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ راستے میں کسی شخص نے اس سے پوچھا:

''تم کہاں جا رہے؟''

اس شخص نے جواب دیا:

''ہم پانچوں سوار دلی سے آ رہے ہیں اور میں بھی ہوں پانچوں سواروں میں۔''

مین نے تین دفعہ کھایا

جب کوئی شخص پہلے ہی سے اپنے فائدے کیلئے تمہید باندھے یا ہر حال میں اپنے مطلب کی بات کہے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک چھوٹی سی حکایت سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی چٹورے اور ایک بنیے سے بہت دوستی تھی۔ ایک بار وہ چٹورا بنیے کے گھر گیا۔ بنیے کے گھر میں نیا نیا اچھے قسم کا گڑ آیا تھا۔ گڑ کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بیچ اس نے بنیے سے کہا:

''میں نے زندگی میں صرف تین بار گڑ کھایا ہے۔''

بنیے نے پوچھا: ''اچھا بتاؤ تم نے گڑ کب کھایا ہے۔''

چٹورے نے کہا: "جب میں پیدا ہوا تھا تب پہلی بار گڑھتی کے ساتھ کھایا تھا۔ دوسری دفعہ جب میرے کان چھیدے گئے تھے، اس وقت کھایا تھا اور اب تیسری مرتبہ یہ نیا گڑ کھاؤں گا۔ اس طرح میں نے تین دفعہ کھایا ہے۔"

بنیے نے کہا: "اگر میں تم کو گڑ نہ دوں تو؟"

چٹورے نے فوراً جواب دیا: "تب تو دو ہی دفعہ صحیح۔"

میو مرا تب جانیے، جب تیجہ ہو جائے

دیکھیے: جاٹ مرا تب جانیے، جب تیجہ ہو جائے۔

میو موا تب جانئے، جب وا کا تیجہ ہوئے

دیکھیے: جاٹ مرا تب جانئے، جب تیجہ ہو جائے۔

ناچ نہ آئے، آنگن ٹیڑھا

دیکھیے: ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔

ناچ نہ جانوں، آنگن ٹیڑھا

دیکھیے: ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔

ناچ نہ جانے، آنگن ٹیڑھا

ناچنا تو آتا نہیں صحن میں عیب نکالے۔ کسی کام میں دخل نہ رکھنے کی وجہ سے حیلے بہانے کرنا۔ نہ جاننے کی وجہ سے کوئی کام نہ ہو سکنا اور دوسرے پر الزام رکھنا۔ ایسا بے لیاقت یا حیلہ جو شیخی باز جس میں کام کرنے کی لیاقت تو نہ ہو مگر حیلہ اور بہانے سے ٹالنا چاہے اور دوسروں پر الزام دھرے۔ یہ مثل اس جگہ بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی کام میں مداخلت نہ رکھنے کی وجہ سے حیلے بہانے کرے یا اس سے کوئی کام نہ ہو سکے

اور دوسرے پر الزام رکھے یا کوئی کام اس کو نہ آتا ہو اور اسباب و آلات کے خراب ہونے کی شکایت کرے۔

اس مثل کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی مشہور حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک رقاصہ رہتی تھی۔ جسے ٹھیک سے ناچنا نہیں آتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز اسے کسی دوسرے شہر جانا پڑا۔ اس شہر میں اس نے اپنے آپ کو نامور رقاصہ مشہور کر دیا۔ رقاصہ کی دعوت دی گئی۔ اس کے رقص سے محظوظ اور لطف اندوز ہونے کے لیے شہر کے شوقین اکٹھا ہو گئے۔ وہ ٹھیک سے ناچنا تو جانتی نہیں تھی، مرتی کیا نہ کرتی، ناچنے کے لیے کھڑی ہو گئی اور ناچار ناچنا شروع کیا مگر ناچ نہ سکی، اپنے عیب کو چھپانے اور جھینپ مٹانے کے لیے اس نے کہا: ”ٹھیک سے ناچوں تو کیسے؟ یہ آنگن ہی ٹیڑھا ہے۔“

اس پر کسی نے فقرہ کسا: ”ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔“

ناؤ خواجہ خضر نے ڈبوئی

جو ہادی رہنما تھے وہی دغا دے گئے۔ جب کوئی رہبر یا رہنما ہی تباہی کا باعث ہو تو اس موقع پر یہ مثل بولتے ہیں۔ جس شخص پر مدار کار ہو اسی سے نقصان پہنچنا۔ اپنے مربی سے نقصان اٹھانا۔ جس پر بھلائی کا بھروسا تھا اسی سے نقصان پہنچا۔ جب کسی کا رہبر اور رہنما ہی اس کی خرابی اور نقصان کا باعث ہو یا جس شخص سے کسی کام کی امید ہو، اس سے ہی اس کام میں نقصان پہنچے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ یہ کہاوت اس قصہ کی طرف تلمیح ہے جس میں حضرت خضر علیہ السلام نے ایک کشتی میں سوراخ کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

تلمیح: جب فرعون اور اس کے ساتھی دریائے نیل میں غرق ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے اس خوبی سے خطبہ پڑھا کہ تمام سننے والے حیران ہو گئے۔ ایک شخص نے کہا:

”اے کلیم اللہ تمام روئے زمین پر آپ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں؟“

حضرت موسیٰ نے فرمایا:

”بے شک تمام عالم میں میں اپنے سے زیادہ کسی کو عالم نہیں جانتا“

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فقط دل ہی میں یہ گمان گزرا تھا، ہنوز یہ بات زبان سے نہیں نکلی تھی کہ اللہ جل شانہ نے ان پر وحی نازل کی اور کہا:

''اے موسیٰ میرا ایک خاص بندہ مجمع البحرین میں رہتا ہے۔ ہم نے اسے علمِ خاص دیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی:

''ربِ العزت میں تیرے اس خاص بندے سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا:

''تم اس خاص بندے سے ملاقات کے لیے جاؤ اور اپنے ساتھ ایک بھنی ہوئی مچھلی بھی لے جاؤ۔ جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے گی وہاں میرا خاص بندہ تم کو ملے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس خاص بندے کی تلاش میں نکل پڑے۔ ایک جگہ مچھلی پر پانی کی بوند پڑ گئی اور وہ زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام اس مچھلی کے پیچھے پیچھے خضر کے مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک بزرگ تکیہ لگائے منہ پر کپڑا اڈالے سو رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا۔ خضر علیہ السلام نے کپڑا منہ پر سے ہٹا کر دیکھا اور سلام کا جواب دیا اور پوچھا:

''تم کون ہو؟''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

''میں موسیٰ بنی اسرائیل کا نبی ہوں۔ حق تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم سے کچھ علم سیکھوں اور چند یوم آپ کی صحبت میں رہوں۔''

خضر علیہ السلام نے کہا:

''اے موسیٰ تو میرے کام اور فعل کو دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا۔''

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

''کیوں نہ صبر کروں گا۔''

خضر علیہ السلام نے کہا:

''اس سبب سے کہ تم پیغمبر ہو۔ تمہارا حکم ظاہر ہے۔ شاید کہ مجھ سے کوئی فعل ایسا صادر ہو کہ ظاہر میں مکروہ اور ناپسندیدہ ہو اور تم اس کو دیکھ کر صبر نہ کر سکو کیوں کہ تم کو اس کا علم نہیں ہوگا۔''

موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

''میں ہرگز آپ کے حکم سے انحراف نہیں کروں گا اور نہ آپ کی کسی بات میں بولوں گا۔''

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا:

''اے موسیٰ اگر تم اس امر کا اقرار کرتے ہو تو میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تم میرے ہمراہ چلو مگر اتنا خیال ضرور رہے کہ کبھی کوئی سوال شروع میں اپنی طرف سے نہ کرنا۔ جب تک میں ہی سوال تم سے نہ کروں۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''مجھے یہ شرط منظور ہے۔''

اس کے بعد دونوں حضرات ساتھ ساتھ چل دیئے۔ چلتے چلتے دریا کے کنارے پہنچے۔ ایک کشتی سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ قریب پہنچے اور کشتی والوں سے کہا:

''ہمیں بھی اس میں سوار کر لیجئے، اس پار جانا ہے۔''

ملاحوں نے پہلے تو انکار کیا پھر خضر علیہ السلام کو پہچان کر ان کی تعظیم و توقیر کی اور اس کشتی میں سوار کر لیا۔ جس وقت کشتی دریا کے بیچ میں پہنچی تو حضرت خضر علیہ السلام نے ایک پتھر اٹھایا اور لوگوں سے آنکھ بچا کر کشتی میں سوراخ کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے کہا:

''آپ کا کام تو لوگوں کی رہنمائی اور بھلائی کرنا ہے اور آپ نے ثابت و سالم کشتی میں سوراخ کر دیا۔ اب اہل کشتی غرق ہو جائیں گے۔''

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا:

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم سے ہرگز صبر نہ ہوگا لیکن تم نہ مانے۔''

موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

''مجھ سے غلطی ہو گئی معاف فرمائیں اور اس کا سبب بتائیں۔''

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا:

''اے موسیٰ! یہ کشتی دس بھائیوں کی ملکیت ہے۔ جن میں سے پانچ بھائی بیمار اور بالکل بے کار ہیں اور باقی پانچ بھائی اس سے اپنی روزی روٹی کما رہے ہیں۔ میں نے خدا کے حکم سے اس کشتی کو عیب دار کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس ملک میں ایک ظالم بادشاہ ہے جس کے ملازم ثابت و سالم کشتیوں کو چھین لیتے ہیں۔ اس لیے میں نے اس کو عیب دار کر دیا کہ اسے بادشاہ کے ملازم چھین نہ سکیں۔''

ناؤ کس نے ڈبوئی؟ خواجہ خضر نے

دیکھیے: ناؤ خواجہ خضر نے ڈبوئی۔

ناؤ میں خاک اڑاتی ہے

سفید جھوٹ بولنا، کسی شخص پر غلط الزام رکھ کر سزا دینا، صریحاً غلط بات کہنا، عیاری کرنا، فریب دینا۔

یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی عیار سبز باغ دکھا کر کسی کو اپنے دام فریب میں پھنسا لے اور پھر اس پر تہمت لگا کر اس کا نقصان کرے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی بیان کی جاتی ہے جو اس طرح ہے:

کہانی: کسی گاؤں کے قریب ایک بڑا دریا تھا۔ ناؤ ہی کے ذریعہ مسافر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پہنچتے تھے۔ ایک روز بہت دیر سے ناؤ کنارے پر نہیں آئی تھی۔ لوگ ناؤ کے انتظار میں دریا کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں آدمی، عورتیں، بچے، بندر، شیر، بکری وغیرہ تھے۔ کافی دیر کے بعد جب ایک ناؤ آئی تو خوش ہو کر سب لوگ اس میں سوار ہو گئے۔ سب اپنے اپنے گاؤں کے قریب اترتے گئے۔ شام ہونے تک تمام جانور اور آدمی ناؤ سے اتر چکے تھے۔ شیر کو آخری گاؤں میں جانا تھا۔ وہ جنگل میں رہتا تھا اس سے پہلے بندر اور بکری کو ایک گاؤں میں پہنچنا تھا۔ جب کشتی بکری کے گاؤں کے قریب آئی تو وہاں اترنے کے لیے تیار ہوئی۔

شیر نے بکری کے کان میں کہا:

''بی بکری اب اندھیرا ہونے والا ہے۔ بندر کی ذات کو تو تم پہچانتی ہی ہو۔ وہ تمہیں ضرور دھوکا دے گا، اس کو کیا فکر ہے وہ تو رات میں درخت پر چڑھ جائے گا۔ کتے یا ریچھ تمہیں پھاڑ ڈالیں گے اور بندر بھی تمہارا گوشت اڑائے گا۔ تم رات میں اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکتی ہو۔ تم میرے ساتھ چلو، میرے ساتھ جنگل میں اتر جانا۔ تم چاہو تو کسی جھاڑی یا میرے غار میں آرام سے سونا اور صبح کو اپنے گاؤں چلی جانا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں اس جنگل کا راجا ہوں۔ کسی کی مجال ہے جو تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے اور تم جانتی ہی ہو میں تو جنگل میں نیل گائے، بھینس، ہرن وغیرہ کا شکار کرتا ہوں۔ جنگلی جانور

کے گوشت کو پسند کرتا ہوں تم تو بستی کی رہنے والی ہو۔ میں تو تمہارے پلپلے گوشت کو کھا بھی نہیں سکتا۔ برا نہ ماننا تمہارے جسم سے بدبو بھی آرہی ہے۔ جنگل میں جو تازہ ہوا اور صفائی ہے وہ بستی میں کہاں؟ پھر جنگل کے جانوروں کو تازہ اور ہری ہری گھاس وغیرہ ملتی ہے۔ تم دیکھتی ہو جنگلی جانوروں کے جسم کیسے کندن کی طرح دمکتے ہیں۔ تمہاری ہڈیوں پر کھال ہی کھال ہے۔ تم تو میرا ایک نوالہ ہو۔ نیل گائے کا جو گوشت اچھا ہوتا ہے میں اسے کھالیتا ہوں اور جو گوشت خراب ہوتا ہے اسے گیدڑوں کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ میں قطعی لالچ نہیں کرتا اور نہ ہر وقت کسی جانور کی جان ہی لیتا ہوں۔"

بکری نے شیر کی باتیں سنیں تو سب ٹھیک معلوم ہوئیں۔ شیر سے کہنے لگی:

"اچھا! ٹھیک ہے تم اتنی مہربانی کررہے ہو تو ایک رات تمہاری مہمان بن کر رہنے میں میرا کیا جاتا ہے؟"

شیر نے کہا:

"سوچ لو تمہاری مرضی کی بات ہے۔ میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟ مجھے تمہارا کیا سہارا میرا گاؤں آجائے گا تو خوشی سے بنسی بجاؤں گا۔"

بکری اب اطمینان سے ناؤ میں بیٹھ گئی اور شیر بھی مطمئن ہوگیا کہ آج بڑھیا شکار پھنسا ہے۔ ناؤ پانی پر چل رہی تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد شیر نے بکری کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں مل کر کہا:

"بی بکری! میں تو تجھے بہت سیدھا اور نیک سمجھتا تھا تو تو بہت شریر معلوم ہوتی ہے۔ میں نے تجھے ابھی بھلائی کی بات بتائی اور تو ناؤ میں خاک اڑاتی ہے۔ میرے جسم کو خراب کررہی ہے۔ آنکھوں میں خاک پڑ جائے تو اندھا ہو جاؤں گا۔"

بکری نے نرم لہجے میں کہا:

"اے جنگل کے راجا! یہاں ناؤ میں خاک کہاں ہے؟ جو میں اڑاتی۔"

شیر بپھرا اور گرج کر کہنے لگا:

"اری مردار! تو بڑی ہی بدتمیز اور چرب زبان ہے۔ میں قاعدے کی بات کررہا ہوں اور تو زبان لڑاتی ہے۔ دیکھ تیری ابھی خبر لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور بکری کو چیر پھاڑ کر ہڑپ کر گیا۔

نائی کا بچہ، سب سے اچھا

ہر شخص کو اپنی اولاد پیاری ہوتی ہے۔ ہر شخص کو اپنی چیز اچھی لگتی ہے۔ یہ کہاوت اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کی چاہت میں بھلے برے کی پہچان بھول جاتا ہے۔ اس کہانی کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کسی راجا نے اپنی نائی سے کہا:

"اس شہر کے سب سے خوبصورت بچے کو ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ کام تمہارے سپرد کرتے ہیں تم جاؤ اور دو تین دن میں اس شہر سے سب سے خوبصورت بچہ ڈھونڈ کر میرے سامنے لاؤ ہم اسے انعام واکرام سے نوازیں گے۔"

نائی نے پورے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا مگر اس کو ایک بھی خوبصورت بچہ نظر نہ آیا۔ آخر میں جب وہ اپنے گھر آیا تو اسے اپنا لڑکا شہر کے تمام لڑکوں سے حسین معلوم ہوا۔ وہ اپنے بچے کو نہلا دھلا کر اور اچھے کپڑے پہنا کر راجا کے دربار میں لے گیا اور بادشاہ سے کہنے لگا:

"حضور! میں شہر کے سب سے خوبصورت بچے کو لے آیا ہوں۔"

راجا نے اس کالے کلوٹے بچے کو دیکھ کر ناک بھوں سکوڑی اور غضب ناک ہو کر پوچھا:

"یہ کس کا لڑکا ہے اور اسے کہاں سے پکڑ لائے ہو۔"

نائی نے کانپتے ہوئے جواب دیا:

"حضور یہ میرا لڑکا ہے اور اس شہر میں مجھے اس سے خوبصورت بچہ دوسرا نظر نہیں آیا۔ اس لیے اس کو لے کر آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔"

راجا اس کا یہ جواب سن کر سمجھ گیا کہ اپنے بچے کی چاہت نے اس سے بھلے برے کی تمیز چھین لی ہے۔ اسی لیے اس کو اپنا بچہ سب سے حسین نظر آرہا ہے۔ شہر کے باقی سب بچے اس کے مقابلے میں کم تر اور ہیچ معلوم ہو رہے ہیں۔ چلیے میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ "نائی کا بچہ سب سے اچھا۔"

نائی کا جامہ، کاہے پہنا

ایسا کام کیوں کیا جو بے عزتی کا سبب بنا۔ ایسی چیز کو کیوں اختیار کیا جو ندامت کا سبب بنی۔ جب

کوئی شخص کسی چیز کو باعث عزت خیال کرے اور وہی چیز بے عزتی کا سبب بن جائے تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک حکایت ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی حجام کے پاس ایک جامہ تھا جو شادی بیاہ میں دولہا کو پہنایا جاتا تھا۔ ایک ٹھاکر کے لڑکے کی بارات جانا تھی۔ ٹھاکر صاحب نائی کے پاس گئے اور اس سے جامہ ادھار مانگ کر لے آئے۔ لڑکے کو جامہ پہنا کر بارات روانہ ہوئی۔ ٹھاکر صاحب اسی نائی کے ججمان تھے۔ اس لیے نائی بھی بارات کے ساتھ چلا۔ وہاں سب لوگ تو اپنے اپنے کام میں مصروف تھے مگر نائی کو اپنے جامہ کی فکر پریشان کر رہی تھی۔ دولہا جب بھی ادھر ادھر چلے یا بیٹھے وہ اس سے کہے ذرا جامہ کا خیال رکھیے کہیں گندہ یا خراب نہ ہو جائے۔ نائی کے اس طرح بار بار کہنے سے لوگ تاڑ گئے کہ ضرور کوئی بات ہے۔ جب لوگوں نے نائی سے اس کی وجہ پوچھی کہ:

''تم بار بار یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ دیکھو جامہ خراب یا گندہ نہ ہو جائے۔''

نائی نے جواب دیا:

''میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ جامہ میرا ہے میں تو بس یہ ہی کہہ رہا ہوں کہ دیکھو جامہ خراب یا گندہ نہ ہو جائے۔''

نائی کی یہ بات ٹھاکر کو ناگوار گزری۔ سب کے سامنے بارات میں اس نے اپنی بے عزتی محسوس کی۔ اپنے لڑکے یعنی دولہا کو مخاطب کر کے اس نے طیش میں آ کر کہا:

''نائی کا جامہ کاہے پہنا۔''

اسی وقت سے اس فقرہ نے مثل کا روپ اختیار کر لیا۔

نٹ ودھیا پائی جائے، جٹ ودھیا نہ پائی جائے

نٹ کا علم و فن حاصل کیا جا سکتا ہے مگر جاٹ کا نہیں۔ جاٹوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے آگے کسی کو نہیں چلتی۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی جاٹ کسی کے ساتھ ہوشیاری اور چالاکی سے کام لے کر اپنا الو سیدھا کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دلچسپ حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی شہر میں ایک نٹنی (نٹ کی بیوی) رہتی تھی۔ وہ اپنے فن میں یکتا تھی۔ اس کے فن کی

دور دور تک شہرت تھی۔ اس ملک کے راجا کو جب پتا چلا تو اس نے نٹنی کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اس سے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے کہا۔ نٹنی نے حیرت انگیز کرتب دکھائے کہ راجا اس کے فن کا گرویدہ ہو گیا۔ اس نے نٹنی سے کہا:

"اگر کوئی تجھے نٹ ودھیا میں مات نہ کر سکے گا تو میں تجھے اپنا آدھا راج پاٹ دے دوں گا اور اگر کسی نے مات کر دیا تو آدھا راج پاٹ اس کو انعام میں ملے گا۔"

راجا نے اپنے تمام راج میں اعلان کرا دیا۔ دُور دُور سے فن کار آئے مگر نٹنی کو کوئی مات نہ کر سکا۔ نٹنی بہت خوش تھی کہ اب آدھے راج پاٹ کی وہ مالک ہو جائے گی۔ جاٹ کو جب اس شرط کا پتا چلا تو اس نے راجا کے دربار میں آ کر کہا: "مہاراج! میں اس کو مات کر سکتا ہوں۔"

راجا نے اس سے کہا: "ٹھیک ہے تم بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر کے دیکھ لو۔"

جاٹ نے فوراً لوہے کے دستانے پہنے اور بانس کے اوپر چڑھ کر چاروں طرف گھوم گھوم کر ننگا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ ہنسنے لگے اور نٹنی نے شرم سے اپنا منہ پھیر لیا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد راجا سے بولی: "مہاراج! مجھے اپنی شکست منظور ہے میں ایسا نہیں کر سکتی۔ آپ اپنا آدھا راج پاٹ اسی جاٹ کو انعام میں دے دیں۔"

راجا نے جاٹ کو انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے کہا:

"نٹ ودھیا پائی جائے، جٹ ودھیا نہ پائی جائے۔"

اسی وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا۔

نماز بخشوانے گئے تھے، روزے گلے پڑے

دیکھیے: گئے تھے نماز کو روزے گلے پڑے۔

نماز بھی نہ گئی اور بلی بھی بھاگ گئی

دونوں طرف سے فائدے میں رہے۔ نقصان بھی نہ ہوا اور ترکیب سے کام بھی بن گیا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب بغیر نقصان اٹھائے کسی خاص تدبیر سے کام بن جائے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مسجد کے امام کے لیے محلے کے ایک گھر سے کھانا آتا تھا۔ ایک دن ان کے لیے

بہترین حلوا آیا۔ امام صاحب نے اس حلوے کو منبر کے پاس اپنے سامنے رکھ دیا اور نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ابھی ایک ہی رکعت نماز پڑھائی تھی کہ ایک بلی حلوے کے پاس آ گئی۔ امام صاحب نے بلی کو دیکھا تو پس و پیش میں پڑ گئے۔ اپنے دل میں سوچنے لگے کہ اگر وہ بلی کو بھگانے کے لیے کچھ کہتے ہیں یا مارتے ہیں تو نماز میں خلل ہوگا اور اگر نماز پڑھاتے رہیں گے تو بلی حلوے کو چٹ کر جائے گی۔ یکا یک ان کی سمجھ میں ایک تدبیر آ گئی۔ انہوں نے دوسری رکعت میں سورۂ الحمد پڑھنا شروع کی۔ الحمد للہ رب تک کی قرأت تو اسی لہجے میں ادا کی جس لہجے میں انہوں نے پہلی رکعت کی قرأت کی تھی مگر "رب" کے بعد "رب العالمین" کا "بل" نہایت بلند آواز اور جھٹکے کے ساتھ ادا کیا کہ بلی ڈر کر بھاگ گئی۔ اس طرح امام صاحب کی نماز بھی نہ گئی اور بلی بھی بھاگ گئی یعنی نماز بھی نہ گئی اور حلوا بھی بچ گیا۔

نماز بھی نہ گئی اور حلوا بھی بچ گیا

دیکھیے: نماز بھی نہ گئی اور بلی بھی بھاگ گئی۔

نماز کو گئے تھے، روزے گلے پڑے

دیکھیے: گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی۔

نمازی کا ٹکا، آخر ڈھیر ہو گیا

لالچ انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ بری عادت ذلت کا سبب بنتی ہے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی غلط کام کو اپنے فائدے کا ذریعہ بنا لے اور ایک روز وہی غلط کام یا بری عادت اس کو لے ڈوبے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک شریر لڑکا رہتا تھا۔ وہ اگر کسی شخص کو نماز پڑھتے دیکھتا تو شرارت کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا۔ نماز پڑھنے والا جیسے ہی سجدہ کرتا۔ پیچھے سے اس کے پیر کھینچ لیتا اور نماز پڑھنے والا منہ کے بل گر پڑتا۔ لڑکا قہقہے لگاتا ہوا وہاں سے بھاگ جاتا۔ اس محلے میں ایک بوڑھا نمازی رہتا تھا۔ بوڑھے نمازی نے جب اس لڑکے کی یہ نازیبا حرکت دیکھی تو اس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن وہ لڑکا نماز پڑھتے وقت اس کا پیر کھینچ لے اور وہ اوندھے منہ گر جائے۔ اس سے بچنے کے لیے اس نے

لڑکے کو ایک ٹکا دیا کہ وہ اس کے پیر کھینچنے سے باز رہے۔ اس سے لڑکے کا حوصلہ بڑھ گیا اور اب وہ بہتوں سے ایک ایک ٹکا وصول کرنے لگا۔ جو نمازی اسے ٹکا نہ دیتا۔ نماز پڑھتے وقت اس کے پیر کھینچ لیتا۔ ایک دن ایک پٹھان مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا جس نے لڑکے کو ٹکا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پٹھان نے جوں ہی سجدے کے لیے سر جھکایا کہ لڑکے نے اس کے پیر کھینچ لئے۔ پٹھان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ کھڑا ہو گیا اور گھوم کر اس کی پیٹھ پر جوں ہی ایک گھونسا جمایا، لڑکا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایک شخص نے جب یہ ماجرا دیکھا تو وہ کہہ اٹھا: ''نمازی کا ٹکا، آخر ڈھیر ہو گیا۔'' اسی وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا۔

ننگی بھلی کہ موسل آڑے

دو خراب کاموں میں سے جو کام سب سے خراب ہو اسے کرنا چاہئے۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی شخص کو مجبوراً برا کام کرنا پڑے بالخصوص جب اس کو دو خراب کاموں میں سے کسی ایک کا کرنا ضروری ہو مگر وہ کم برے کام کے بجائے زیادہ برے کام کو کرے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کوئی عورت اپنے گھر کے آنگن میں ننگی ہو کر کھا رہی تھی۔ گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ اچانک اس کا سمدھی وہاں آ گیا۔ سمدھی نے گھر میں داخل ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ جب اسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ سیدھا آنگن میں چلا آیا۔ عورت اسے دیکھ کر ایک دم گھبرا گئی۔ اس کے پاس کوئی کپڑا نہیں تھا۔ وہ اپنے جسم کو کیسے چھپاتی۔ جب اسے کچھ نہیں ملا تو سامنے رکھے ہوئے موسل ہی کو اٹھا کر اس نے سامنے آڑ کر لی۔ سمدھی نے جب یہ منظر دیکھا تو سمدھن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''تم موسل آڑ کر اور بھی برا کر رہی ہو، اس سے تو ننگی ہی بھلی تھی یعنی ننگی بھلی کہ موسل آڑے۔''

ننگی ناچے پوت کھائے، بیٹا کی سوں یہ ہی آئے

میں اپنی اولاد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو عورت ننگی ہو کر ناچنے کے لیے تیار ہے اسی نے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے کاموں یا اپنی باتوں ہی سے اپنا قصور قبول کر لے تو کہتے ہیں۔ یعنی ایسی حرکت کرنا جس سے شک و گمان یقین میں بدل جائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا تعلق ایک حکایت ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

حکایت: ایک شخص کی دو بیویاں تھیں۔ بڑی بیوی کی گود میں ایک لڑکا تھا مگر چھوٹی بیوی کی گود سونی تھی۔ وہ بظاہر اپنی سوت اور سوت کے لڑکے کو چاہتی تھی مگر بہ باطن حسد کی آگ میں جل رہی تھی۔ ایک روز بڑی بیوی نہانے گئی کہ موقع پا کر چھوٹی بیوی نے بڑی بیوی یعنی اپنی سوت کے لڑکے کو گردن دبا کر مار دیا اور اس کی لاش کے پاس چیخیں مار مار کر رونے لگی کہ بڑی نے مجھے بدنام کرنے کے لیے اپنے بیٹے کو مار ڈالا ہے۔ اس کے رونے کی آواز سن کر گھر اور محلے کے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑی بیوی بھی نہا کر واپس آ گئی۔ اس نے یہ ماجرا دیکھا تو اسے بہت دکھ ہوا۔

اس نے لوگوں سے کہا:

"میں تو نہانے گئی تھی، میری غیر موجودگی میں موقع پا کر چھوٹی نے میرے بچے کو قتل کر دیا ہے۔ میری دنیا لٹ گئی، گود سونی ہو گئی، اب میں کیا کروں؟"

دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتی رہیں اور ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتی رہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ قصوروار کون ہے۔ کس نے بچے کا قتل کیا ہے؟ آخر میں معاملہ گاؤں کے مکھیا کے پاس پہنچا۔ مکھیا نے دونوں کو بلا کر سب کے سامنے دونوں کے بیانات لیے اور چکر میں پڑ گیا۔ اس کی بھی سمجھ میں نہ آیا کہ ان دونوں میں کون قاتل ہے؟ کیوں کہ دونوں اپنے آپ کو بے قصور اور ایک دوسرے کو قاتل کہہ رہی تھیں۔ کچھ غور و فکر کرنے کے بعد مکھیا نے کہا:

"تم دونوں میں جو ننگی ہو کر سب کے سامنے ناچے گی وہ بے قصور سمجھی جائے گی۔"

بڑی بیوی نے مکھیا کی تجویز سن کر کہا:

"یہ اچھا انصاف ہے۔ ایک تو میں نے اپنی اولاد کھوئی اور اب لاج بھی کھوؤں۔ آپ چاہے مجھے قصوروار سمجھیں یا قاتل ٹھہرائیں مگر میں ننگی نہیں ہو سکتی۔"

چھوٹی بیوی نے کہا:

"جب میں نے کوئی قصور کیا ہی نہیں تو ننگی ناچنے سے کیوں ڈروں؟"

یہ کہہ کر کپڑے اتارنے کی تیاری کرنے لگی۔ مکھیا نے فوراً اسے کپڑے اتارنے سے روک دیا اور سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"جو عورت ننگی ناچنے کے لیے تیار ہے اسی نے لڑکے کو قتل کیا ہے۔ میں بیٹے کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہی قصوروار ہے یعنی ننگی ناچے پوت کھائے، بیٹا کی سوں یہ ہی آئے۔"

ننیانوے کے پھیر میں پڑ گئے

رات دن دولت جمع کرنے کی فکر میں ہیں۔ جب کوئی شخص آرام و آسائش ترک کرکے ہر وقت دولت اکٹھا کرنے کی فکر کرے یا دولت جمع کرنے ہی میں لگا رہے تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔
اس کہاوت کا تعلق کئی لوک کہانیوں سے ہے جو مقامی طور پر معمولی فرق کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں جن میں سے خاص یہ ہیں:

حکایت ۱: دو حقیقی بہنوں کی ایک ہی شہر میں شادی ہوگئی۔ ایک بہن کا بیاہ مالدار کھاتے پیتے گھرانے میں ہوا اور دوسری کا غریب خاندان میں۔ غریب بہن جب مالی مشکلات کا سامنا کرتے کرتے پریشان ہوگئی اور گھر چلانا مشکل ہوگیا تو اسے اپنی مالدار بہن کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ مالدار بہن جانتی تھی کہ میری بہن غریب ہوتے ہوئے بھی اپنے خاندان کے ساتھ مطمئن ہے اور ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہے اور میں مالدار ہوتے ہوئے بھی سکون و اطمینان سے زندگی نہیں گزار سکتی۔ رات دن کوئی نہ کوئی فکر لگی رہتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے دو چار روپے کے بجائے ننیانوے روپے اپنی بہن کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ بہن اتنے روپے دیکھ کر خوش ہوگئی اور خوشی خوشی اپنے گھر آکر جلدی جلدی روپے گننے لگی۔ روپے گننے پر اسے معلوم ہوا کہ ننیانوے روپے ہیں۔ جس کام کے لیے اپنی بہن سے روپے لے کر آئی تھی اب وہ اس کام کو بھول گئی اور سوچنے لگی کہ کس طرح یہ پورے سو روپے ہو جائیں۔ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ کاٹ کر اس نے کسی طرح ایک روپیہ بچایا اور پورے سو روپے کر لئے۔ اس کے بعد اسے سوا سو روپے کرنے کی فکر ہوئی۔ جب سوا سو روپے ہوگئے تو ڈیڑھ سو، دو سو، تین سو تک بڑھتی گئی۔ اس طرح اس کی یہ ہوس کبھی کم نہ ہوئی۔ دولت جمع کرنے کے پھیر میں وہ اپنا اور اپنے خاندان کا سکھ چین گنوا بیٹھی۔

اس کہاوت کے تعلق سے دوسری کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۲: کسی شہر میں ایک برہمن اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ برہمن کی روزانہ کی آمدنی صرف چار پیسے تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اسی میں گزر بسر کرتے تھے اور اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے۔ برہمن کے بڑے بھائی کی بیوی امیر گھرانے کی تھی۔ وہ اپنے دیور اور دیورانی کی سکھی زندگی کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جلا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے اپنے غریب دیور کی جھونپڑی میں ننیانوے روپے کی ایک تھیلی پھینک دی۔ برہمن نے روپے گنے اور گن کر اپنی بیوی سے کہا:

"کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ پورے سو روپے ہوتے۔ بھگوان نے دیئے بھی تو ایک کم سو۔"

اب دونوں میاں بیوی اسی چکر میں پڑ گئے کہ کسی طرح پورے سو روپے ہو جائیں۔ انہوں نے چار کی جگہ تین پیسوں میں گزارا کرنا شروع کر دیا۔ دو مہینے میں ایک روپیہ ہو گیا۔ اس طرح اب ان کے پاس پورے سو روپے ہو گئے مگر سو روپے ہو جانے پر ان کی طمع اور بڑھ گئی۔ وہ دو پیسے ہی میں گزر بسر کرنے لگے۔ دھیرے دھیرے ان کو کھانا پینا اور بھگوان کی پوجا بری لگنے لگی۔ روپیہ اکٹھا کرنے کی فکر رات دن رہنے لگی۔ اب ان کی زندگی میں پہلے جیسی خوشگواری اور مسرت دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔ اس طرح برہمن کی بھابی کی خواہش پوری ہوئی۔

تیسری کہانی اس طرح مشہور ہے:

حکایت ۳: کسی شہر میں ایک نہایت مالدار سیٹھ رہتا تھا۔ اس کی حویلی کے سامنے سڑک کے اس پار ایک بھکاری کی جھوپڑی تھی جس میں وہ رہتا تھا۔ بھکاری دن بھر بھیک مانگتا اور دیر رات تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ گانجا پی کر بھجن گاتا اور ڈھولک، مجیرے وغیرہ باجے بجاتا۔ ڈھول مجیروں کی آواز اور زور زور سے بھجن گانے کی وجہ سے سیٹھ کی نیند ٹوٹ جاتی اور پھر وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا۔ سیٹھ جب بہت پریشان ہو گیا تو اس نے ایک ترکیب اپنائی۔ اس نے بھکاری کی جھونپڑی میں ننانوے روپے کی ایک تھیلی کسی سے رکھوا دی۔ بھکاری نے تھیلی کے روپے گنے اور اب اسے سو پورے کرنے کی فکر ہوئی۔ اب وہ رات گئے تک بھیک مانگنے لگا۔ اس نے گانجا پینا بھی چھوڑ دیا۔ دھیرے دھیرے اس کے یار دوستوں کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ جب سو روپے کی تھیلی پوری ہو گئی تو اسے دوسری سو روپے کی تھیلی پوری کرنے کی فکر ہوئی۔ اس طرح اب وہ رات دن روپیہ اکٹھا کرنے میں جٹ گیا اور گانا بجانا، بھجن وغیرہ سب چھوٹ گیا۔ سیٹھ کی تدبیر کام آئی اور وہ ہر رات سکھ کی نیند سونے لگا۔

ننیانوے گھڑے دودھ میں ایک گھڑا پانی

سب کی سوچ ایک جیسی، سب کا حال ایک جیسا، سب کو اپنے فائدے کی فکر، سب کے سب ہوشیار چالاک اور عیار۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جہاں سب لوگ ایک جیسا سوچیں یا سب ایک ہی ڈھنگ سے کام کریں۔ اس کہاوت کا تعلق ایک دلچسپ لوک کہانی سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

کہانی: کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اکبر بادشاہ نے بیربل سے پوچھا کہ پیسے والے سب سے زیادہ

عقل منداور ہوشیار ہیں۔ بیر بل نے جواب دیا:

"جہاں پناہ! سب سے زیادہ عقل منداور ہوشیار لوگ گوالے یعنی دودھ کا کاروبار کرنے والے ہیں۔"

اکبر نے کہا:

"اس کا ثبوت پیش کرو۔"

بیر بل نے اکبر کی اجازت سے اسی وقت شہر کے سو گوالوں کو بلوایا اور ان کو حکم دیا کہ اس حوض کو دودھ سے بھرنا ہے۔ اس لیے سب گوالے بارہ بجے رات میں دودھ سے بھرا ہوا ایک ایک گھڑا لا کر اس میں ڈالیں۔ جو حکم کہہ کر تمام گوالے اپنے اپنے گھر آ گئے۔ گھر پہنچ کر ہر گوالے نے سوچا کہ ننیانوے گھڑے دودھ میں ایک گھڑے پانی کا کیا پتا چلے گا۔ رات میں کون دیکھے گا کہ گھڑے میں دودھ ہے یا پانی۔ رات ہوئی اور ہر گوالا پانی سے بھرا ہوا گھڑا لا کر حوض میں انڈیل گیا۔ صبح اکبر اور بیر بل نے جب حوض کا معائنہ کیا تو اسے پانی سے بھرا پایا۔ دودھ کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ اکبر گوالوں کی ہوشیاری اور عقل مندی کا لوہا مان گئے اور ساتھ ہی بیر بل کی دوراندیشی کے بھی قائل ہو گئے۔

نوسو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

بہت سے گناہ کر کے تائب ہونے کی کوشش۔ تمام عمر گناہ کرنے کے بعد پرہیز گار بننے کی کوشش۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص تمام عمر گناہ کرے اور آخر میں پارسا بن بیٹھے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کسی شہر میں ایک پیشہ ور طوائف رہتی تھی۔ وہ جسم فروشی کا دھندا کرتی تھی۔ اس کے کوٹھے پر ہر طرح کے لوگ آتے تھے۔ جب تک وہ جوان رہی حسن وشباب کا عالم رہا، لوگ اس کے پاس اپنا دل بہلانے آتے رہے۔ جب وہ بوڑھی ہو گئی اور اس کے چاہنے والوں کی تعداد دھیرے دھیرے کم ہو گئی تو اس نے ایک دن سوچا کہ میں نے زندگی بھر گناہ کیا اور اب تک کوئی نیک کام نہیں کیا۔ کیوں نہ حج کر کے اپنے من کو ہلکا کروں۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ جو رحمن ورحیم ہے حج کے صلے میں میرے گناہ معاف فرمادے۔ یہ سوچ کر اس نے حج کا ارادہ کر لیا۔ حج کے لیے جاتے وقت اس نے اپنے عزیز واقارب اور محلے والوں کو بلوایا اور ان سے اپنا قصور معاف کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا:

''زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ اب میں حج کرنے جا رہی ہوں۔''

یہ سن کر ایک منچلے نوجوان نے کہا:

''کیا خوب! اللہ تیری شان، نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔''

اس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا۔

نو سے چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

دیکھیے: نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔

نوکر لاٹ کپور کے، ہونٹ ملیں اور حق لیں

ڈھیٹ اور منہ لگا نوکر۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی کی ڈھٹائی اور ضد کے آگے مجبور ہونا پڑے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک چھوٹی سی کہانی سے ہے۔ جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: اکبر بادشاہ کے زمانے میں لاٹ کپور نام کا ایک مغنی تھا۔ جو اپنے پیشے میں یکتا تھا۔ جب وہ کسی کے یہاں مجرا سنانے جاتے تھے اور وہ انہیں انعام و اکرام سے نوازتے وقت احتراماً اور ادباً یہ کہہ دیتا کہ یہ آپ کے نوکروں کے لیے ہے تو اس کے نوکر گھر آ کر ڈھٹائی سے انعام و اکرام کی رقم اور تحائف اس سے لے لیتے کہ یہ انعام و اکرام تو ہم لوگوں کو ملا ہے۔ اسی وقت سے یہ کہاوت ہو گئی کہ:

''نوکر لاٹ کپور کے، ہونٹ ملیں اور حق لیں۔''

نوکر مالک کے ہیں، بینگن کے نہیں

دیکھیے: آپ کا نوکر ہوں، کچھ بینگنوں کا نہیں۔

نہ بات برائی کہو، نہ اینچا تانی سہو

نہ دوسرے کی چغلی کرو نہ پریشانی میں پڑو یعنی دوسروں کے جھگڑوں یا معاملات میں پڑنے سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کہاوت کا تعلق ایک لوک کہانی سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی جنگل میں سیاروں کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ ایک روز جب مادہ سیار کھانے کی تلاش

میں جنگل میں گھوم رہی تھی تو اسے دردِ زہ ہونے لگا۔ اس نے دور تک نظر دوڑائی کہ کوئی محفوظ مقام مل جائے جہاں وہ اپنے بچے کو جنم دے سکے مگر شیر کی ماند کے علاوہ اسے اس لائق کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ مجبور ہو کر وہ اسی کے اندر جا گھسی اور وہیں اسے بچے دینے پڑے۔ جب نر سیار کو پتا چلا کہ اس کی بیوی سیارن نے شیر کی ماند میں بچے جنے ہیں تو وہ بہت گھبرایا اور سیارن کے پاس پہنچا۔ شام ہو رہی تھی، شیر کسی وقت بھی اپنی ماند میں آ سکتا تھا اور سیار اور سیارن اتنی جلدی کسی بھی طرح اس ماند کو چھوڑنے کی حالت میں نہیں تھے۔ اس لیے نہایت غور و فکر کرنے کے بعد سیار نے ایک تدبیر سوچی۔ اس نے سیارن سے کہا:

''میں چھپ کر دیکھتا ہوں، جس وقت شیر ماند کے قریب آئے گا تو میں تمھیں بتا دوں گا۔ تم فوراً ان بچوں کو رلا دینا۔ میں پوچھوں گا بچے کیوں رو رہے ہیں؟ تم جواب دینا: راجا شاہ عالم! بچے بھوکے ہیں اور شیر کا تازہ گوشت مانگ رہے ہیں۔ بس تم اتنا کہہ دینا۔ باقی معاملہ میں سنبھال لوں گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد شیر وہاں آیا۔ فوراً سیار اور سیارن میں سوالات و جوابات شروع ہو گئے۔ جب سیارن نے کہا: ''بچے شیر کا تازہ گوشت کھانے کی ضد کر کے رو رہے ہیں۔''

تو سیار بولا:

''اس جنگل میں شیروں کی کیا کمی ہے؟ میں ابھی دو چار شیر مار کر لاتا ہوں۔ بچوں سے کہو بس تھوڑا صبر کریں۔''

شیر یہ سن کر نہایت خوفزدہ ہوا اور ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ گیا۔ راستے میں اسے ایک دوسرا شیر ملا اور شیر کو بدحواس و خوفزدہ دیکھ کر اس سے اس کا سبب پوچھا۔ شیر نے اس سے کہا:

''میری ماند میں راجا شاہ عالم نے قبضہ کر رکھا ہے اور وہ شیروں کو مار کر ان کا گوشت اپنے بچوں کو کھلائے گا۔''

ایک سیارا سارے معاملے کو بھانپ گیا اور اس نے شیر سے کہا:

''یہ سب جھوٹ ہے، اس میں تو ایک میرے جیسے معمولی سیار نے ڈیرا جما رکھا ہے۔ راجا شاہ عالم کہاں سے آ گئے؟''

مگر شیر نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ سیار نے کہا:

''اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو میں آپ کے ساتھ چل کر دکھا سکتا ہوں کہ

اصلیت کیا ہے؟"

لیکن شیر کسی طرح راضی نہیں ہوا۔ آخر میں سیار نے کہا:

"تم اپنی اور میری دم ایک ساتھ باندھ لو اور چلو۔ اس طرح میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں بھاگ سکوں گا۔"

یہ تجویز شیر کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے دونوں دُموں کو ایک ساتھ باندھا اور ماند کی طرف چل دیئے۔ ماند والے گیدڑ نے جب دیکھا کہ اسی کی برادری اور ذات والا اس کو مروانا چاہتا ہے تو اس کے دماغ میں فوراً ایک تدبیر آئی۔ جب ایک دوسرے کی دم سے جڑے ہوئے شیر اور سیار ماند کے پاس آئے تو ماند والے سیار نے غضب ناک ہو کر کہا:

"اے کمینے اور نکمے سیار۔ کہاں جا کر مر گیا تھا اور اتنی دیر تک کیا کرتا رہا۔ بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ میں نے تجھ سے دو شیر لانے کے لیے کہا تھا تو اتنی دیر میں صرف ایک ہی شیر لایا ہے۔"

شیر یہ سن کر اپنی جان ہتھیلی میں لے کر اور سر پاؤں رکھ کر سرپٹ بھاگا۔ جو سیار شیر کی دم میں اپنی دم بندھوا کر آیا تھا وہ چلاتا ہی رہ گیا کہ:

"یہ سب جھوٹ ہے۔ یہاں کوئی راجا شاہ عالم نہیں ہے۔"

مگر شیر اس کو جنگل میں گھسیٹتا ہوا بھاگتا رہا۔ اس کا جسم چکنا چور ہو گیا۔ جگہ جگہ چوٹیں آئیں۔ سیار نے اپنی بدترین حالت دیکھ کر کہا:

"نہ برائی بات کہو، نہ اینچا تانی سہو۔"

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

دیکھیے: نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔

نہ رہے بانس، نہ بجے بانسلی

دیکھیے: نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔

نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری

جھگڑے کی جڑ کو ختم کرنا چاہئے۔ جب اصل چیز ہی نہ ہوگی تو جھگڑا کیوں ہوگا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی جھگڑے یا مسئلے سے نجات حاصل کرنے کے لیے بنیاد ہی کا مٹا دینا ضروری ہو۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ لوک کہانی اس طرح مشہور ہے:

کہانی: کسی گاؤں کے لوگوں نے نہ کبھی کوئی بانسری دیکھی تھی اور نہ بانسری کی آواز سنی تھی۔ اتفاق سے اس گاؤں میں ایک شخص بانسری لے کر پہنچا اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا ہو کر بانسری بجانے لگا۔ گاؤں کے لوگوں نے جب بانسری کی آواز سنی تو ڈھیرے ڈھیرے وہاں اکٹھا ہو گئے۔ ان لوگوں کو بانسری کی آواز بہت بھلی لگی۔ ایک شخص نے بانسری والے سے پوچھا:

"یہ کیا چیز ہے اور کیسے بنائی ہے؟"

اس نے کہا:

"یہ بانسری ہے اور بانس سے بنائی جاتی ہے۔ اگر تم مجھے بانس لا کر دے دو تو میں تھوڑی دیر میں ایسی ہی بانسری بنا دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ تم اتنا بڑا بانس لاؤ گے جس سے دو بانسری بن سکیں۔ میں ایک بانسری تم کو دوں گا اور دوسری بانسری اپنی اجرت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لوں گا۔"

پورے گاؤں میں بانس کی کوٹھی یعنی ہنسواڑی (وہ جگہ جہاں کثرت سے بانس ہو) صرف اس گاؤں کے مکھیا کے یہاں تھی۔ وہ شخص مکھیا کے پاس گیا اور ان سے مانگ کر ایک بانس لے آیا۔ بانسری والے نے ایک بانسری بنا کر اسے دے دی۔ باقی بانس اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا شخص مکھیا کے یہاں بانس مانگنے گیا۔ مکھیا نے اسے بھی بانس دے دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے بہت سے لوگ مکھیا کے یہاں بانس لینے کے لیے پہنچے۔ مکھیا نے ان سے پوچھا:

"میں تو بانس دیتے دیتے پریشان ہو گیا ہوں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جس کو دیکھو وہ آج بانس لینے کے لیے چلا آ رہا ہے۔"

ایک شخص نے جواب دیا:

"ہمارے گاؤں میں ایک بانسری بجانے والا آیا ہے جو بانس میں سوراخ کر کے بانسری

بنا تا ہے جو بانس لاتا ہے، اسی کو وہ بانسری دے دیتا ہے۔"

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ اور کئی لوگ وہاں آ کر کھڑے ہو گئے اور مکھیا سے کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مکھیا ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"اچھا آپ لوگ بھی بانسری بنوانے کے لیے بانس لینے آئے ہیں۔"

ان لوگوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ مکھیا نے کہا:

"تم لوگوں کو بانس دیتے دیتے تو میں عاجز ہو گیا ہوں۔ اب نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی بنسواڑی میں آگ لگا دی۔ کچھ دیر کے بعد تمام بانس جل کر خاک ہو گئے۔

نہ لینا ایک نہ دینا دو

دیکھیے: لینا ایک نہ دینا دو۔

نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی

نہ سامان کثیر بہم پہنچے گا نہ یہ امر ظہور میں آئے گا۔ کسی کام میں ایسی شرطیں لگانا جن کا پورا ہونا ناممکن یا دشوار ہو۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک چھوٹی سی لوک کہانی مشہور ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کہاوت اس قصہ کی تلمیح ہے جو کرشن جی اور رادھا میں ناچنے کی بابت ایک رات ہوا تھا۔ لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی شہر میں رادھا نامی ایک طوائف رہتی تھی۔ اس نے خود کو رقاصہ کی حیثیت سے دور دراز تک مشہور کروا دیا تھا مگر وہ ٹھیک طرح ناچنا نہ جانتی تھی۔ کسی تقریب کے موقع پر جب کوئی اسے ناچنے کے لیے دعوت دیتا تو وہ اس سے کہتی:

"ٹھیک ہے میں تمہاری بات ٹالوں گی نہیں۔ اپنے بے مثل رقص کے ذریعہ تمہاری تقریب کی رونق ضرور بڑھاؤں گی۔ تم تو میری شرط سے واقف ہی ہو گے کہ میں اس تقریب میں ناچتی ہوں جس میں نو من تیل کا چراغ جلایا جاتا ہو۔ کیوں کہ میں ایسی ویسی رقاصہ نہیں ہوں جو ہر تقریب میں ناچے۔ اس لیے پہلے نو من تیل کا چراغ جلواؤ

تب ناچوں گی۔"

رقاصہ کی یہ شرط سن کر کسی نے کہا:

"نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔"

اس کہاوت کے تعلق سے کرشن جی اور رادھا کے قصہ کی تلمیح کچھ اس طرح مشہور ہے:

تلمیح: ایک رات کرشن جی نے اپنی محبوبہ رادھا سے ناچنے کے لیے کہا۔ رادھا نے معذرت طلب کی مگر کرشن جی ناچنے کے لیے مسلسل اصرار کرتے رہے۔ رادھا جی کو جب یہ محسوس ہوا کہ کرشن جی کسی طرح ماننے والے نہیں ہیں تو اس نے کرشن جی سے کہا:

"ٹھیک ہے میں ناچوں گی اور ضرور ناچوں گی آپ پہلے نو من تیل کا چراغ جلوایئے۔ کیونکہ میں ایسی ویسی نہیں ہوں، آپ کی محبوبہ ہوں، اس لیے میری بھی کچھ حیثیت ہے۔"

کرشن جی یہ کہہ کر خاموش ہوگئے کہ:

"نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔"

نیبو نچوڑ، مفت خور

نیبو نچوڑ کر مفت میں ساجھا کرنے والا، زبردستی کا مہمان، طفیلیا، طفیلی، خوامخواہ کا مہمان، مفت خور۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کام یا چیز میں اپنی طرف سے تھوڑا سا حصہ شامل کرکے برابر کا حق دار بن جائے۔ اس کہاوت کا تعلق لکھنؤ اور دیگر مقامات کی سرائے وغیرہ میں نیبو اور چھری لے کر گھومنے والوں سے ہے:

حکایت: مشہور ہے کہ مغلوں کے دورِ حکومت میں لکھنؤ اور کچھ مقامات کے لوگ کام دھندا کرنے کے بجائے مفت کی روٹیاں توڑا کرتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک نرالا طریقہ اپنا رکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی جیبوں میں نیبو اور چھریاں رکھ کر شہر کی سرائے اور مسافر خانوں میں گھوما کرتے تھے۔ جب کسی مسافر کو کھانا کھانے کی تیاری کرتے دیکھتے تو سلام علیک کہہ کر اس کے پاس بیٹھ جاتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کردیتے۔ باتوں ہی باتوں میں زبردستی کھانے کا ذکر نکالتے۔ اس گفتگو میں گھما پھرا کر نیبو کا ذکر ضرور کیا جاتا کہ نیبو کے بغیر تو کھانا بالخصوص سالن تو بالکل بے کار اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ نیبو ہو تو سالن کے

کیا کہنے؟ بے چارا مسافر کہتا:

"بات تو بالکل ٹھیک ہے مگر پردیس میں میں نیبو ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟"

یہ سن کر وہ نیبو نچوڑ، مفت خور فوراً اپنی جیب سے نیبو اور چھری نکال کر حاضر کر دیتا یا نیبو کاٹ کر مسافر کے کھانے میں نچوڑ دیتا اور کہتا: "حضرت! اب کھائیے اور دیکھیے کیا ذائقہ آیا ہے۔"

مسافر بے چارہ مروت میں آکر اس کو بھی کھانے کی دعوت دیتا۔ نیبو نچوڑ تو کھانے پر دانت لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ مسافر سے کہتے:

"کھانا تو گھر میں بھی بن گیا ہوگا مگر آپ اصرار کر رہے ہیں تو چلئے تھوڑا بہت آپ کے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ آپ کی بات ٹالنا سراسر دل آزاری کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر کھانے میں مشغول ہو جاتے اور پیٹ بھر کر ہی اٹھتے۔ اس طرح ایک نیبو کی بدولت روزانہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے۔

نیچے اتروں تو بکرا قربان کروں

دیکھیے: پار اتروں تو بکرا قربان کروں۔

نیکی کام آتی ہے

دیکھیے: نیکی ہی آڑے آتی ہے۔

نیکی ہی آڑے آتی ہے

بھلائی انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ نیک کام ہی کام آتا ہے۔ بھلائی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ کوئی راجا کاشی گیا۔ وہاں اس نے سادھو، سنتوں، غریبوں اور بھکاریوں کو خوب دان دیا۔ اس کے دان کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ اسی راجا کے ملک کا ایک گھسیارا بھی بہت دنوں سے کاشی میں رہ رہا تھا۔ وہ بے چارہ دن بھر گھانس کھودتا اور شام کو بیچ کر جو روکھا سوکھا نصیب ہوتا اسی پر اکتفا کر کے کسی سڑک کے کنارے

سو جاتا۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کے ملک کے راجا نے کاشی میں بہت دان کیا ہے تو اس نے سوچا مجھے بھی کچھ نہ کچھ دان کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے پاس تھا ہی کیا جسے وہ دان کرتا۔ مرتا کیا نہ کرتا، اس نے بھی اپنی کھرپی اور گھاس باندھنے کا جال بیچ کر جو رقم حاصل کی وہ دان کر دی۔ اب اس کے پاس کچھ نہ بچا تھا، کھرپی اور جال بک گیا تھا۔ ناچار، اس نے اپنے گاؤں کی راہ لی۔ اتفاق سے اسی دن راجا بھی اپنے خاندان اور اراکین سلطنت کے ساتھ اسی راستے سے اپنے ملک کی طرف چلا۔ گرمی شدت کی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے آنکھیں کھولنا مشکل تھا۔ سب ہی لوگوں کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ سبھی لوگ گرمی سے پریشان تھے مگر گھسیارے کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے اوپر بادل کا ایک ٹکڑا سایہ کیے ہوئے تھا۔ ساتھ چلنے والے راہ گیروں کو دھیرے دھیرے پتا چل گیا کہ گھسیارے کے اوپر بادل کا ایک ٹکڑا سایہ کیے ہوئے چل رہا ہے تو ان لوگوں نے راجا سے جا کر کہا۔ راجا نے فوراً اپنے پنڈت کو طلب کیا اور ان سے پوچھا:

کیا بات ہے؟ ہم راجا ہو کر بھی گرمی سے پریشان ہیں۔ ہمارے اراکین سلطنت اور ساتھی بے حال ہیں مگر یہ نادار گھسیارا نہایت آرام کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ یہ جہاں جہاں جا رہا ہے، بادل کا ایک ٹکڑا اس کے اوپر سایہ کیے ہوئے ہے۔"

پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

"مہاراج! اس شخص نے بہت دان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آرام سے سفر کر رہا ہے۔"

راجا نے طیش میں آ کر پنڈت سے کہا:

"دان تو میں نے بھی بہت کیا ہے۔ کیا اس گھسیارے نے مجھ سے زیادہ دان کیا ہے جو اس طرح بھگوان اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر پنڈت جی نے کہا:

"مہاراج! اس گھسیارے نے اپنا سب کچھ دان کر دیا ہے۔ آپ نے تو کچھ لاکھ روپے ہی دان کیے ہیں۔ ابھی تو آپ کے پاس لاکھوں روپے اور سلطنت ہے۔ اس نادار گھسیارے کے پاس ایک کھرپی اور گھاس باندھنے کے لیے ایک جال کے سوا کچھ نہ تھا، اس نے ان دونوں کو بیچ کر جو رقم حاصل کی اسے دان کر دی۔ یہی نیکی اس کی حفاظت کر رہی ہے۔"

راجا نے کہا: "واقعی نیکی ہی آڑے آتی ہے۔

وادن کی بتیا میں کہہ دوں گی

دیکھیے: اس دن کی باتیں میں کہہ دوں گی۔

واہ پیرا اولیا، پکائی تھی کھیر ہو گیا دلیا

دیکھیے: واہ پیر علیا پکائی تھی کھیر ہو گیا دلیا۔

واہ پیر علیا پکائی تھی کھیر ہو گیا دلیا

کھیر پکا رہی تھی اور بن گیا دلیا۔ بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ کیا تھا اور ہوا کیا۔ اچھے کام کا برا نتیجہ ملا۔ اچھا کرے اور برا ہو جائے یا مراد کے خلاف نتیجہ برآمد ہونے کے محل پر بولتے ہیں۔ اس کہاوت کا تعلق ایک حکایت سے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کوئی بزرگ علیا نامی بانسی میں تھے۔ لوگ انھیں پیر علیا یا پیرا اولیا کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک دن بھوک کے غلبہ میں ایک عورت کے مکان پر جا کھڑے ہوئے جو اس وقت کھیر پکا رہی تھی۔ پیر نے پوچھا:

''کیا بنا رہی ہو۔ مجھے اس وقت بھوک ستا رہی ہے، کچھ ہو تو کھلا دو۔''

عورت نے جواب دیا:

''دلیا بنا رہی ہوں اور ابھی ابھی پکانے کے لیے چولہے پر رکھا ہے۔ بہت دیر میں تیار ہوگا۔''

عورت نے پیر علیا سے جھوٹ اس خیال سے بولا کہ کہیں وہ تمام کھیر چٹ نہ کر جائیں۔ اس پر پیر نے شاید اصلیت سمجھ کر کہا: ''ایسا ہی ہو۔''

علیا کے جانے کے بعد جب اس عورت نے ہانڈی کا ڈھکن کھول کر دیکھا تو اس میں کھیر کے بجائے دلیا تھا۔ وہ تاسف سے ہاتھ مل کر کہنے لگی:

''وہ پیر علیا، پکائی تھی کھیر ہو گیا دلیا۔''

وہ بوند ولایت گئی

دیکھیے: وہ پانی ملتان گیا۔

وہ پانی بہہ ملتان گیا

دیکھیے: وہ پانی ملتان گیا۔

وہ پانی ملتان بہہ گیا

دیکھیے: وہ پانی ملتان گیا۔

وہ پانی ملتان گیا

اب موقع جاتا رہا۔ وہ بات اب کوسوں گئی، وہ بات ہی نہ رہی۔ یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب ذرا سی غفلت سے کوئی سنہرا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب دو حکایتیں ہیں جو اس طرح مشہور ہیں۔ پہلی حکایت کو اس واقعہ سے جوڑا جاتا ہے:

واقعہ: کہا جاتا ہے کہ ایک دن بھگت گورکھ ناتھ کسی کام سے بھگت ریداس (جو ذات کے چمار تھے) کے پاس گئے۔ وہاں انہیں پیاس لگی۔ پیاس کی شدت کی وجہ سے انہوں نے ریداس سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ ریداس نے جب انہیں اپنے گھر کے اندر سے لا کر پانی دیا تو انہوں نے وہ پانی اپنے تو نبے میں بھر لیا مگر ایک چمار کے ہاتھ لگے ہوئے پانی کو پینے میں انہیں کراہیت محسوس ہوئی۔ انہوں نے اس پانی کو وہیں رکھ دیا اور بغیر پئے ہوئے پیاسا اٹھ کر بھگت کبیر کے پاس چلے آئے۔ کبیر داس کی لڑکی کمالی اس وقت بھگت ریداس کے پاس موجود تھی۔ اس نے اس پانی کو اٹھا کر پی لیا۔ جس کے پیتے ہی اس پر تینوں لوک یعنی آکاس لوگ، مرت لوک اور پاتال لوک روش ہو گئے۔ یعنی ان تینوں لوکوں کا حال اس پر کھل گیا۔ جب گورکھ ناتھ کو اس پانی کی صفات معلوم ہوئیں تو وہ بہت پچھتائے کہ انہوں نے اس پانی کو کیوں نہ پیا۔ وہ دوبارہ ریداس کے پاس آئے اور پانی کو طلب کرنے لگے۔ بھگت ریداس کو چوں کہ گورکھ ناتھ کے گھمنڈ اور غرور کا پتا تھا۔ اس لیے انہوں نے پانی دینے کے بجائے ان کی بدقسمتی پر یہ دوہا پڑھا:

پیاسے تھے جب پیا نہیں، تم نے یہ ابھمان کیا
بھولا جوگی پھرے دوانہ، وہ پانی ملتان گیا

ملتان جانے کا مطلب یہ ہے کہ کبیر داس کی لڑکی کمالی ملتان میں بیاہی تھی۔ وہ پانی جو گورکھ کی قسمت میں نہ تھا، کمالی کے ذریعہ ملتان پہنچ گیا۔

اس کہاوت کے تعلق سے دوسری حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ:

حکایت ۲: ایک نجومی کسی صاحب کمال درویش کے پاس اپنی مراد کے واسطے گیا تھا۔ جب نجومی نے درویش سے نہایت منت کی تو درویش کو اس پر رحم آیا۔ اس نے اپنا جوٹھا پانی پی جانے کیلئے نجومی کو دیا۔ کراہیت اور گھن محسوس ہونے کے سبب نجومی نے اس پانی کو پینے سے انکار کردیا۔ درویش نے پانی وہیں رکھ دیا۔ اتفاق سے وہیں ایک لڑکی بیٹھی کھیل رہی تھی جس کی نسبت ملتان میں ٹھہری تھی۔ درویش نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس پانی کو غٹ غٹ پی گئی جس کے سبب وہ صاحب تاثیر ہوگئی۔ نجومی جب اس اسرار سے واقف ہوا تو اس نے درویش سے پھر منت سماجت کرتے ہوئے پانی پینے اور مراد پوری کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ درویش نے پانی دینے کے بدلے کہا:

''اب وہ بات جاتی رہی، پہلے گھر بیٹھے مراد پوری ہوئی تھی اب ملتان جا کر تیرا کام بنے گا۔ جا یہاں سے ''وہ پانی ملتان گیا۔''

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس لڑکی نے درویش کا جوٹھا پانی پیا تھا اس کی نسبت ولایت میں ٹھہری تھی اور درویش نے پانی دینے کے بجائے نجومی سے کہا تھا: ''وہ بوند ولایت گئی۔''

مولانا محمد حسین آزاد مقدمہ دیوان ذوق میں لکھتے ہیں کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ دریائے راوی جو لاہور کے نیچے بہتا ہے ملتان کی جانب سے چل کر پنجاب کے اور دریاؤں سے ملتا ہوا دریائے شور میں جا پڑتا ہے۔ پھر اسے ادھر آنے کا موقع نہیں۔ پس جب کسی امر فوت شدہ کے باب میں کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہہ گیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دریا کے بہاؤ کی طرح اس کا موقع گزر گیا ہے۔ اب نہ ہو سکے گا۔

وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے

اچھے دن گزر گئے۔ اقبال کا زمانہ گزر گیا۔ بد اقبالی سے پالا پڑا۔ بہتر زمانہ گزر گیا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی صاحب اقبال، بدحالی، ناکامی اور نامرادی کے دن گزارنے کے لیے مجبور

ہو جائے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی میں خلیل نامی ایک امیر آدمی تھے مگر وہ بہت کنجوس تھے۔ دولت کے سہارے انہوں نے اپنی جوانی کے عالم میں کئی شادیاں کیں مگر خسیس اور بدمزاج ہونے کے باعث کسی بیوی سے بہت دنوں تک نباہ نہ ہو سکا۔ جب وہ قدرے بوڑھے ہو گئے تو کوئی ان سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ اب خلیل خاں کے دوستوں کے بھی مزے جاتے رہے کیونکہ وہ ہی شادی کراتے تھے اور پھر طلاق کے مقدمے لڑواتے تھے۔ خوب چاندی رولتے تھے۔ خلیل خاں جیسے کنجوس اور خسیس آدمی سے روپے اور دیگر چیزیں اینٹھتے تھے۔ آخر کار خلیل خاں کے ایک چلتے پرزے مصاحب نے ان سے رسال دار کی بیٹی کی بہت تعریف کی۔ لڑکی کی تعریف سن کر خلیل خاں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے بے چین ہو اٹھے۔ فوراً رسال دار کی بیٹی کے یہاں اپنی شادی کا پیغام بھیجا۔ رسال دار کو ناگوار گزرا مگر دوستوں کے اصرار پر رشتہ منظور کر لیا۔ دوستوں نے رسال دار کو مشورہ دیا کہ اس مرتبہ خلیل خاں کو سبق دینا چاہئے تاکہ اب اور لڑکیوں کی ذلت نہ ہو۔ چنانچہ چند شرائط پر شادی کا فیصلہ ہوا۔ شرائط حسب ذیل ہیں:

۱۔ دونوں طرف سے کوئی لین دین نہ ہوگا۔ دلہن کے لیے صرف ایک جوڑا لانا ہے اور نوشاہ اپنے کپڑے پہن کر آئیں گے۔

۲۔ نوشاہ کے ساتھ باراتی چاہے جتنے آئیں مگر لڑکی والے کھانا نہیں کھلائیں گے۔ ان کے کھانے کا انتظام خود نوشاہ کرے گا۔

۳۔ نقل و خرما وغیرہ عمدہ اور کثیر مقدار میں ہو تاکہ لڑکی والوں کی بدنامی نہ ہو۔

۴۔ دلہن کے یہاں کوئی رسم ادا نہ ہوگی۔ منجملہ پانچ ہزار سکہ رائج الوقت مہر معین شد کے ایک ہزار روپے مہر معجل بوقت نکاح فوراً ادا کرنا ہوگا۔

غرض رسالدار کے احباب نے ایک نیم دیوانی بوڑھی بھکارن کو جسے لوگ فاختہ کہتے تھے شادی کے روز رسال دار کے گھر میں لا بٹھایا۔ خلیل خاں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شادی کا جوڑا زیب تن کیے پینس میں سوار ہو کر دلہن کے دروازے پر باراتیوں کے ساتھ آ گئے۔ ان کا نکاح بی فاختہ کے ساتھ پڑھوایا گیا۔ شادی کا عمدہ جوڑا جسے خلیل خاں اپنے ساتھ لائے تھے نکاح سے پہلے دلہن کے لیے رسالدار کے گھر میں بھیج دیا گیا تھا۔ عورتوں نے وہی جوڑا بی فاختہ کو پہنا کر دلہن بنایا تھا۔ نکاح کے بعد ہی فاختہ کو

ایک میانہ میں بٹھا کر دولہا کے ہمراہ سسرال کے لیے رخصت کر دیا گیا۔ خلیل خاں مارے خوشی کے اپنے جامے میں نہیں سما رہے تھے۔ دلہن اور دولہا کا میانہ جب خلیل خاں کے دروازے پہنچا تو اس وقت آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات اُدھر۔ خلیل خاں نے جوں ہی خوشی خوشی دلہن کو میانہ سے اتارا کہ بی فاختہ ڈیوڑھی سے باہر ہو کر پھر سے اڑ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے رات کے اندھیرے میں گم ہو گئیں۔ خلیل خاں ہائے ہائے کر کے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ وہاں پر کھڑے ایک مسخرے نے کہا:

''وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے، اب تو ان کی ہی فاختہ اڑ گئی۔''

وہی مرغے کی ایک ٹانگ

اپنی بات کی ہٹ، اپنے جھوٹے قول کی پچ۔ بے جابات کی اڑ، ایک ہی بات کی پچ کیے جانا، اپنی ہی رٹ لگانا، ہر پھر کے ایک ہی بات کہنا، بار بار کہی ہوئی بات کہنا۔ یہ کہاوت اس وقت بولتے ہیں جب کوئی اپنی بے جابات پر اڑا رہے اور قائل نہ ہو۔ اس کہاوت کے تعلق سے بہت سی حکایتیں مشہور ہیں مگر مآل سب کا ایک ہی ہے:

حکایت: کسی صاحب کا باورچی بدنیت تھا۔ ایک روز صاحب نے اس سے مرغ پکوایا تو وہ پکے ہوئے مرغ کی ایک ٹانگ نکال کر کھا گیا۔ اس کے بعد اس نے دسترخوان پر پکا ہوا مرغا رکھا جس میں ایک ہی ٹانگ تھی۔ صاحب نے باورچی سے پوچھا:

''مرغ کی دوسری ٹانگ کہاں ہے؟''

اس نے جواب دیا:

''حضور! یہ مرغ اس نسل کا ہے جس کی ایک ہی ٹانگ ہوا کرتی ہے۔''

صاحب نے ہر چند اس کو دلائل سے سمجھایا اور قبولوانا چاہا مگر وہ اپنی ہی رٹ لگائے رہا۔ آخر میں صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے۔ اتفاق سے ایک روز باورچی کے ساتھ صاحب کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ مرغ اور مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ حسب عادت ایک مرغا ایک ٹانگ سکوڑے ہوئے کھڑا تھا۔ باورچی نے موقع غنیمت جان کر اپنے قول کے ثبوت میں صاحب سے کہا:

''دیکھ لیجیے، یہ مرغ جو سامنے ہے ایک ہی ٹانگ سے کھڑا ہے۔ یہ بھی اسی نسل کا مرغ ہے جس کی ایک ٹانگ ہی ہوتی ہے۔''

صاحب اس مرغ کے پاس گئے اور ہش ہش کرنے لگے۔ ہش ہش کی آواز سن کر مرغ دونوں ٹانگوں سے بھاگا۔ اس وقت صاحب نے باورچی سے کہا: ''اب اس کی دو ٹانگیں کیوں کر ہو گئیں؟''

باورچی نے کہا:

''کیا خوب اگر حضور اس پکے ہوئے مرغ کے آگے بھی ہش ہش کرتے تو وہ بھی دونوں ٹانگیں نکال دیتا۔''

غرض وہ اپنے قول سے نہ پھرا۔

ہائے ہائے دسواں، ڈوب مرا، ڈوب مرا

بغیر سوچے سمجھے کسی امر یا بات پر یقین کرنا۔ بے وقوفی اور لاعلمی کے سبب پریشان ہونا۔ لاعلمی اور بیوقوفی ہی تمام پریشانیوں کی جڑ ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک لوک کہانی بیان کی جاتی ہے جو اس طرح مشہور ہے:

کہانی: ایک بار دس آدمی ایک ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے ایک دوسرے کو گنا اور مطمئن ہو کر چل پڑے۔ راستے میں ایک ندی ملی۔ ندی پار کرنے کے بعد یہ جاننے کے لیے کہ ان میں سے کوئی ڈوب تو نہیں گیا ہے، گننا شروع کیا۔ گننے پر پتا چلا کہ دس کے بجائے نو لوگ ہی ہیں۔ اس کے بعد دوسرے شخص نے، پھر تیسرے نے اور اسی طرح باری باری سے دسوں لوگوں نے گنا مگر گنتی میں ہر بار ایک آدمی کم رہا۔ دراصل گننے والا سب کو تو شمار کر لیتا تھا مگر خود کو شامل نہیں کرتا تھا یعنی خود کو بھول جاتا تھا۔ جب گنتی پوری نہیں ہوئی اور سب کے سب تھک ہار کر مایوس ہو گئے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ ایک آدمی ندی میں ڈوب مر گیا ہے۔ اسی غم میں وہ لوگ وہیں رونے پیٹنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد کسی شخص کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے رونے پیٹنے اور پریشان ہونے کا سبب پوچھا۔ اس پر ان لوگوں نے سارا ماجرا بتایا۔ مسافر نے جب خاموشی سے گنتی کی تو اسے پتا چلا کہ یہ ہیں تو دس کے دس، پھر کیوں رو پیٹ رہے ہیں اس نے ان لوگوں سے کہا:

''آپ لوگ صبر و تحمل سے کام لیں، پریشان نہ ہوں، ایک بار پھر گنتی کریں۔

ان میں سے ایک کھڑے ہو کر ایک ایک کر کے نو تک سب کو تو گن دیا مگر اس بار بھی خود کو بھول گیا۔ اس پر مسافر نے اس سے کہا:

''تم ہی دسویں آدمی ہو۔لہٰذا تم سے کوئی بھی ڈوب کر مرا نہیں ہے۔''

یہ سن کر سب لوگ خوش ہو گئے اور مسافر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے راستے کی طرف چل دیئے۔

ہر سٹے گڑ میٹھا

ہر بار اپنی ہی جیت، ہمیشہ اپنا ہی فائدہ۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص ہر بار اپنی جیت چاہتا ہے۔اس کہاوت کا استعمال اس وقت بھی کیا جاتا ہے جب کوئی ہوشیار شخص دھوکے میں ایسی چیز سے مات کھا جائے جس کے ذریعہ وہ فائدہ حاصل کرتا رہا۔اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی بنیے نے اپنے یہاں ایک نوکر رکھا جسے گڑ کھانے کی عادت تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا کسی بوری سے تھوڑا سا گڑ نکال کر کھا لیتا۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ایک روز بنیے کو شبہ ہوا کہ اس کا نوکر آنکھ بچا کر بوری سے گڑ نکال لیتا ہے اور اپنے کھانے کے لیے رکھ لیتا ہے۔لہٰذا بنیے نے ایک دن بڑی ہوشیاری سے گڑ کی بوری کی جگہ بیروزے کی بوری رکھ دی (بیروزہ چیڑ کے درخت کا لیس دار مادہ ہوتا ہے جو گڑ سے مشابہ ہوتا ہے)۔نوکر کو تو چوری کا گڑ کھانے کی عادت تھی۔موقع ملتے ہی اس نے بیروزے کی ایک ڈلی کو گڑ سمجھ کر اپنے منہ میں رکھ لی جس کے سبب اس کے دونوں ہونٹ آپس میں چپک گئے اور وہ منہ کھولنے کے لائق نہیں رہا۔ بنیا تو یہ سب کچھ چھپ کر دیکھ ہی رہا تھا۔نوکر کے پاس جا کر بولا:

''روزانہ گڑ کھاتے تھے، آج کیا ہوا، رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ہر سٹے گڑ میٹھا۔''

ہر فرعونے راموسیٰ

ہر فرعون کے لیے موسیٰ ہے۔ایک پر ایک غالب ہے۔ ہر زبردست اور ظالم کی سرکوبی کے لیے کوئی نہ کوئی نیک بندہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کہاوت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات کی تلمیحات ہیں جو اس طرح مشہور ہیں:

تلمیح: فرعون مصر کا حکمران تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں بنی اسرائیل کو سخت مظالم کا شکار بنایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ جس کی تعبیر منجموں اور کاہنوں نے یہ بتائی تھی کہ حکومت فرعونی کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھوں ہوگا۔اس کو سن

کر فرعون نے اپنے قلمرو میں ایک جماعت مقرر کردی کہ اسرائیلی لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کردیا جائے۔ اس طرح ہزاروں معصوم بچے قتل کردیئے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب پیدا ہوئے تو ان کے گھر والوں نے تین مہینے تک لوگوں کی نگاہوں سے ان کو محفوظ رکھا لیکن جاسوسوں کی دیکھ بھال سخت تھی اور بہت دنوں تک اس واقعہ کو پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ اس لیے ان کی والدہ ماجدہ علیہا السلام نے تابوت کی مانند ایک صندوق میں بچہ کو بند کر کے اس صندوق کو دریائے نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت پہلے ہی سنادی تھی کہ ہم اس بچے کو تیری جانب واپس کردیں گے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا۔ یہ صندوق بہتا ہوا جب شاہی محل کے سامنے سے گزرا تو فرعون کی بیوی حضرت آسیہ علیہا السلام نے اسے نکلوالیا اور جب صندوق کھول کر دیکھا تو اس میں ایک حسین اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ فرعون کی بیوی نے اس بچہ کو قتل نہ ہونے دیا اور اپنا بیٹا بنا کر اس کی پرورش کرنے لگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرح عرصہ دراز تک شاہی تربیت میں پرورش پاتے اور بڑھتے رہے۔ جب وہ شباب کے دور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے۔ اس وقت ان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور فرعون سے ان کی کوئی قرابت نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ فرعون ان کی قوم پر سخت مظا کرر ہا تھا۔ اس لیے وہ اکثر اسرائیلیوں کی نصرت اور حمایت میں پیش پیش ہوجاتے تھے۔ ان کے اسی جرم پر فرعون ان کا جانی دشمن ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ان کو کوئی سزا دیتا۔ وہ ایک دن خاموشی کے ساتھ ارض مدین کو روانہ ہوئے۔ ارض مدین میں پہنچ کر ان کی شادی حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکی حضرت صفورہ علیہا السلام سے ہوئی اور مہر میں ان کو دس سال تک اپنے خسر کی بکریاں چرانا پڑیں۔ اس مدت کے خاتمہ پر اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ عصائے موسیٰ اور یدِ بیضا کے دو بڑے معجزے عطا کرنے کے بعد وادیٔ مقدس سے دوبارہ مصر کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے شریک نبوت بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچے اور بلاخوف وخطر اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''ہم لوگ جہانوں کے پروردگار کے ایلچی ہیں اور یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ اول تو خدا پر یقین لا اور ظلم سے باز آ۔ دوسرے یہ کہ نبی اسرائیل کی رستگاری کر اور ان کو اپنی غلامی سے نجات دے۔''

فرعون نے اپنی مغرورانہ سرشت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغمبر ہونے کا استخفاف کیا مذاق وتحقیر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پر بحث شروع کردی۔ فرعون نے اپنے گھرانے کے

احسان جتائے۔ ان کو ڈرایا دھمکایا۔ ہر طرح زدوکوب کیا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہ تو کوئی اثر ہوا اور نہ وہ فرعون سے خوف زدہ ہوئے۔ اس کے بعد ربوبیت الٰہی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون میں مذاکرہ ہوا۔ حکم الٰہی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام شیریں کلامی اور نرم گفتاری کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے ساتھ بات کرتے رہے اور ان کو راہ حق دکھانے کی کوششیں کرتے رہے۔ ان کے سوالات کے جوابات بہترین دلائل کے ساتھ دیتے رہے۔ انہوں نے فرعون کے دربار میں آیات اللہ کا مظاہرہ بھی کیا اور ساحرین سے مقابلہ بھی کیا۔ غرض کہ حق و باطل کی جنگ میں ہر بار فرعون اور اس کے اعیان و ارکان کو سخت شکست اٹھانی پڑی۔ وہ ہر مقابلہ میں برسرعام ذلیل و رسوا ہوا۔

ان تمام باتوں کے باوجود فرعون راہ راست پر نہ آیا اور اپنے دعویٰ ربوبیت سے دست بردار نہ ہوا۔ وہ دنیوی شوکت و سطوت کی مرعوبیت اور عزت و جاہ کی حرص میں دب کر رہ گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روز افزوں کامیابی کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی سرکشی اور ظلم و ستم بھی بڑھتا جاتا تھا۔ فرعون اور اس کی قوم کی پیہم اور مسلسل نافرمانیوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہلاکتیں اور عذابات آنے لگے اور ٹلتے بھی رہے۔ جب ایک عذاب ٹل جاتا تو وہ لوگ پھر سرکشی کرنے لگتے اور پھر دوسرا عذاب ان کو آ پکڑتا تھا۔ ان لوگوں کے واویلا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سفارش پر جب وہ عذاب کم ہو جاتا تو پھر وہی صورت پیش آ جاتی۔ اس طرح یہ سلسلہ ایک مدت تک چلتا رہا۔ جب فرعون اور مصریوں نے کسی طرح بھی دین حق کو قبول نہ کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تم اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر اپنے باپ دادا کی طرف لے جاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارض کنعان جانے کے لیے بحر احمر یعنی قلزم کا راستہ پسند کیا۔ وہ ایک رات کو اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام اور اپنی قوم کو لے کر بحر احمر پر پہنچ گئے۔ فرعون کو جب معلوم ہوا تو اس نے ایک زبردست فوج کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی تعداد بقول تورات بچوں کے علاوہ چھے لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔

فرعون کا لشکر جب بالکل ان کے قریب پہنچ گیا تو وحی الٰہی کے مطابق انہوں نے اپنی لاٹھی کو بحر احمر پر مارا جس نے قلزم پھٹ گیا اور اس کے درمیان ایک راستہ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم خشک زمین کی طرح دریا کے راستے کو پار کر گئی۔ فرعون نے بھی اس راستے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ جب دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو اس وقت وہ راستہ پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ فرعون اس وقت بحر احمر کے وسط میں تھا۔ وہ اپنے تمام لشکر کے ساتھ غرقاب ہو گیا۔

ہزار بار جو یوسف بکے، غلام نہیں

صادق و صابر اور دیانت دار شخص غلامی میں بھی سرداری کرتا ہے۔ اگر انسان میں صداقت، دیانت، امانت، صبر، رضا، سپاس و شکر گزاری، قوت ایمانی، عفت، جذبۂ تبلیغ اور تقویٰ جیسے اوصاف ہوں تو وہ کبھی غلام نہیں رہ سکتا بلکہ جاہ و حشمت و ثروت اس کے قدم چومنے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔ اس تلمیحی مثل کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے ہے جو اس طرح مشہور ہے:

واقعہ: حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے انتہا حسن و وجاہت سے نوازا تھا۔ اس لیے ان کو ماہِ کنعان کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار انہوں نے خواب میں دیکھا کہ چاند، سورج اور ان کے ساتھ گیارہ ستارے آسمان سے اترے اور انہوں نے سجدہ کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دوسرے گیارہ بھائیوں نے جب اس خواب کے بارے میں سنا تو حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ ایک دن وہ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کو جنگل کی سیر کے بہانے سے لے گئے اور انہیں ایک خشک کنویں میں ڈال دیا۔ واپسی پر حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کو بکری کے خون میں تر کر کے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس لائے اور انہیں یقین دلایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ ادھر کنویں کے پاس سے جب ایک قافلہ گزر رہا تھا تو قافلے والوں نے کنویں سے کسی کی آواز سنی۔ جھانک کر دیکھا تو ایک لڑکا کنویں میں پڑا مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ قافلے والوں نے انہیں کنویں سے نکالا اور مصر لے گئے جہاں ان کو غلام بنا کر بیچ دیا۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر خوطیفار کے زر خرید غلام ہو گئے۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا، حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زلیخا خواب میں حضرت یوسف علیہ السلام کو پہلے ہی دیکھ چکی تھی اور ان پر عاشق ہو چکی تھی۔ مصر کے معزز گھرانوں کی عورتیں ایک غلام سے عشق کرنے پر زلیخا پر طعن و تشنیع کرتی تھیں۔ زلیخا نے جب یہ سنا تو عمائدین شہر اور شاہی خاندان کی عورتوں کو اپنے یہاں دعوت میں بلایا اور ان کے ہاتھوں میں ایک ایک ترنج اور اس کو کاٹنے کے لیے ایک ایک چھری دے دی۔ اس کے بعد اسی جگہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی بلا لیا اور ان عورتوں کے سامنے بٹھا کر ترنج کاٹنے کو کہا۔ تمام عورتیں حسن یوسف علیہ السلام کی تابانی سے اس درجہ متاثر ہوئیں کہ انہوں نے چھری سے ترنج کاٹنے کی جگہ اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں اور سب ایک زبان ہو کر کہہ اٹھیں:

"بہ خدا، یہ تو نور کا پتلا ہے۔"

زلیخا نے زنانِ مصر کی زبان سے جب یہ بات سنی تو وہ بہت زیادہ محظوظ ہوئی اور بولی:

"یہی وہ غلام ہے جس کے عشق میں تم سب نے مجھے مطعون کر رکھا ہے۔ اب بتاؤ میرا عشق بجا ہے یا تمہاری ملامت؟"

زلیخا عشق یوسف میں اس حد تک مبتلا تھی کہ دن رات حصول مطلب کے خواب دیکھا کرتی تھی لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے کبھی اس کی پذیرائی نہ کی۔ زلیخا کی عشوہ طرازیوں، خوشامد اور دھمکیوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک دن زلیخا نے مکان کے اندر حضرت یوسف علیہ السلام کو تنہا پا کر دروازہ بند کر لیا اور شادکامی کا اصرار کرنے لگی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے یہ گھڑی سخت آزمائش کی تھی۔ سامنے شاہی خاندان کے ناموس کا حسین و جمیل پری پیکر، شعلۂ حسن سے لالہ رو، حسن و زینت سے بھرپور اور محبوب نہیں بلکہ عاشق، خود سپردگی کے عالم میں موجود حضرت یوسف علیہ السلام بھی جوان اور مجرد۔ ان کے پائے استقلال میں ایک لمحہ کے لیے بھی جنبش نہ آئی اور وہ موقع پا کر دروازہ کی طرف بھاگے۔ کسی نہ کسی طرح دروازہ کھول کر باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے تو دیکھا کہ دروازہ پر عزیز مصر اور زلیخا کا چچازاد بھائی دونوں کھڑے حیرت بھری نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ زلیخا نے اپنی فطری مکاری سے کام لے کر سارا الزام حضرت یوسف علیہ السلام پر رکھ دیا کہ ان کا ارادہ بد تھا۔ یہ میری عزت لوٹنا چاہتے تھے جس کی سزا ان کو ملنا چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس بہتان کی تردید کی اور اصل حقیقت بیان کی مگر سب بے سود، زلیخا کا چچازاد بھائی بہت ہوشیار اور دانش مند تھا اس نے کہا:

"اگر یوسف علیہ السلام کا دامن آگے سے چاک ہے تو وہ بلاشبہ خطاوار ہیں اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو وہ بے قصور ہیں۔"

پیراہن یوسف کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ پیچھے سے چاک تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی معصومیت ثابت ہوگئی۔ عزیز مصر نے زلیخا کو لعنت و ملامت کی اور حضرت یوسف علیہ السلام سے معافی مانگنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد اپنی بدنامی اور رسوائی کے خوف سے حضرت یوسف علیہ السلام کو زنداں میں ڈال دیا۔

واقعہ ۲: دوسری روایت کے مطابق جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر اپنی عزت لوٹنے کا الزام لگایا تو عزیز مصر نے حقائق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ڈلوا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے ایک خواب کی تعبیر بتائی تو اس کے صلے میں

انہیں قید سے رہائی ملی۔ عزیز مصر کی موت کے بعد یہ عہدہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا۔ جب کنعان میں قحط پڑا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی مصر پہنچے اور وہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر اور ان کا پیراہن لے کر اپنے والد ماجد کے پاس آئے۔ جیسے ہی حضرت یعقوب علیہ السلام نے وہ پیراہن جو حضرت یوسف علیہ السلام نے بھیجا تھا اپنی آنکھوں سے لگایا۔ ان کی وہ آنکھیں جو روتے روتے کمزور اور بے نور ہو چکی تھی پھر سے روشن ہو گئیں اور جلد ہی حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے سارے بیٹے مصر منتقل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو نبوت بخشی اور سلطنت بھی اور ان کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد (بنی اسرائیل) مصر میں پھیلی۔

ہگا نہ گھر رکھا

دیکھیے: ہگا نہ گھر رکھا، نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

ہگا نہ گھر رکھا، نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

کسی لائق نہ رہنا، ایسا کام کرنا جس سے دوہرا نقصان ہو۔ جب کوئی چالاک اور ہوشیار شخص کو مات اٹھانا پڑے تو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک لوک کہانی بیان کی جاتی ہے جو اس طرح مشہور ہے:

حکایت: کسی راجا کے دربار میں ایک جاٹ رہتا تھا۔ ایک بار کسی بات پر راجا جاٹ سے خوش ہو گیا۔ اس نے جاٹ سے کہا: ''ہم تم سے بہت خوش ہیں، تجھے جو مانگنا ہے مانگ لے۔''

جاٹ نے راجا سے کہا:

''اگر حضور مجھے انعام واکرام سے نوازنا چاہتے ہیں تو اجازت دیں کہ میں اپنی مرضی کے مطابق جو کرنا چاہوں کرسکوں۔''

راجا نے اُسے ایسا کرنے کی اجازت دے دی۔ جاٹ فوراً راجا کی خواب گاہ میں گیا اور راجا کے بستر پر بیٹھ کر کہنے لگا: ''میں آپ کے بستر پر ہگوں گا۔''

راجا قول دے چکا تھا، اس نے کہا:

''ٹھیک ہے، تم اپنی مرضی کے مطابق جو کرنا چاہو کرسکتے۔

راجا کے وزیروں کو جاٹ کا یہ فعل بہت ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔ ایک وزیر جاٹ کے پاس گیا اور اس

سے کہا: "اگر تم راجا کے بستر پر ہگ کر اسے گندہ کرنا چاہتے ہو تو ہگو مگر خیال رہے بستر پر پیشاب نہ گرنے پائے، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ اگر تم پیشاب کرو گے یا پھر بستر پر ہگنے سے قاصر رہو گے تو تمہارا گھر ضبط کر کے تم کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا۔"

اس کے بعد جاٹ نے لاکھ کوشش کی کہ وہ بستر پر صرف پاخانہ کرے اور اس کا پیشاب نہ چھوٹے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ آخر میں وزیر نے جاٹ کو گرفتار کروالیا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے گھر کو بھی ضبط کرلیا۔ یہ دیکھ کر کسی نے کہا: "ہگا نہ گھر رکھا، نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔"

ہگتے ہوئے بیر کھایا

کسی مجبوری سے فائدہ اٹھانا۔ کسی کو مسلسل بلیک میل کرنا۔ اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کی کمزوری یا دکھتی رگ کو سمجھ لے اور اس کا استعمال کر کے بار بار اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک مرتبہ ایک شخص کسی بیر کے پیڑ کے نیچے جنگل میں پاخانہ کر رہا تھا۔ اچانک ایک پکا ہوا بیر اس کے پاس آ کر گرا۔ اس نے اس کو بیر کو اٹھا کر کھالیا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک شخص وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے اس شخص کو بیر اٹھا کر کھاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کے بعد جب بھی کوئی بات ہوتی یا اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا ہوتا تو وہ شخص ہگتے ہوئے بیر کھانے کے واقعہ کو سب کو بتا دینے کا خوف قائم کرتا اور اس سے اپنا الو سیدھا کروالیتا۔ ایک دن تنگ آ کر اس شخص نے سب کو خود ہی بتا دیا کہ اس نے ایک روز ہگتے ہوئے بیر کھایا تھا۔ اس طرح اس شخص سے اس کا پیچھا چھوٹا۔

ہگنا تو موتنا نہیں، موتنا تو ہگنا نہیں

نہایت مجبور کر دینا، کوئی کام نہ کرنے دینا۔ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے پس منظر میں ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی شخص کے یہاں ایک نوکر تھا جو نہایت چالاک، ہوشیار اور مکار تھا۔ وہ کام کرنے سے جی چراتا تھا۔ ایک رات اس کے مالک کے چھوٹے بچے کو پیشاب معلوم ہوا تو اس نے نوکر کو بلا کر کہا

کہ وہ بچے کو پیشاب کرالے۔ نوکر ابھی پیشاب کرا کے لوٹا ہی تھا کہ بچے نے کہا کہ وہ پاخانہ کرے گا۔ مالک کے حکم پر نوکر نے بچے کو لے کر پاخانہ کروایا اور بچے کو بستر پر لٹا دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بچے کو پھر پیشاب معلوم ہوا۔ مالک نے اپنے نوکر سے پھر کہا کہ وہ بچے کو پیشاب کرالے۔ نوکر بچے کو پیشاب پاخانہ کراتے کراتے تنگ آ گیا تھا۔ وہ بچے کو پیشاب کرانے کے لیے باہر گیا اور بچے سے قدرے کرخت لہجے میں کہنے لگا:

''ہگنا تو موتنا نہیں، موتنا تو ہگنا نہیں۔ اگر تو ہگے گا بھی اور موتے گا بھی تو تجھے اٹھا کر پٹخ دوں گا۔''

بچہ سہم گیا، نہ اس نے ہگا نہ موتا۔ اس کے بعد نوکر نے بچہ کو بستر پر لٹا دیا۔ بچہ تمام رات ڈر کے مارے خاموش بستر پر پڑا رہا۔

ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

دیکھیے: میں بھی ہوں پانچوں سواروں میں۔

ہوت بہان بل کھودے

ضرورت پڑنے پر کام کرنا۔ یہ کہاوت اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص ضرورت پڑنے پر کسی کام کے لیے بے چین نظر آئے مگر ضرورت ختم ہونے پر بھول جائے۔ اس کہاوت کا تعلق لوگوں کے اس خیال سے ہے:

حکایت: لومڑی ایک نہایت چالاک اور ہوشیار جانور ہے۔ وہ کبھی اپنا بل نہیں بناتی اور وہ گرمی وغیرہ کے موسم کو تو کسی طرح کاٹ لیتی ہے مگر جاڑے کی برفیلی راتوں کا کاٹنا دشوار ہوتا ہے۔ لوگوں کے عقیدے کے مطابق لومڑی جاڑے کی رات میں سردی سے ٹھٹھرنے کے سبب ''ہوت بہان بل کھودے'' کہہ کر ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے یعنی صبح ہوتے ہی بل کھودوں گی مگر صبح ہونے پر جب سورج نکلتا ہے اور دھوپ کی تمازت سے جاڑے کی شدت ختم ہو جاتی ہے تو وہ بل کھودنا بھول جاتی ہے۔ اس طرح ہر رات اسے بل کا کھودنا یاد رہتا ہے مگر دن میں بھول جاتی ہے۔ اس طرح دھیرے دھیرے جاڑے کا موسم ایک دن ختم ہو جاتا ہے مگر وہ بل نہیں کھود پاتی۔

ہنوز دلی دور است

دیکھیے: ابھی دلی دور ہے۔

یا اللہ گوڑوں میں بھی کون گوڑ

تحقیق سے حقیقت کا پتا چل جاتا ہے۔ جانچ پڑتال سے سچائی سامنے آجاتی ہے۔ جعل ساز اور دھوکا دینے والا کبھی نہ کبھی پکڑا ضرور جاتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی جگہ برہمنوں میں برہم بھوج ہو رہا تھا۔ ایک مسلمان کا دل چاہا کہ وہ بھی برہم بھوج میں کسی طرح شامل ہو کر اس کا لطف اٹھائے۔ وہ برہمن کا بھیس بنا کر برہم بھوج میں شامل ہو گیا۔ کسی برہمن کو اس پر شک ہوا تو اس نے پوچھا:

''تم کون ہو؟''

اس نے کہا:

''میں برہمن ہوں۔''

اس شخص نے پھر پوچھا:

''تم کون سے برہمن ہو؟''

اس نے کہا:

''گوڑ ہوں۔''

اس کے بعد اس شخص نے پوچھا:

''تم کون سے گوڑ ہو؟''

تو وہ گھبرا کے بول اٹھا:

''یا اللہ گوڑوں میں بھی کون گوڑ؟''

اس کے جملہ سے سب کو پتا چل گیا کہ یہ شخص برہمن نہیں بلکہ مسلمان ہے اور بھیس بنا کر برہم بھوج میں شامل ہو گیا ہے۔

یا بسے گوجر یا رہے اوجڑ

یا تو اس میں گوجر قوم جو چوری چکاری کرتی ہے اور مبتذل ہے، آباد ہوگی یا ویران رہے گا۔ خود غرضی کی مثال کہ اگر کسی چیز سے خود فائدہ نہ اٹھا سکے تو دوسروں کو بھی مستفید نہ ہونے دے۔ یہ تلمیحی کہاوت ایک بددعا ہے جس کے تعلق سے یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے:

واقعہ: دہلی کا سلطان غیاث الدین تغلق حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ العزیز سے دلی عناد اور بغض رکھتا تھا۔ جن دنوں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی باؤلی تیار ہو رہی تھی انہیں دنوں سلطان غیاث الدین کا قلعہ بھی تعمیر ہو رہا تھا۔ بہت سے مزدور باؤلی بنانے کے کام میں لگ گئے جس سے قلعہ کی تعمیر کا کام ڈھیلا پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے حکم دیا کہ کوئی بھی مزدور حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی باؤلی کی تعمیر میں حصہ نہیں لے گا۔ لیکن مزدوری کی لالچ میں بہت سے مزدور دن بھر تو قلعہ کی تعمیر میں حصہ لیتے اور رات کو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی باؤلی میں کام کرتے جس سے ان کو دہری اجرت ملتی۔ ایک دن جب سلطان غیاث الدین قلعہ کے تعمیری کام کا معائنہ کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ کچھ مزدور اونگھ رہے ہیں۔

پوری بات معلوم ہونے پر بادشاہ نے تیل بیچنے والوں کو حکم دیا کہ کوئی بھی شخص حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں تیل فروخت نہیں کرے گا جس سے باؤلی پر اندھیرا ہی رہے گا اور تعمیر کا کام نہ ہو سکے گا مگر خدا کی قدرت سے باؤلی کے پانی سے چراغ روشن ہونے لگے جس سے تعمیر کا کام برابر چلتا رہا۔ اس بات کا جب سلطان کو علم ہوا تو اس نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو جادوگر سمجھا۔ اس نے اپنے اراکین سلطنت سے کہا کہ مجھے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا سر چاہئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ محسوس کیا کہ سلطان کا ظلم بڑھتا جا رہا ہے تو انہوں نے سلطان کو بددعا دی کہ اس کے سر پر بجلی گرے اور قلعہ میں "یا بسے گوجر یا رہے اوجڑ" یعنی تیرے قلعہ میں یا تو گوجر ذات کے لوگ رہیں یا وہ غیر آباد رہے۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے گھنگھور گھٹا گھر آئی اور قلعہ پر آسمانی بجلی گر پڑی جس سے سلطان کی موت ہو گئی۔ دہلی میں قلعۂ تغلق آباد آج بھی کھنڈر کے روپ میں موجود ہے۔ اس قلعہ کی نسبت حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بددعا کہ "یا بسے گوجر یا رہے اوجڑ"۔ چنانچہ آج تک وہاں زیادہ تر گوجر قوم ہی آباد ہے۔

یک نہ شد دو شد

ایک بلا تو تھی ہی دوسری اور پیچھے پڑی۔ ایک مصیبت کے ساتھ دوسری مصیبت آ گئی۔ ایک امر عجیب کے بعد دوسرے امر عجیب کے ظاہر ہونے کے عمل پر بولتے ہیں جب کسی شخص پر ایک عیب لگے اور وہ اس کی صفائی نہ دے پائے اور صفائی دینے کی کوشش میں دوسرا الزام اس کے سر آ جائے تو بھی اس کہاوت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کہاوت کے پس منظر میں معمولی فرق کے ساتھ کئی لوک کہانیاں مشہور ہیں جن میں سے حسب ذیل خاص ہیں:

کہانی: کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس بات کا عامل تھا کہ مردے کو اپنے افسوں اور منتر کے وسیلے سے جگا کر اس کے گھر کا تمام حال پوچھ کر اس کے گھر والوں کو بتا دیا کرتا تھا یعنی جو بات اس کے خاندان والوں کو اس سے دریافت کرنی ہوتی تھی یہ ہم زاد کے وسیلے سے پوچھ دیا کرتا تھا جب یہ شخص مرنے لگا تو اس نے اپنے ایک شاگرد کو یہ عمل بتا دیا۔ شاگرد نے بطور آزمائش قبرستان میں جا کر ایک مردے کو جگایا مگر پھر قبر میں داخل کرنے کا منتر بھول گیا۔ تب ناچار ہو کر اس نے اپنے استاد کو منتر کے وسیلے سے جگایا کہ وہ اسے قبر میں داخل کرنے کا منتر دوبارہ بتا دیں گے۔ اس طرح اس بلا سے پیچھا چھوٹے گا مگر ہوا یہ کہ استاد بھی اس عالم میں کچھ نہ بتا سکے۔ پہلے تو ایک مردہ ساتھ تھا، اب دو مردے ساتھ ہو گئے۔ اس وقت اس نے گھبرا کے یہ کلمہ کہا کہ:

''یک نہ شد دو شد۔''

دوسری حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت۲: کسی شہر میں ایک ساحرہ بڑھیا رہتی تھی۔ وہ مردوں کے کفن بیچ کر گزر بسر کرتی تھی۔ وہ کسی قبرستان میں جاتی اور تین ماش پڑھ کر قبر پر پھونک دیتی جس کے ذریعہ مردہ اپنا کفن لے کر حاضر ہو جاتا۔ بڑھیا اس سے کفن تو لے لیتی اور دوسرا منتر پڑھ کر اس پر پھر پڑھے ہوئے ماش مارتی تو وہ سیدھا قبر میں چلا جاتا۔ کفن کو بازار میں لا کر بیچتی اور اس طرح اپنا کام چلاتی۔ اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر ایک شخص کو لالچ آیا۔ اس نے ایک مدت تک بڑھیا جادوگرنی کی خدمت کی مگر اس نے ہمیشہ لیت و لعل میں رکھا۔ آخر میں مرتے وقت بڑھیا نے اس شخص کو وہ عمل بتا دیا مگر مردے کے قبر میں داخل ہونے کا منتر نہ بتا سکی کہ اس کی جان نکل گئی۔ آزمائش کے طور پر وہ شخص قبرستان گیا اور وہاں جا کر اسی طرح اس نے تین ماش قبر پر

پڑھ کر پھونکے، مردہ جھٹ کفن لے کر حاضر ہوگیا۔ اس نے مردے سے کفن لے لیا مگر قبر میں داخل کرنے کا منتر نہ معلوم ہونے کے سبب وہ مردے کو قبر میں داخل نہ کر سکا۔ لہٰذا مردہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ اب یہ شخص بہت گھبرایا اور بھاگتے بھاگتے اسی ساحرہ بڑھیا کی قبر پر پہنچا اور جوں ہی تین ماش پڑھ کر قبر پر پھینکے کہ بڑھیا جاگ کر حاضر ہوگئی مگر ایسی صورت میں اسے قبر میں داخل کرنے کا منتر نہ بتا سکی بلکہ اس شخص کے ساتھ ہولی۔ اس وقت اس شخص نے کہا: "یک نہ شد دو شد۔" کیا تدبیر کی اور کیا نتیجہ ہوا۔

اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت ۳: ایک شخص نے کسی جادوگر سے تین منتر سیکھے۔ ایک منتر مردے کو جلانے کا، دوسرا منتر مردے کے ذریعہ بھید جاننے کا اور تیسرا منتر اسے پھر سے مار دینے کا۔ اپنے استاد کی زندگی میں اس نے کبھی ان منتروں کا استعمال نہیں کیا مگر استاد کے مرنے کے بعد آزمائش کے طور پر وہ ایک قبرستان گیا۔ وہاں اس نے مردے کو جلانے کا منتر پڑھ کر جوں ہی قبر پر پھونکا کہ مردہ زندہ ہو کر اس کے سامنے حاضر ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرے منتر کے ذریعہ اس نے مردے سے تمام بھید لیے لیکن پھر سے مار دینے کا منتر بھول گیا۔ اب اس مردے کا بھوت اس کا پیچھا کرنے لگا۔ پریشان ہو کر تیسرا منتر پوچھنے کے لیے اس نے پہلے منتر کے ذریعہ اپنے استاد کو زندہ کیا مگر گھبراہٹ میں بھید جاننے کا دوسرا منتر بھی بھول گیا۔ اس لیے وہ اپنے استاد سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔ آخر کار ایک کے بجائے دو بھوتوں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ پریشان ہو کر بھاگتے ہوئے اس نے کہا: "یک نہ شد دو شد۔"

یہاں کوئی منطقی نہیں ہے

یہاں کوئی بحث و مباحثہ کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی دلیل دینے والا نہیں ہے۔ کوئی ثبوت فراہم کرنے والا نہیں ہے یعنی سب کے سب جھوٹے اور کسی بات کو بغیر سوچے سمجھے تسلیم کرنے والے ہیں۔ اس کہاوت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی شخص بغیر ثبوت اور بغیر تحقیق کے لوگوں کے سامنے اپنی جھوٹی بات پر زور دے۔ اس کہاوت کا تعلق ایک حکایت سے ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کچھ لوگ کشتی پر سوار ہو کر دریا کی سیر کر رہے تھے۔ دل بہلانے کے لیے کسی نے کہا: "کوئی کہانی کہنا چاہئے۔"

کشتی پر سوار ایک شخص نے کہا۔ میں آپ لوگوں کو ایک دلچسپ کہانی سنا سکتا ہوں مگر شرط

یہ ہے کہ یہاں کوئی منطق تو نہیں ہے۔''

سب لوگ خاموش رہے۔ اس شخص نے اس طرح کہانی کی شروعات کی:

''ایک پتے اور ایک ڈھیلے میں بہت دوستی تھی۔ جب پانی برستا تو پتا ڈھیلے کو ڈھانپ لیتا تھا اور جب ہوا چلتی تو ڈھیلا پتے کو دبا لیتا۔''

اتنے میں ان میں سے ایک شخص بول اٹھا کہ جب پانی اور ہوا دونوں ایک ساتھ ہوتے ہوں گے تو اس وقت ڈھیلا پتے کو دابتا ہوگا یا پتا ڈھیلے کو ڈھانپتا ہوگا۔ کہانی کہنے والے نے کہا:

''میں نے پہلے ہی کہا تھا یہاں کوئی منطق تو نہیں ہے۔''

یہ بلا تو قدموں سے لگی ہے

یہ بلا پیروں سے چپک گئی ہے۔ اس سے پیچھا چھوٹنا مشکل ہے۔ جب کوئی شخص کسی شخص کے اس قدر پیچھے پڑ جائے کہ اس سے پنڈ چھڑانا مشکل ہو جائے تو اس کہاوت کو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک لوک کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: ایک بھولا بھٹکا گویا کسی امیر کے یہاں پہنچا۔ وہ امیر اس قدر کنجوس تھا کہ کسی کو کھانا کھلانا تو دور، کبھی جوٹھے ہاتھ سے کسی کتے کو بھی نہ مارتا تھا۔ گویے نے اسے بڑا اور مخیّر آدمی سمجھ کر اپنے طنبورے کو خوب بجایا۔ گویا سمجھ رہا تھا کہ وہ طنبورہ بجانے کے صلے میں کھانا بھی کھلائے گا اور انعام و اکرام سے بھی نوازے گا۔ تھوڑی دیر میں باورچی نے امیر آدمی سے آکر کہا:

''حضور کھانا تیار ہے، دستر خوان چن دوں۔''

امیر آدمی نے اس خیال سے کہ اس گویے کو بھی کھانا کھلانا پڑے گا، کہہ دیا:

''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ایک نیند لے کر کھاؤں گا۔''

یہ کہہ کر اور منہ ڈھانپ کر وہ سو گیا۔ گویا تاڑ گیا کہ اس کے سر میں درد نہیں ہے۔ مجھے کھانا نہ کھلانا پڑے اس لیے یہ سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ گیا ہے۔ گویا امیر آدمی کے پلنگ کے نیچے چپ چاپ لیٹ گیا۔ دو گھنٹے کے بعد جب امیر آدمی کی آنکھ کھلی تو اس نے باورچی کو بلا کر کہا: ''کیوں وہ بلا گئی، اگر وہ بلا ٹل گئی ہو تو کھانا لاؤ۔'' گویا تو پلنگ کے نیچے لیٹا تھا فوراً بول اٹھا: ''یہ بلا تو قدموں سے لگی ہے بغیر کھانا کھائے کب ٹلنے والی ہے۔''

یہ بھیڑ کس کی ہے؟

دیکھیے: یہ مرغی کس کی ہے؟

یہ تو کتیا ہی ہے

دیکھیے: کتے خصی میں کون پڑے۔

یہ راستہ بُرا نکلا

غلط روایت پڑگئی، یہ بات ہمیشہ کیلئے ہوگئی۔ یہ مثال قائم ہوگئی۔ نمونہ میسر ہوگیا، جب کسی شخص کو کوئی چیز دی جائے اور اس کو ملتی دیکھ کر ہر شخص مانگنے لگے یا کوئی ایسا کام کیا جائے جو ہمیشہ کیلئے مثال بن جائے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کسی گاؤں میں ایک بنیا رہتا تھا۔ وہ رات کے وقت اپنے گھر میں سورہا تھا۔ سوتے وقت ایک چوہا اس کے پیٹ پر سے ہوکر ادھر سے اُدھر گزر گیا۔ چوہے کی سرسراہٹ سے بنیے کی آنکھ کھل گئی، وہ چونک پڑا اور چلا چلا کر رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ بنیے نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ لوگوں نے بنیے سے کہا:

''اگر چوہا پیٹ پر سے نکل گیا تو کیا ہوا، اس کے لیے رونا کیا۔''

بنیے نے جواب دیا:

''آپ لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ''یہ راستہ برا نکلا''۔ آج میرے پیٹ پر سے چوہا نکل گیا ہے، کل بلی نکلے گی، پرسوں سانپ نکلے گا اور پھر اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اب آپ لوگ ہی بتائیے کہ میں کیسے سوسکوں گا اور جب سو نہ سکوں تو زندہ کیسے رہوں گا؟''

یہ سب آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے

دیکھیے: آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

یہ سنسار کال کا کھاجا، جیسا گدھا ویسا راجا

موت ہر چیز کو کھاجے کی طرح کھا جاتی ہے۔ موت اور وقت سے کوئی نہیں بچ سکا ہے۔ تمام دنیا موت کے منہ میں سما جاتی ہے۔ ہر نفس کو موت آنا ہے۔ جب کوئی شخص گھمنڈ اور غرور کے نشے میں چور، کسی پر ظلم اور زیادتی کرے اور یہ بھول جائے کہ اسے بھی مرنا ہے، تو اس کہاوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: کہا جاتا ہے کہ کسی دیش کا راجا سادھوؤں اور سنتوں سے بغض وعناد رکھتا تھا۔ ایک بار وہ جنگل کی سیر کے لیے نکلا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک سنت اپنی کٹیا میں پوجا پاٹ کر رہا ہے۔ راجا نے سادھو کو دیکھ کر طنز کرتے ہوئے کہا:

جب دیہہ کا آیا انت، گدھا جیسا سنت

اس کے جواب میں سادھو نے کہا:

یہ سنسار کال کا کھاجا، جیسا گدھا ویسا راجا

یہ سن کر راجا جھینپ گئے اور کھسیا کر چلتے بنے۔

یہ مرغی کس کی ہے؟

یہ چیز کس کی ہے، اس کا مالک کون ہے۔ جب کوئی عیار اور فریبی دوسرے کی کسی چیز کو ایماندار بن کر ہڑپنے کی کوشش کرے تو کہتے ہیں۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت: ایک مرتبہ کسی ملا کو مرغی کا گوشت کھانے کی خواہش ہوئی مگر اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ مرغی کا گوشت خریدتا۔ اس نے سوچا کسی نہ کسی طرح مرغی کا گوشت تو کھانا ہی ہے۔ کام بھی بن جائے اور گناہ بھی نہ ہو۔ اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ جھٹ باہر گیا اور کسی کی مرغی کو ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگا: ''یہ مرغی کس کی ہے؟''

وہ مرغی کا لفظ دھیمی آواز میں نکالتا اور ''کس کی ہے'' بلند آواز میں کہتا۔ اس کے بعد وہ مسجد کی چھت پر چڑھ گیا اور اسی فعل کو دہرانے لگا۔ جب کسی شخص نے مرغی کے مالک ہونے کا دعویٰ پیش نہیں کیا تو

وہ مرغی کو لے کر اپنے گھر آیا اور یہ کہہ کر کہ اس کا مالک کوئی نہیں بلکہ میں ہی ہوں، یہ میرے لیے جائز ہے، ذبح کر کے ہنڈیا میں رکھ کر چولہے پر چڑھا دی۔

بعض لوگ مرغی کی جگہ بھیڑ کہتے ہیں۔

یہ منہ اور مسور کی دال

صحیح کہاوت "یہ منہ اور منصور کی دار" ہے جو بگڑتے بگڑتے یہ منہ اور مسور کی دال ہوگئی۔ دیکھیے: منہ اور منصور کی دار۔

یہ منہ اور منصور کی دار

تم اس لائق نہیں، تم اس کے مستحق نہیں۔ اس منہ سے کہتے ہو کہ ہم یوں کریں گے۔ یہ منہ اس کام اور منصب کے قابل نہیں۔ منصور کی دار ہر شخص کو نصیب کہاں۔ اس تلمیحی کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب وہ مشہور نعرہ ہے جو ایک عارف باللہ حضرت منصور نے عالم بے خودی و مستی و وجد میں لگایا تھا۔

حکایت: حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ کا پورا نام ابوالمغیث الحسین بن منصور البیضاوی تھا لیکن وہ اپنے باپ کے نام منصور سے مشہور ہوئے۔ حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ ۲۴۲ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ تقریباً پچاس سال ریاضت میں بسر کرنے کے بعد ایک دن جوش میں انہوں نے انا الحق (میں خدا ہوں) کا نعرہ لگایا۔ بغداد کے علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور تین سو کوڑوں کی سزا مقرر کی۔ جب اس سزا سے بھی ان کی وارفتگی میں فرق نہ آیا اور وہ اس کلمہ سے باز نہ آئے تو خلیفہ المقتدر باللہ کے حکم پر مفتی شریعت نے سزائے موت تجویز کی۔ شریعت کا فتویٰ ہمیشہ ظاہری اقوال و اعمال پر لگتا ہے۔ عشق کے راز و نیاز سے ہر شخص واقف نہیں ہوسکتا۔ حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نعرہ کیوں اور کس حال میں لگایا تھا۔ ان کا یہ فعل محبوب حقیقی کی نظر میں ممدوح تھا یا مذموم۔

اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا اہل عشق کی بے باکی اور جرأت پر سزا دیتی چلی آئی ہے اور یہ اس کا پرانا دستور ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے پاؤں کاٹے گئے، پھر آنکھیں نکالی گئیں، پھر زبان کاٹی گئی، اس کے بعد دار پر چڑھا کر سنگ باری بھی کی گئی اور آخر میں ان کے سر کو کاٹ کر جلا دیا گیا۔ ان کی خاک دجلہ میں بہائی گئی۔ مشہور ہے کہ ہر سزا کے بعد ان کی رگ و پے سے "انا الحق" کی صدا

بلند ہوتی تھی۔ان کی خاک کا ہر خون آلودہ ذرہ اور خون کے ہر قطرہ سے ''حق حق'' کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہر شخص کو حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ جیسا عشق اور مرتبہ کہاں نصیب؟ یہ منہ اور منصور کی دار، خدا جس کے نصیب میں لکھ دے، وہی اس مرتبے تک پہنچے۔

یہ ناانصافی کب تک؟ جب تک چلے تب تک

ناانصافی بہت دنوں تک نہیں چلتی۔ ظالم کا خاتمہ بہت جلد ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے وجود میں آنے کا سبب ایک لوک کہانی ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے:

کہانی: کسی گاؤں میں چار غریب اور احمق بھائی رہتے تھے۔ وہ روزی روٹی سے پریشان تھے۔ ایک روز انہوں نے طے کیا کہ بھیک مانگ کر گزر بسر کی جائے۔ ایک ایک کر کے وہ لوگ بھیک مانگنے کے لیے نکل پڑے۔ پہلا بھکاری ایک راجا کے دربار میں پہنچا۔ وہ کچھ جانتا تو تھا نہیں۔ اس لیے اس نے ''جاپ جپو، جاپ جپو'' کی رٹ لگانا شروع کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد دوسرا بھائی بھی وہاں پہنچ گیا اور وہی جاپ اس نے بھی شروع کر دیا۔ راجا دونوں کو صبح شام کھانا کھلاتا اور تعظیم و توقیر سے پیش آتا۔ کچھ عرصہ کے بعد تیسرا بھائی بھی گھومتا پھرتا ہوا جب وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں بھائی ''جاپ جپو، جاپ جپو'' کی رٹ لگا لگا کر راجا کو بے وقوف بنا کر اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ وہ وہیں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا اور جلدی جلدی کہنے لگا:

''یہ اتی کب تک چلے گی، یہ اتی کب تک چلے گی؟''

اسے تو اپنے دونوں بھائیوں کی بیوقوفی کے کھل جانے کا خوف تھا۔ اتفاق سے چوتھا بھائی بھی کچھ دنوں کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ تیسرے بھائی نے جوں ہی رٹنا شروع کیا کہ ''یہ اتی کب تک چلے گی؟''

تو چوتھے بھائی نے جاپ کے انداز میں کہا: ''جب تک چلے تب تک''

یعنی جب تک راجا کو ہماری بیوقوفی، عیاری اور ناانصافی کا پتا نہ چل جائے۔ اسی وقت سے یہ مثل مشہور ہوگئی کہ:

''یہ ناانصافی کب تک، جب تک چلے تب تک۔''

*

گیارہ ہزار محاوروں کو یکجا کر کے عام فہم معنی

کے ساتھ اُردو داں قارئین کے لیے جامع لغت

اُردو محاورے

نئی نسل کے لوگ اگر ضرورت سمجھیں تو اپنی زبان میں اسے استعمال کرنے پر غور کریں

مؤلفہ

ڈاکٹر خوشنودہ نیلوفر

ناشران

بُک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بُک سٹریٹ جہلم پاکستان

فون نمبر 0544-614977 موبائل 0323-5777931

پرنٹرز۔ پبلشرز۔ کمپوزرز۔ ڈیزائنرز۔ بُک سیلرز۔ ہول سیلرز اینڈ لائبریری آرڈر سپلائیرز

ہماری کتابیں پیاری کتابیں
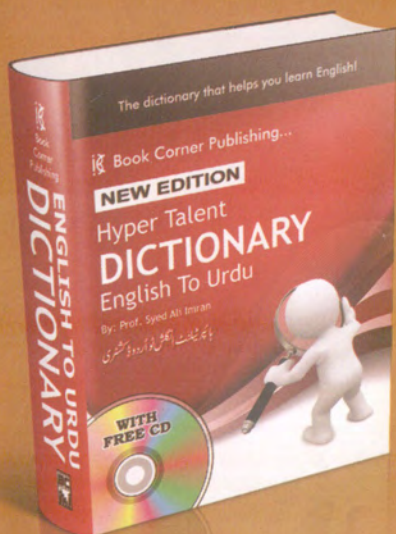
ISBN: 978-969-662-021-1

Rs. 480.00